'زمانہ' پریم چند نمبر

مرتبہ
دیا نرائن نگم

مقدمہ
مانک ٹالا

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

'زمانہ' پریم چند نمبر

مرتبہ

دیا نرائن نگم

مقدمہ

مانک ٹالا

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

'زمانہ' پریم چند نمبر

مرتبہ

دیا نرائن نگم

مقدمہ

مانک ٹالا

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل (حکومت ہند)
ویسٹ بلاک 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی 110066

Zamana Premchand Number
Edited by : Daya Narayan Nigam
Muqaddama : Manik Tala

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت : جولائی 2002 شک 1924
پہلا اڈیشن : 1100
قیمت : =/114
سلسلہ مطبوعات : 999

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم نئی دہلی 110066
طابع : لاہوتی پرنٹ ایڈس، 1397 پہاڑی املی، بازار مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی 110006

پیش لفظ

اردو کے اہم مصنفین کی تمام تحریروں کو شائع کرنے اور انھیں قارئین تک پہنچانے کا منصوبہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ترجیحات میں شامل ہے۔ اس منصوبے کے تحت میر، درد، ناسخ، آغا حشر، پریم چند، منٹو اور فراق وغیرہ کی تخلیقات کو کلیات کی شکل میں اردو کونسل شائع کررہی ہے۔ کلیات پریم چند قومی اردو کونسل 22 جلدوں میں شائع کرے گی جن میں سے بیشتر جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ کونسل نے یہ کوشش کی ہے کہ پریم چند کے تعلق سے کوئی گوشہ تشنہ نہ رہ جائے اسی لیے ناول، افسانے، ڈرامے، خطوط، مضامین، اداریے اور تراجم بہ اعتبار صنف یکجا کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں پریم چند پر مبنی ایک اہم کام "زمانہ" کانپور کا پریم چند نمبر جو ایک اہم دستاویزی رسالہ ہے، نیز پریم چند کی زندگی کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرتا ہے، کا منظر عام پر آنا کونسل کے لیے خوشی کا باعث ہے۔

پریم چند کے انتقال کے بعد ان کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے منشی دیانرائن نگم نے 'زمانہ' کا پریم چند نمبر نکالا۔ اس میں پریم چند کے فنی پہلوؤں کے علاوہ ان کے سوانحی گوشوں اور شخصیت پر کافی مواد یکجا کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ ایک عرصے سے کم یاب تھا اور اس کی اشاعتِ نو کی ضرورت محققینِ پریم چند مستقل

محسوس کر رہے تھے۔ چونکہ اس اہم دستاویز میں تحقیقی نقطہ نظر سے کچھ خامیاں راہ پا گئی تھیں اور ان کو صحیح تناظر میں پیش کرنا ضروری تھا۔ "زمانہ" کے اس خصوصی نمبر کی اشاعتِ نو کر کے کونسل اس کمی کو پورا کر رہی ہے۔

"زمانہ" کی تصحیح کرنے اور تفصیلی مقدمہ لکھنے کی ذمے داری جناب مانک ٹالا نے بخوبی نبائی ہے۔ جامع مقدمے کے علاوہ چار ضمیمے بھی شاملِ کتب ہیں۔ اس علمی تعاون کے لیے کونسل جناب مانک ٹالا کی ممنون ہے۔ امید ہے کونسل کی دیگر مطبوعات کی طرح یہ کتاب مطالعہ پریم چند میں اہمیت کی حامل ہوگی۔

(ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ)
ڈائریکٹر

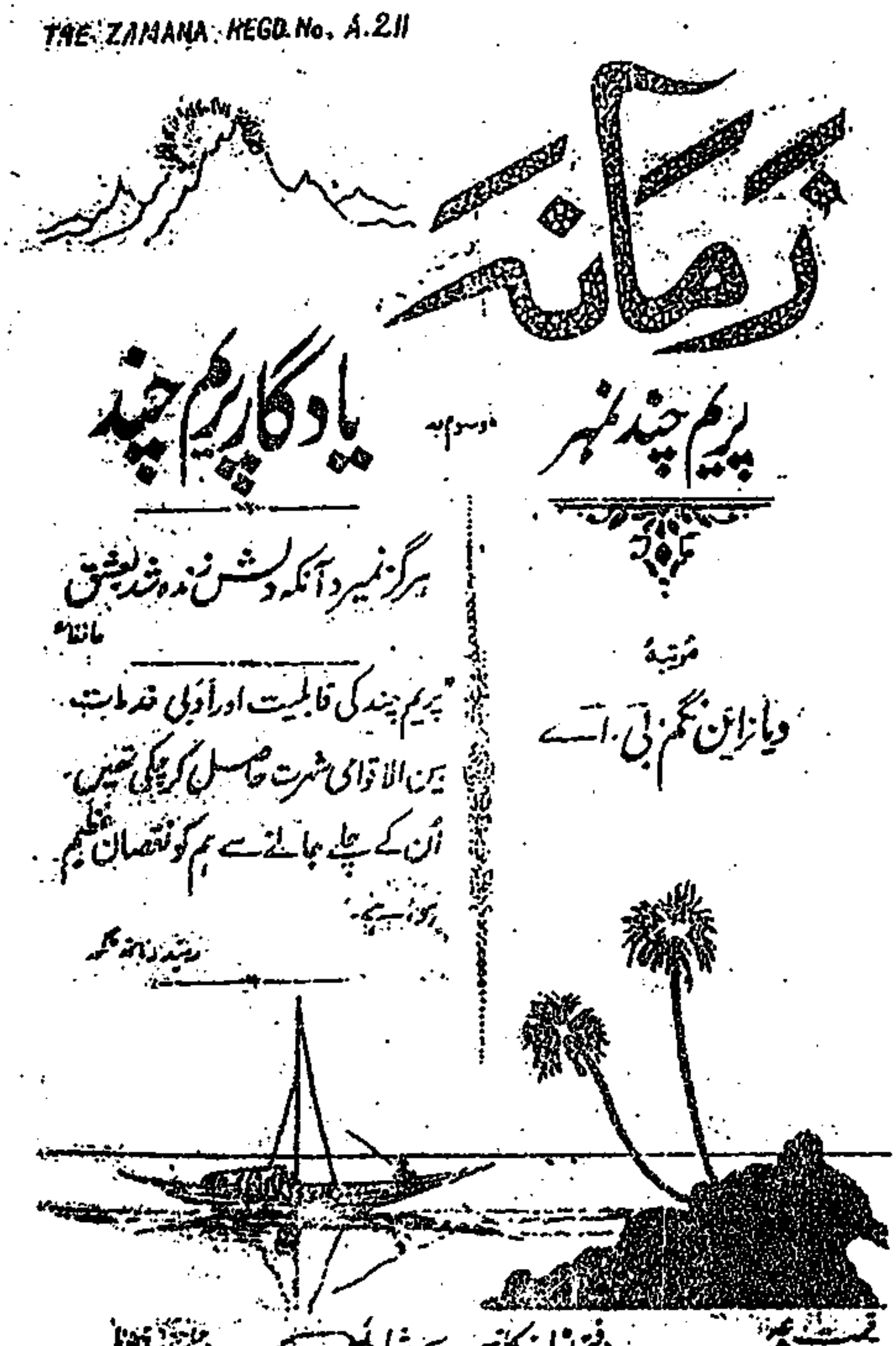

2— زمانہ پریم چند کا بیرونی سرورق

دفتر زمانہ کانپور
فروری ۱۹۳۸ء

جناب مکرمی۔ تسلیم

حال ہی میں رسالہ زمانہ نے منشی پریم چند مرحوم کی یادگار میں ایک خاص نمبر "یادگار پریم چند" کے نام سے شائع کیا ہے۔ جس میں ۲۵۶ صفحات پر ۲۴ مضامین نثر اور ۱۲ نظمیں ہدیۂ ناظرین کی گئی ہیں۔

یادگار پریم چند کے حصہ اول میں سوانحی مضامین ہیں جو سب کے سب منشی پریم چند کے دیرینہ دوستوں اور ذاتی واقف کاروں کے لکھے ہوئے ہیں۔ اور منشی صاحب کے نجی خطوط سے جو اشاعت کے خیال سے نہیں لکھے گئے تھے۔ بہت سی باتیں اخذ کر کے شائع کر دی گئی ہیں اس طرح منشی صاحب کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں بچا جس پر اس یادگار نمبر میں روشنی ڈالی گئی ہو۔

دوسرے حصہ میں اردو کے مسلم انشا پردازوں اور تجربہ کار تنقید نگاروں نے منشی پریم چند کی تمام تصانیف پر سیر حاصل ... تنقیدیں لکھوائی گئی ہیں۔ منشی صاحب کے ادبی شاہکاروں کو پورے طور پر سمجھنے کیلئے ان مضامین کا پڑھنا لازمی ہے۔

تیسرے حصہ میں منشی پریم چند صاحب کے متعلق نامور شعرائے اردو کی قابل قدر نظمیں ہیں۔

غرض اس یادگار نمبر میں منشی پریم چند کی زندگی کا ایک مکمل مرقع پیش کر دیا گیا ہے۔ مضامین کے علاوہ نو ہاف ٹون عکسی تصاویر بھی دی گئی ہیں۔ انہیں پریم چند صاحب کی تحریر کا عکس بھی ہے۔ دیگر تصاویر ان کی زندگی کے مختلف اوقات کے فوٹو ہیں۔ جنکی دلچسپی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

یہ نمبر آپ کی خدمت میں بامید ریویو ارسال خدمت ہے۔ امید ہے کہ آپ اسے پڑھ کر خوش ہوں گے اور اپنی رائے سے اپنے معزز صحیفہ کے ناظرین کو مطلع فرمائیں گے۔

براہ کرم فوری توجہ فرما کر رہین منت فرمائیے۔ اور جس پرچے میں آپ کا قابل قدر ریویو شائع ہو اس کی ایک کاپی بھیج کر مزید شکر گزاری کا موقع دیجئے۔

نیازمند

ایڈیٹر زمانہ کانپور

3— 'زمانہ کا پریم چند نمبر' مختلف رسائل کو ارسال کرنے کے ساتھ فروری 1938 کا یہ خط بھی منسلک تھا۔ یہ خط تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔

زمانہ

کا

یہ خاص نمبر

پریم چندجی کے تیس سال کے مسلسل قلمی احسانات کے شکرانے

اور

اُس لازوال محبت و برادرانہ رفاقت کی یادگار میں شایع کیا جاتا ہے

جو

انجمن زمانہ" اور اُس کے ایڈیٹر کے ساتھ تھی۔

آج وہ اِس عالم آب وگل میں نہیں ہیں، لیکن اُن کی بے لوث زندگی اور پُرخلوص و بے ریا محبت کی یاد آخر دم تک احباب کے سکونِ خاطر و تسکینِ قلب کا باعث رہے گی:
اگرچہ موت نے اُن کو ہم سے ناوقت چھین لیا مگر اُن کا نام امر اور اُن کا کام اٹل ہے۔
اُن کے خیالات و جذبات ملکی ادب کا مستقل جزو ہوگئے ہیں، اور جب تک ہندوستانی زبان کے نام لیوا باقی ہیں اُن کا نام بھی نیکی سے یاد کیا جائے گا۔ سچ ہے:

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

دیا نرائن نگم

4— زمانہ کا پریم چند نمبر کا اندرونی سرورق

فہرست مضامین

پیش گفتار		1
ضمیمہ نمبر ایک		9
ضمیمہ نمبر دو		16
ضمیمہ نمبر تین		27
ضمیمہ نمبر چار		31

حصہ اول: پریم چند کے سوانحی خاکہ

1- پریم چند کے خودنوشت حالات		46
2- منشی پریم چند کی کہانی اُن کی زبانی		49
3- پریم چند اور مسز پریم چند	شریمتی شیورانی دیوی	59
4- منشی پریم چند کی یاد	منشی پیارے لال شاکر میرٹھی	63
5- منشی پریم چند ایک ہم سبق کی نگاہ میں	بابولال کرشن بی اے ایل ٹی	69
6- منشی پریم چند مرحوم ایک شاگرد کی نگاہ میں	منشی منظور الحق کلیم	72
7- منشی پریم چند مرحوم ایک رفیق کار کی نگاہ میں	مرزا محمد عسکری بی اے	74
8- آہ منشی پریم چند	مرزا افدا علی خنجر لکھنوی	77
9- پریم کے چند اوصاف	مولوی محمد یحییٰ تنہا بی اے ایل ایل بی	81
10- پریم چند ایک انسان اور مصنف کی حیثیت سے	پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری ایم اے	83
11- منشی پریم چند مرحوم	منشی جگیشور ناتھ ورما جاب بریلوی بی اے۔ ایل۔ ایل۔ بی	96
12- پریم چند کی قومی خدمت	مولوی ابوعمر زکریا ما گلپوری ایڈیٹر مومن گزٹ	104
13- پریم چند کی ادبی خدمات	حضرت جگر بریلوی بی اے	105
14- پریم چند اور ہندوستانی زبان	پرنسپل رام پرشاد کھوسلا ایم اے	110
15- منشی پریم چند مصور جذبات	شیو کماری دیوی دختر حضرت جگر بریلوی	112
16- منشی پریم چند کی مصوری	مسز سلیم جعفر	114

17- پریم چند کی یاد	پنڈت بنارسی داس چترویدی ایڈیٹر وشال بھارت	119
18- منشی پریم چند اور فلم کمپنیاں	مسٹر ضیاء الدین احمد مدنی بی اے	123
19- منشی پریم چند کے محترضین	منشی راج بہادر لکوڑہ ایم اے ایل ایل بی	126
20 پریم چند کی باتیں	ایڈیٹر	129
21- مسز پریم چند	"	136
22- پریم چند کی بعض تصانیف کے حالات	"	137
23- پریم چند کے خیالات	ایڈیٹر	139
24- زمانہ اور پریم چند	ایڈیٹر	167

حصہ دوم: پریم چند کی افسانہ نگاری

25- پریم چند کی افسانہ نگاری	خود نوشت حالات منشی پریم چند	173
26- پریم چند افسانہ نگار کی حیثیت سے	مولانا عبدالماجد دریا آبادی بی اے ایڈیٹر صدق	175
27- پریم چند کے آرٹ پر ایک سرسری نظر	مسٹر ایچ ایل گاندھی بی اے	186
28- پریم چند اور دیہات	مسٹر اوپندر ناتھ اشک بی اے ایل ایل بی	190
29- مل مزدور فلم کیسے بنی	شریمتی للت کمار	202
30- پریم چند کی زندگی اور تصانیف پر ایک نظر	سید علی جواد زیدپوری	205
31- پریم چند کے ناول	مسٹر طالب الہ آبادی ایم۔اے	233
32- پریم چند کا اپدیش	سید مقبول حسین بی اے ایل ایل بی احمد پوری	248
33- میدان عمل (تنقید)	مسٹر مالک رام ایم اے ایل ایل بی	282
34- گئودان (تنقید)		290

حصہ سوم: اردو شاعروں کا خراج تحسین

35- افسانہ گوئے بزم ادب	حضرت راز چاند پوری	294
36- یاد کمال	حضرت محشر لکھنوی	295
37- اردو ہندی کے سنگم پر	حضرت سیماب اکبر آبادی	296
38- پریم چند کی یاد میں	حضرت سروش	297

39- پریم چند اور ان کا رتبہ	حضرت فرحت کانپوری بی اے ایل ایل بی	298
40- آہ منشی پریم چند	منشی جگناتھ پرشاد آزاد بی اے	299
41- بساط ماتم	عبدالسلام اختر ہوشیار پوری	300
42- نوحۂ وفات پریم چند	منشی جگدیش سہائے سکسینہ بی اے ایل ایل بی	301
43- آہ منشی پریم چند	مہاشہ مجمنی سرشار خیر پوری	303
44- خراج عقیدت	رائے زادہ نکیشور دیال صوفی ایم۔اے ایل ایل بی	304
45- بادشاہ اور ادیب	حضرت احسان بن دانش کاندھلوی	305
46- قطعۂ تاریخ وفات پریم چند	منشی اقبال ورما سحر ہتگامی	306
47- تواریخ انتقال ناگہانی	پروفیسر حامد حسن قادری ایم اے	307
48- منشی پریم چند کی تصانیف	....	308

فہرست تصاویر

1- پریم چند کا پنسل اسکیچ
2- عکس تحریر منشی پریم چند
3- پریم چند (موت سے پہلے)
معہ مسز پریم چند
4- پریم چند بستر مرگ پر
5- پریم چند زمانہ تندرستی میں
6- پریم چند سرکاری ملازمت سے مستعفی
ہونے کے بعد
7- پریم چند و مسز پریم چند
8- پریم چند 1932 میں
9- پریم چند 1934ء میں

فہرست اقتباسات

1- پریم چند اور علامہ یوسف علی		82
2- فرشتہ خصلت پریم چند	اقتباس خط حضرت افسر میرٹھی	95
3- پریم چند کی خصوصیت	ڈاکٹر سچد انند سنہا وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی	102
4- پریم چند بہ حیثیت مصنف	سر تیج بہادر سپرو، سرت چند چٹو پادھیائے آنند راؤ جوشی	
	رائے بہادر شیام سندر داس کی رائیں	111
5- پریم چند کی تمنائیں	پنڈت بنارسی داس چترویدی ایڈیٹر وشال بھارت	118
6- پریم چند کے بہترین افسانے	(خود ان کی نگاہ میں)	125
7- پریم چند کا آرٹ	مولانا عبدالحق بی اے ایڈیٹر "اردو"	281
8- پریم چند کا قلمی چہرہ	از فلستان۔ (لاہور)	292
9- اقوال و اقتباسات پریم چند		

پیش گفتار

"زمانہ" کانپور کا پریم چند نمبر ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ نمبر بہت کم لائبریریوں یا افراد کے پاس موجود ہے۔ اس نوشتہ کی دستاویزی اہمیت کو سمجھتے ہوئے قومی کونسل نے اسے کتابی صورت میں پیش کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ قومی کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ نے اس کی ترتیب وتدوین کا کام میرے ناتواں کندھوں پر ڈالا ہے اور میں نے حتے المقدور اپنی ذمے داری نبھانے کی کوشش کی ہے۔

پریم چند کا تصور دیا نرائن نگم اور "زمانہ" کے بغیر مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ صحیح معنی میں پریم چند کی ادبی زندگی کا آغاز "زمانہ" ہی سے شروع ہوتا ہے اور پریم چند کو پریم چند بنانے میں نگم اور "زمانہ" کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

"زمانہ" کے پریم چند نمبر میں اس زمانے کے چوٹی کے دانشوروں نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ تنقیدی نقطۂ نظر سے لکھے ہوئے مضامین آج بھی اسی اہمیت بلکہ اس سے بھی زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ لیکن تحقیقی نقطۂ نظر سے یہ نمبر انتہائی ناقص ہے۔ اور سب سے بڑی IRONY (طنز) تو یہ ہے کہ پریم چند کی زندگی اور ادب کی تفصیلات خود پریم چند اور نگم صاحب کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ لیکن دونوں نے اپنی ناقص یادداشت کو دستاویز کے طور پر استعمال کرتے ہوئے بہت سی جگہوں پر عجیب وغریب بوالعجبیوں کا مظاہرہ کیا ہے۔

اس سلسلے میں مدن گوپال صاحب نے اپنی اردو کتاب "قلم کا مزدور" (صفحہ نمبر 6) میں ایک جگہ تحریر فرمایا ہے۔

> "......پچھلے چند برسوں میں اردو میں جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان سب میں "زمانہ" کے پریم چند نمبر میں شائع شدہ مضامین کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ ہندی میں "ہنس" کے خاص نمبر کو لیکن تاریخوں اور واقعات کی ترتیب میں صاف اختلافات ان دونوں شماروں میں جگہ جگہ موجود ہیں۔ تنقید نگاروں نے بھی آنکھ بند کر کے ان بیانات کو نقل کر دیا ہے......"

زمانہ پریم چند نمبر میں پریم چند اور نگم صاحب کے درج ذیل مضامین تحقیقی نقطۂ نظر سے بہت سی خامیوں کے حامل ہیں۔

(1) پریم چند:

(الف) پریم چند کے خودنوشت حالات

(ب) پریم چند کی کہانی ان کی اپنی زبانی

(2) دیانرائن نگم:

(الف) پریم چند کی باتیں

(ب) پریم چند کی بعض تصانیف کا حال

اس کے علاوہ اس شمارے کے آخر میں "زمانہ" کے ادارے کی طرف سے مرتب کردہ پریم چند کی تصانیف بھی تحقیقی نقطۂ نظر سے پُر از اغلاط ہیں۔

نتیجے میں پریم چند پر بہت سے تحقیق کرنے والوں نے ان دونوں کے بیانات کو مستند سمجھتے ہوئے انھیں اپنی تحقیق میں من و عن استعمال کرلیا ہے۔

متذکرہ بالا مضامین کو ان کے صحیح تناظر میں پیش کرنے کے لیے مجھے چار ضمیمے مرتب کرنا پڑے۔ اور حتی المقدور ان ضمیموں کی تفصیلات مستند حوالوں سے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

اب اس خاص نمبر کی اشاعت کے بارے میں کچھ روشنی ڈالنا چاہتا ہوں کیونکہ بہت سے محقق اس نمبر کی اشاعت کا سنہ 1937ء مانتے اور لکھتے ہیں لیکن حقیقت کچھ اور ہی ہے۔ درحقیقت یہ نمبر فروری 1938ء میں تیار ہوکر مارکیٹ میں آیا تھا حالانکہ نگم صاحب کی بہت کوشش تھی کہ وہ اپنے اس عزیز دوست کو جلد از جلد خراجِ عقیدت پیش کردیں لیکن باوجود انتہائی کوشش کے اس کی اشاعت معرضِ التوا میں پڑتی رہی۔ اس کے کوائف مختصراً ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

(1) اکتوبر 1936ء ہی کے "زمانہ" کے شمارے میں پریم چند نمبر کا اعلان کردیا گیا تھا۔ نگم صاحب کا خیال تھا کہ یہ خاص شمارہ تسلی بخش طور پر مرتب ہوکر اپریل 1937ء میں شائع ہوجائے گا۔ چنانچہ قلمی معاونین کو مضامین جلد از جلد ارسال کرنے کی درخواست کی گئی۔

(2) جیسے جیسے مضامین آتے گئے اس کی ضخامت بڑھنے لگی۔ اس نمبر کی کتابت کی مصروفیت کے باعث دسمبر 1936ء کا شمارہ بھی شائع نہ ہوسکا۔ چنانچہ یہ اعلان کیا گیا کہ دسمبر 1936ء اور اپریل 1937ء کے دو شماروں کو آپس میں مدغم کردیا جائے گا۔

(3) لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کئی اہم ادبی ہستیوں کے بہت سے معیاری اور اہم مضامین پہنچنے لگے۔

(4) اس صورت حالات کے پیش نظر اپریل 1937ء کا شمارہ تو عام شماروں کی طرح شائع کر دیا اور اس امید پر کہ یہ خاص نمبر جون 1937ء تک تیار ہو جائے گا، جون 11937ء کا شمارہ بھی شائع نہ کیا گیا، لیکن تاخیر ہوتی گئی۔

(5) دسمبر 1937ء کے شمارے میں اس خاص نمبر کا اشتہار دیا گیا۔ اس کے علاوہ اس نمبر میں زمانہ کا پینتیسواں سال کے عنوان کے تحت صفحہ 396 پر اس کی تفصیل درج کرتے ہوئے لکھا گیا تھا۔

''......یادگار نمبر اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ تیار ہو گیا ہے اور اس نمبر کے ساتھ ہی شائع ہو رہا ہے۔''

(6) لیکن یہ نمبر جنوری کے اواخر یا فروری کے اوائل میں شائع ہو کر مارکیٹ میں آیا کیونکہ اس نمبر کے جو پرچے دیگر رسائل کو تبادلے میں ارسال کیے گئے ان کے ساتھ علاحدہ ایک خط منسلک تھا جس کے اوپر ''فروری 1938ء'' درج تھا۔ اس خط میں اس خاص نمبر پر جلد از جلد تبصرہ شائع کرنے کی استدعا کی گئی تھی۔ یہ خط قاری کی خدمت میں اسی خاص نمبر کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔

''زمانہ''، نگم اور پریم چند

یہ تینوں نام لازم ملزوم تھے نگم اور ''زمانہ'' کے بغیر پریم چند کا اور پریم چند کے بغیر نگم صاحب اور ''زمانہ'' کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ حتیٰ کہ ''سوز وطن'' کے شاخسانے کے بعد جب ضلع کلکٹو نے ان کی حب وطن سے بھرپور تحریریں سُن کر دھپت رائے/نواب رائے پر لکھنے کی پابندیاں عائد کر دی تھیں تو نگم صاحب ہی نے ان نیا قلمی نام ''پریم چند'' تجویز کیا تھا۔

''زمانہ'' میں پریم چند کے متعدد مضامین، تنقیدیں، تبصرے اور کہانیاں شائع ہوئی تھیں۔ اس خاص نمبر میں دیگر تفصیلات کے علاوہ ایک مضمون ''زمانہ اور پریم چند'' شائع ہوا تھا۔ اس میں پریم چند کے ان سب مضامین کی تفصیل دی گئی ہے جو وقتاً فوقتاً ''زمانہ'' میں شائع ہوتے رہے۔

میں نے ضمیمہ نمبر 3 میں ان کی کچھ تحقیقی غلطیوں کی تصحیح کر دی ہے۔ اس مضمون کی آخری شق میں اٹھاون افسانوں کا ذکر کیا گیا ہے جو نواب رائے اور پریم چند دونوں قلمی ناموں سے شائع ہوئے تھے۔ میں نے مزید تحقیق کے بعد ان گیارہ افسانوں کا بھی پتہ لگا لیا ہے، جو زمانہ میں شائع تو ہوئے تھے لیکن اس فہرست میں شامل نہیں ہیں۔ چنانچہ اس ضمیمہ میں میں نے زمانہ میں ان کی اشاعت کی تفصیلات مہیا کر دی

ہیں۔

''زمانہ'' اور منشی دیا نرائن نگم

''زمانہ'' اپنی افادیت کے باوجود زندگی بھر مالی دشواریوں کا شکار رہا۔ بشیشور پرشاد منور لکھنوی کے نام اپنے 7 رجنوری 1942ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں۔''......شائد آپ بھول گئے کہ چالیس سال سے زمانہ کی اشاعت مسلسل قائم رکھنے میں مجھے کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ کیا میں نے اب تک کسی اہل قلم سے اس کے لیے کوئی مالی امداد طلب کی؟ البتہ قلمی امداد کے لیے میں اپنے سب احباب قدیم وجدید مرحوم وموجود کا ہمیشہ کے لیے زیر بار احسان ہوں۔ (مکاتیب نگم، مرتبہ محمد ایوب واقف ص186 اشاعت کا سنہ ندارد)

زمانہ کا اجرا فروری 1903ء میں بریلی میں ہوا تھا۔ اس کے موسس مدیر منشی شو برت لال ورمن تھے۔ فروری 1903ء سے نومبر 1903ء تک یہ رسالہ ان کے ہاتھوں پروان چڑھتا رہا لیکن کچھ ذاتی حوادث اور خانگی حالات کے باعث مرحوم اس رسالے کا قلمدان ادارت منشی دیا نرائن نگم کے سپرد کر کے بریلی سے باہر چلے گئے۔ یہ رسالہ پہلے بریلی ہی میں ایڈٹ ہو کر وہیں سے شائع ہوا کرتا تھا لیکن نگم صاحب کے زیر ادارت آنے کے بعد شروع شروع میں کانپور سے ایڈٹ ہو کر بریلی کے اُسی پریس (قیصری پریس) سے شائع ہوتا رہا تاہم کچھ انتظامی مجبوریوں کے سبب اس کی اشاعت نامی پریس کانپور سے ہونے لگی۔ یہ 1905ء کی بات ہے۔ کچھ عرصہ بعد نگم صاحب نے اپنا چھوٹا سا پریس بھی قائم کر لیا تھا جس میں ''زمانہ'' کے علاوہ ان کا نیا جاری کردہ ہفت روزہ ''آزاد'' کے علاوہ کچھ کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ لیکن کچھ سال بعد انھیں اپنا پریس فروخت کرنا پڑا کیونکہ پریس بھی مسلسل خسارے میں چل رہا تھا۔ اس کے بعد زمانہ کانپور کے مختلف پریسوں میں چھپتا رہا۔

زمانہ کا عام شمارہ بہتر سے اَسّی صفحوں پر مشتمل ہوتا تھا اور صفحوں کے نمبر سلسلہ دار چھ ماہ تک چلا کرتے تھے۔ اس زمانے میں چھ ماہ کی ایک جلد ہوا کرتی تھی۔ اور ہر چھ ماہ بعد جلد نمبر بڑھ جاتا تھا۔ ہر جلد کے آخری ماہ (یعنی جون اور دسمبر) میں چھ جلدوں میں شائع شدہ مضامین نثر و نظم کی تفصیل ہوا کرتی تھی۔

ابتدا میں زمانہ عام کتابی سائز پر شائع ہوتا تھا لیکن بعد میں سائز میں اضافہ کر دیا گیا تھا۔

نگم صاحب نے ''زمانہ'' کے ذریعہ بہت سے نوخیز ادیبوں اور شاعروں کی ذہنی پرورش کر کے انھیں شہرت اور مقبولیت بخشی۔ وہ نئے اور ہونہار لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتے

تھے۔ چنانچہ آج کے کئی مشہور اہلِ قلم ان کی نظر کرم کے مرہونِ منت ہیں۔

رسالہ کی ادارت اور دیگر مصروفیات کے باعث وہ خود زیادہ نہیں لکھ سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے جو کچھ بھی لکھا انتہائی محنت، وقت نظر اور چھان پھٹک کر لکھا، مثال کے طور پر ان کے دو مقالے (1) ''مطالعۂ رامائن (' زمانہ' اکتوبر دنومبر 1907ء) اور (2) ''تھائیسر کی لڑائی اور اس کے اثرات'' (' زمانہ' اگست 1938ء) پیش کیے جاسکتے ہیں۔ وہ زیادہ تر ''رفتار زمانہ'' یا/ اور ''علمی خبریں اور نوٹ'' کے عنوانات کے تحت اپنے وقت کے سماجی، معاشی، سیاسی اور تاریخی حالات پر ''زمانہ'' کے ہر شمارے میں تبصرہ فرمایا کرتے تھے۔

نگم صاحب نے ''زمانہ'' کو کبھی اپنی تشہیر کا ذریعہ نہیں بنایا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ انھیں رائے صاحب کا خطاب بھی ملا ہوا تھا لیکن انھوں نے اپنے نام کے ساتھ کبھی یہ خطاب استعمال نہیں کیا۔

حضرت جوشؔ ملیح آبادی نے اپریل 1934ء کے لگ بھگ ان کی مدح میں ایک نظم ''نگاہِ خلوص ہیں'' لکھ کر ارسال کی تھی لیکن انھوں نے اپنی زندگی میں اسے ''زمانہ'' کے صفحات کی زینت نہیں بنایا۔ جوش صاحب نے اپنی یہ نظم اپنی کتاب ''آیات ونغمات'' میں 1914ء میں شائع کرائی تھی۔ نگم صاحب ''زمانہ'' کی تعریف میں لکھے گئے خطوط اور تبصروں کو بھی ''زمانہ'' میں شائع کرنے سے اجتناب برتتے تھے۔

''زمانہ'' نگم صاحب کے لیے ہمیشہ خسارے کا سودا رہا اس خسارے کے ڈر سے جائداد کا بٹوارا کر کے انھیں خاندانی جائداد سے الگ کر دیا گیا تھا۔

''یادگار جشن صد سالہ۔ منشی دیا نرائن نگم'' سے تین اقتباس پیش خدمت ہیں جن سے پتہ چلے گا کہ نگم صاحب اپنے اصولوں پر کسی قدر سختی کے پابند تھے اور ''زمانہ'' میں مسلسل خسارے کے باوجود زمانہ کے معیار کو تبدیل کرنے یا اردو کی بجائے ہندی میں شائع کرنے کی تجاویز کو بھی انھوں نے ٹھکرا دیا تھا۔

(1) ''بھولی بسری یادیں'' از سری نرائن نگم، فرزند ارجمند جناب دیا نرائن نگم۔ ''......اردو سے ان کو جو لگاؤ تھا وہ ظاہر ہے لیکن وہ اس کے ساتھ ہندی کے مخالف نہیں تھے۔ ان کی رائے میں شمالی ہندوستان میں دونوں ہی زبانوں کی گنجائش تھی۔ البتہ عام فہم الفاظ کا استعمال پسند کرتے تھے۔ صوبہ میں ہندوستانی اکاڈمی کا قیام ان کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اور یہ پودا ان ہی کی آبیاری سے سرسبز ہوا تھا۔ (ص 301)

(2) ''دادا صاحب'' از برج نرائن نگم، (دوسرے خلفِ رشید دیا منشی نرائن نگم) ''......کم سے کم

یہ تو ظاہر ہے کہ 'زمانہ' ایسے معیاری اور پایہ کے رسالے کو بھی کسی قسم کی حوصلہ افزائی نہ کسی برسر اقتدار ادارہ یا قدر دانان اردو سے ملی نہ دائرہ خریداران ہی خاطر خواہ ہوا کہ کبھی فارغ البالی کی سانس لی جا سکتی...... اُن کے سامنے ایسے حل بھی پیش ہوئے جب کہا گیا کہ اسے ہندی میں نکالا جائے۔ اس کے معیار کو بدل ڈالا جائے لیکن دادا صاحب [والد صاحب] کی خودداری نے اسے کبھی منظور نہیں کیا۔ اور اپنے ذہنی معیار' جو انھوں نے خود ہی قائم کیا تھا اسے تبدیل کرنا گوارہ نہیں کیا نہ ہی کسی قسم کی لغزش ہی آنے دی اور نہ ہی اردو کو خیر باد کہا......" (ص289-90)

(3) "بابوجی" از ٹھاکر چندر بھوشن سنگھ (موصوف ادارہ زمانہ میں بہت عرصہ کام کرتے رہے تھے) "وہ 1903ء کے بی۔ اے تھے۔ چاہتے تو اپنے چھوٹے بھائی سری رام سرن نگم مرحوم کی طرح ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ سے شروع ہو کر کے اعلیٰ عہدہ تک پہنچ سکتے تھے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔

کچھ لوگ یہ بھی چاہتے تھے کہ زمانہ دیوناگری حروف میں ہندی زبان میں شائع کیا جائے۔ آئندہ خسارے کی ضمانت لیتے ہوئے دھنی اور کچھ پونجی والے لوگ پچھلا نقصان ادا کرنے کی بات کرتے تھے مگر وضعدار بابوجی اس کے لیے کبھی رضامند نہیں ہوئے......" (ص286)

ماہرین پریم چندیات

پریم چند پر باقاعدہ وقیع اور مستند تحقیق کرنے کے سلسلے میں چار جغادری ادیبوں کے نام ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

(1) مدن گوپال صاحب' پریم چند کے پہلے معتبر محقق ہیں جنہوں نے پریم چند کو سب سے پہلے انگریزی کے علمی و ادبی حلقوں سے متعارف کرایا۔ پہلے ایک سو صفحے کا کتابچہ 1943/44 کے لگ بھگ) شائع کرایا۔ پھر ایک ضخیم کتاب احاطۂ تحریر میں لائے۔ پھر ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں پریم چند کی زندگی اور ادب پر "قلم کا مزدور" نامی کتابیں شائع کرائیں۔ موصوف کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف خط و کتاب کے ذریعہ بلکہ متعدد جگہوں پر خود جا کر مختلف ادیبوں سے پریم چند کے خطوط حاصل کیے یا ان کی نقلیں تیار کیں۔ بعد میں "پریم چند کے خطوط" کے نام سے ایک ضخیم کتاب مکتبہ جامعہ سے جون 1968ء میں شائع کرائی۔ ہندی میں پریم چند کے چھوٹے بیٹے امرت رائے کے اشتراک سے امرت رائے کے جمع کردہ خطوط کے ساتھ ان خطوط کو شامل کر کے "چٹھی پتری" کے نام

سے دو جلدوں میں 1962ء میں شائع کرایا۔

(2) ڈاکٹر کمل کشور گوینکا نے بھی پریم چند پر بہت وقیع اور مستند کام کیا ہے۔ پریم چند پر کئی تحقیقی کتابیں شائع کرائی ہیں۔ ان میں ''پریم چند وشوکوش (2 جلد) اور ''پریم چند کا اپراپیہ ساہتیہ'' (2 جلد) محققوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوسکتی ہیں۔

(3) ڈاکٹر جعفر رضا نے پریم چند پر اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں بہت ہی قابل قدر کام کیا ہے۔ اردو میں موصوف کی دو معتبر کتابیں ''پریم چند۔ فن اور تعمیر فن'' اور ''پریم چند۔ کہانی کا رہنما'' شائع ہو کر داد تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ موصوف نے پریم چند کے افسانوں کی اشاعت وغیرہ کی تفصیلات پر بہت گہرائی اور گیرائی سے ریسرچ فرمائی ہے، جو کہ موصوف کی متذکرہ بالا پہلی کتاب میں مختلف ابواب کے تحت شامل اشاعت ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر رضا کی تحقیق کے مطابق پریم چند کی مجموعی 314 (تین سو چودہ) تخلیقات میں سے 74 صرف اردو میں ہیں۔ 71 پہلے اردو میں، 92 پہلے ہندی میں اور 64 صرف ہندی میں لکھی گئیں۔ اور بچوں کے لیے ان کی تیرہ کہانیاں صرف ہندی میں ہیں۔ (''اردو دنیا۔'' ستمبر 2001ء ص۔ 56 اردو خبرنامہ میں کلیات پریم چند کی مزید چار جلدوں کے اجرا کے موقعہ پر موصوف کی تقریر کا اختصار)

(4) ڈاکٹر قمر رئیس نے بھی پریم چندیات کے سلسلے کی تحقیق میں بہت محنت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ لیکن موصوف نے پریم چند کو اکثر و بیشتر صرف مارکسی نقطۂ نگاہ سے پرکھا ہے اور پریم چند پر مارکسی اور صرف مارکسی ہونے کا لیبل چسپاں فرمایا ہے۔ لیکن میرے علاوہ کئی دانشوروں کو ان کے اس مسلک سے اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں اردو کے مشہور دانشور اور ماہر لسانیات ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی اس تقریر کا ایک اقتباس پیش کر رہا ہوں جو موصوف نے کلیات پریم چند کی مزید چار جلدوں کے اجرا کی تقریب کے موقعہ پر فرمائی تھی۔۔۔

''منشی پریم چند کو گاندھیائی یا مارکسی نظریے سے دیکھ کر ان کی ہمہ گیر ادبی شخصیت کو محروم کرنے کا سلسلہ اب بند ہونا چاہیے کیونکہ وہ اگر آج بھی ہماری تہذیب کی ضرورت ہیں تو یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ وہ ایک حقیقت پسند ادیب تھے۔ (انھوں نے مزید کہا کہ) حقیقی فنکار نظریات سے طاقت ضرور حاصل کرتا ہے مگر وہ خود کو نظریوں کے محدود دائرے کا قیدی نہیں بناتا۔ اسی طرح سچائی کسی لیبل کی محتاج نہیں ہوتی، مصلحت پڑھنے والے کے اندر ہوتی ہے۔ جس کے معروضی رویے کو کسی ادب کی پرکھ کا پیمانہ نہیں بنایا جاسکتا......روس کے انقلاب سے متاثر ہو کر پریم چند نے اپنی آگہی کا ثبوت دیا تھا، اس لیے

گئودان، یا کفن جیسی ان کی تحریروں کو حقیقت پسندانہ سمجھا جائے ترقی پسندانہ نہیں (''اردو دنیا۔'' ستمبر 2001ء۔ص56)

ان چار شہسواروں کے ساتھ ''پانچواں سوار'' میں بھی ہوں۔ میں نے پریم چندیات پر اپنی تحقیق پریم چند کی صد سالہ یوم پیدائش کی تقریبات کے بعد شروع کی۔ میں نے جہاں متذکرہ بالا ماہرین پریم چند کی نگارشات کا بغور مطالعہ کیا وہاں میں نے اولین ماخذوں تک پہنچ کر حتی الوسع صحیح نتائج اخذ کرنے کی کوشش بھی کی۔ اور کہیں کہیں ان حضرات کی تحقیق سے مستند حوالوں کے ساتھ اختلاف کرنے کی جسارت بھی کی۔ دراصل تحقیق ایک جاری وساری عمل ہے اور بہت ممکن ہے کہ مستقبل کے محقق میرے بھی اخذ کردہ کچھ نتائج اپنی نئی تحقیق کی روشنی میں مسترد کردیں۔ محقق کا صحیح کام بھی یہی ہے کہ ماضی کی تحقیق کو سامنے رکھ کر اپنے مستند حوالوں کے ساتھ پچھلی تحقیقی اغلاط کی نشان دہی کرتے ہوئے تحقیق کے کام کو آگے بڑھائے۔

پریم چندیات پر اب تک میری چار تحقیقی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جنھیں مستند محققوں اور تبصرہ نگاروں نے سراہا ہے اور انھیں حوالے کی کتابوں کی حیثیت دی ہے۔ میری آخر کتاب ''پریم چند کا سیکولر کردار اور دیگر مضامین'' 2001ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب تحقیق وتالیف کا سنگم کہی جا سکتی ہے۔ اس میں جہاں پریم چند پر میرے تحقیقی مضامین شامل ہیں وہاں میں نے اس کتاب کی افادیت میں اضافہ کرنے کے لیے 'قدیم وجدید' مرحوم وموجود مشاہیر اہل قلم کے اردو، ہندی، ہندوستانی سے متعلق مختلف ومتضاد خیالات کی اہم تحریروں کو بھی یکجا کر دیا ہے۔ ان میں پریم چند کی بھی کچھ تحریریں اور تقریریں ہیں جنھیں میں نے ہندی سے اردو میں ترجمہ کر کے شامل کر دیا ہے۔

مانک ٹالا

ضمیمہ نمبر ایک

(I) پریم چند کے خود نوشت حالات

اور

(II) منشی پریم چند کی کہانی ان کی اپنی زبانی

(I) پریم چند نے اپنے جو حالات لکھے ہیں ان میں درج ذیل تحقیقی غلطیاں در آئی ہیں

(۱) ''...... 1901ء میں لٹریری زندگی شروع کی......

تصحیح:۔ ویسے تو 1901ء سے بہت پہلے ہی پریم چند کے دل میں تخلیقی قوتوں نے سر ابھارنا شروع کر دیا تھا۔ اسکول کے زمانے میں ہی سرشار، مولانا شرر اور دیگر ادیبوں کی کہانیاں اور ناول پڑھتے پڑھتے ان کے دل میں بھی کچھ لکھنے کی تمنا انگڑائی لینے لگتی تھی۔ کوئی اندرونی طاقت انھیں قلم پکڑنے پر مجبور کرتی [1]۔۔۔ وہ لکھتے پھاڑتے، لکھتے پھاڑتے اور تلملا کر رہ جاتے۔۔۔ جادہ نہ منزل نہ رہبر۔۔۔ اپنی اس جھنجھلاہٹ کے نکاس کا انھیں ایک مرتبہ ایک موقعہ نصیب ہوا تھا لیکن وہ بھی اسکول کے زمانے میں بیسویں صدی کی ابتدا سے چند برس پہلے۔۔۔

اس زمانے میں ان کے ناطے کے ایک ماموں (سوتیلی ماں کے چچیرے بھائی) ان کے ہاں تشریف لائے۔ ادھیڑ عمر کے ہو گئے تھے ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی۔ گھر پر متفرق کاموں پر رکھی ہوئی ایک چمارن کے تیرِ نظر کے گھائل ہو گئے۔ ایک روز شام کے وقت وہ گھر پر آئی تو انھوں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا کہ عشق بازی کا آخری مرحلہ بھی طے کر لیا جائے، لیکن گاؤں کے چمار تاک میں بیٹھے تھے۔ ادھر دروازہ بند ہوا اُدھر انھوں نے دروازہ توڑا اور سب اندر گھس آئے۔ گھونسے، لاتوں اور چھڑیوں سے ان کی مرمت کی۔ مہینوں دودھ میں ہلدی اور گڑ ملا کر پیتے

رہے۔۔۔ ''اگر انھوں نے کچھ انکساری دکھائی ہوتی تو شاید مجھے ہمدردی ہوتی، لیکن ان کا وہی دم خم تھا۔ مجھے کھیلتے یا ناول پڑھتے دیکھ کر بگڑنا اور رعب جمانا اور والد صاحب سے شکائت کی دھمکی دینا، یہ اب میں کیوں سہنے لگا؟ اب تو انھیں نیچا دکھانے کے لیے میرے پاس کافی مسالہ تھا۔'' ۔۔۔دھنپت نے ماموں کی کرتوت کو ڈرامے کی شکل میں ڈھالا۔ کاپی ماموں جان کے سرہانے رکھ دی اور خود اسکول چلا گیا۔ ماموں صاحب نے ڈرامہ پڑھا اور بوریا بستر سنبھال کر چلتے بنے۔ جاتے جاتے وہ ڈرامہ پھاڑ کر کوڑے دان میں ڈال گئے۔۔۔۔ یہ تھی دھنپت رائے/نواب رائے کی پہلی تخلیق۔۔۔ پھر 1900ء۔اور 1902ء کے دوران پرتاب گڑھ میں سرکاری اسکول کی نوکری کے دوران ان کی دوستی ایک بابو رادھا کرشن سے ہوگئی جنھیں وہ اپنی لکھی ہوئی چیزیں دکھلا کر ان سے مشورہ لیتے لیکن اس وقت بھی پریم چند نے باقاعدہ لکھنا شروع نہیں کیا تھا۔

لٹریری زندگی کا آغاز عموماً وہ زمانہ تسلیم کیا جاتا ہے جب کسی مصنف کی پہلی تحریر یا تخلیق کسی جریدے میں شائع ہو جائے اور وہ باقاعدہ لکھنا اور چھپنا شروع ہو جائے۔ پریم چند کی پہلی تحریر بنارس کے ہفت روزہ اخبار ''آوازۂ خلق'' میں ''اسرار معابد'' کے نام سے یکم مئی 1903ء سے 24/ ستمبر 1903 تک قسط وار شائع ہوئی اور اس کے بعد انھوں نے باقاعدہ لکھنا شروع کر دیا۔

دریں حالات، ہم کہہ سکتے ہیں کہ پریم چند کی لٹریری زندگی کا آغاز 1903ء میں ہوا۔

(2)......1904ء میں ایک ہندی ناول پریما لکھ کر انڈین پریس سے شائع کرایا......''

تصحیح:۔ ''پریما'' (ہندی) 1907ء میں شائع ہوا تھا نہ کہ 1904ء میں۔ یہ 'ہم خرما و ہم ثواب' کا ترجمہ تھا جو پریم چند نے کسی دوسرے شخص سے کرایا تھا کیونکہ اس زمانے میں ہندی لکھنے یا ترجمہ کرنے کی استعداد پریم چند میں نہیں تھی۔

(3) ''......1912ء میں 'جلوۂ ایثار' اور 1918ء میں ''بازار حسن'' لکھا [دونوں ناول تھے]۔ ہندی میں سیوا سدن، پریم آشرم، رنگ بھوم، کایا کلپ چار ناول دو دو سال کے وقفہ کے بعد نکلے۔ ان کے اردو ترجمے عنقریب شائع ہوں گے......''

تصحیح: (الف) جلوۂ ایثار کا سنہ اشاعت درست ہے۔ یہ انڈین پریس الہ آباد سے مئی 1912ء میں شائع ہوا تھا اس پر بطور مصنف ''نواب رائے'' کا قلمی نام موجود ہے۔

''وردان'' (ہندی) جلوۂ ایثار کا ترمیم شدہ ہندی ایڈیشن ہے۔ یہ ناول پریم چند کے نام

سے گرنتھ بھنڈار بمبئی سے بکرمی سمت 1977 [1920] میں شائع ہوا تھا۔

(ب) بازارِ حسن/سیوا سدن ـــــ بازارِ حسن پہلے اصلاً اردو میں تحریر ہوا تھا۔ 1918ء تک لکھا جا چکا تھا۔ سیوا سدن (ہندی ترجمہ جو پریم چند نے خود کیا تھا) دسمبر 1918 کے لگ بھگ کلکتہ سے ہندی پستک ایجنسی کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ اردو میں ناشر دستیاب نہ ہونے کے باعث پریم چند کو 1921ء تک انتظار کھینچنا پڑا۔ یہ دارالاشاعت پنجاب لاہور سے شائع ہوا تھا۔

(ج) پریم آشرم/گوشۂ عافیت۔ یہ کافی طویل ناول تھا۔ اصلاً اردو میں لکھا گیا تھا۔ اس کا اردو مسودہ دستیاب ہے۔ اس پر زمانہ تحریر 2/فروری 1918ء تا 25/فروری 1920ء بھی رقم ہے۔ اردو میں لکھنے کے ساتھ ساتھ اس کا ہندی ترجمہ بھی خود پریم چند کرتے رہے۔ ہندی میں گوشۂ عافیت کا نام پریم آشرم رکھا۔ اس کا دیباچہ پنڈت رام داس گھوڑ نے لکھا۔ دیباچے کے آخر میں اپنے نام کے ساتھ ــ ''ہولی بکرمی سمت [1922 1979ء] بھی درج کیا۔ اس حساب سے یہ ناول فروری، مارچ 1922ء کے قریب شائع ہوا ہوگا۔ اس کا ناشر بھی ہندی پُستک ایجنسی، کلکتہ تھا۔

گوشۂ عافیت کا پھر سے ترجمہ (ہندی میں ترمیم و تنسیخ کے باعث) اقبال بہادر ورما سحر ہتگامی سے کرانا پڑا۔ گوشۂ عافیت دارالاشاعت پنجاب لاہور سے دو جلدوں میں 1929ء میں شائع ہوا تھا ـــــ تاہم ماہرین پریم چندیات اس کی اشاعت 1928ء کی بتاتے ہیں لیکن 1928ء ہی کے دوران اُن کا بعد میں لکھا ہوا اس سے بھی ضخیم ناول ''چوگانِ ہستی' دارالاشاعت پنجاب نے دو جلدوں میں شائع کیا تھا۔ چنانچہ دو ضخیم ناول (دو۔ دو جلدوں میں) ایک ہی سال میں آگے پیچھے مارکیٹ میں لانا ناشر کے لیے سود مند نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے موقف کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ دسمبر 1929ء کے زمانہ میں نگم صاحب نے علمی خبریں اور نوٹ (ص 357) میں درج ذیل اطلاع شائع کی تھی ــ ''حال ہی میں پریم چند کے دو جدید ناول گوشۂ عافیت [دارالاشاعت پنجاب] اور نرملا [گیلانی الیکٹرک پریس بکڈپو] لاہور سے شائع ہوئے۔''

(د) رنگ بھوم (یا بھومی) (ہندی)/ چوگانِ ہستی (اردو) ـــــ پریم چند کے پچھلے ناولوں کی طرح یہ ناول بھی پہلے اردو میں لکھا گیا تھا۔ ''چوگانِ ہستی کے مسودے پر اس کی شروعات کی تاریخ یکم اکتوبر 1922ء اور اختتام پر یکم اپریل 1924ء درج ہے۔ ہندی کے مسودے پر اس کی تکمیل کی تاریخ 12/اگست 1924ء رقم ہے۔ یہ ناول ہندی میں 930/صفحوں کو محیط تھا۔ اس لیے

یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی منتقل کرتے رہے ہوں گے۔
ہندی میں یہ کتاب دو جلدوں میں گنگا پستک مالا کاریالیہ لکھنؤ سے بکری سمت 1981 (1924ء) کے دوران شائع ہوئی لیکن جیسا کہ پچھلی شق میں لکھا گیا ہے چوگان ہستی کی اشاعت 1928ء میں دارالاشاعت پنجاب لاہور سے ہوئی۔۔۔ نگم صاحب کے نام پریم چند کے 8/اکتوبر 1928ء کے لکھے ہوئے خط سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب اکتوبر سے کچھ پہلے شائع ہوئی ہوگی۔

(ر) کایا کلپ (ہندی)/ پردۂ مجاز (اردو)۔۔۔پریم چند کا یہ پہلا ناول ہے جو اولاً اور اصلاً ہندی میں لکھا گیا ہے۔ بعد میں پریم چند ہی نے اس کا اردو ترجمہ کیا۔ اس کا اصل مسودہ دستیاب ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کے مطابق (پریم چند کا تنقیدی مطالعہ۔ص259) اس کے ہندی مسودے پر شروع کرنے کی تاریخ 10/اپریل 1924ء اور ختم ہونے کی تاریخ 3/جنوری 1925ء رقم ہے۔

پریم چند کے کچھ خطوط سے بھی واضح ہوتا ہے کہ ''کایا کلپ'' اگست 1926ء سے پہلے پہلے شائع ہو چکا تھا۔ یہ ناول بھارگو پستکالیہ، گائے گھاٹ، بنارس کی طرف سے بکری سمت 1983 (1926ء) میں شائع ہوا تھا۔

اس کا اردو ترجمہ ''پردۂ مجاز'' لاجپت رائے اینڈ سنس لاہور سے دو حصوں میں شائع ہوا تھا۔ اس پر اشاعت کا سنہ درج نہیں ہے ''لیکن پریم چند کی بعض تحریروں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ اردو میں یہ ناول 1931ء کے آخر یا جنوری 1932ء میں شائع ہوا تھا''۔۔۔(ایضاً)

(4) ''......1920ء میں ملازمت سے کنارہ کش ہوگیا......''

تصحیح: مہاتما گاندھی ترک موالات کی تحریک کے سلسلے میں 8/فروری 1921ء کو گورکھپور پہنچے تھے۔ غازی میاں کے میدان میں تقریباً دو لاکھ کے مجمے میں ان کی تقریر ہوئی۔ خرابی صحت کے باوجود پریم چند بیوی بچوں سمیت گاندھی جی کی تقریر سننے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ گاندھی جی کی تقریر سے ان کے دل و دماغ پر ایک جادوئی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اور انھوں نے معلّمی کی سرکاری نوکری سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ بیوی سے مشورے کے بعد 14/فروری 1921ء کو اپنا استعفا ہیڈ ماسٹر کے حضور میں پیش کردیا۔ اس زمانے میں پریم چند نارمل اسکول میں نائب مدرس تھے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر بچن لال بہت اچھے انسان تھے۔ اور پریم چند کے بہی خواہ بھی تھے۔ انھوں نے پریم چند کو بہت سمجھایا، حالات کی اونچ نیچ کی دہائی بھی دی لیکن پریم چند ٹس سے

مس نہیں ہوئے آخر 15 رفروری 1921ء کے روز پریم چند کا استعفا منظور کرلیا گیا اور وہ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔

(II) منشی پریم چند کی کہانی ان کی اپنی زبانی

(1) ''پہلے پہل 1907ء میں مَیں نے کہانیاں لکھنا شروع کیں......اور پہلا ناول تو میں نے 1901ء ہی میں لکھنا شروع کیا۔ میرا ایک ناول 1902ء میں شائع ہوا اور دوسرا 1904ء میں لیکن کہانیاں سب سے پہلے 1907ء ہی میں لکھیں۔ میری پہلی کہانی کا نام تھا ''دنیا کا سب سے انمول رتن۔'' وہ 1907ء میں ''زمانہ'' میں چھپی۔ اس کے بعد میں نے ''زمانہ'' میں چار پانچ کہانیاں اور لکھیں۔ 1909ء میں پانچ کہانیوں کا مجموعہ ''سوزِ وطن'' کے نام سے زمانہ پریس سے شائع ہوا......''

تصحیح:-

(الف) پریم چند کی سب سے پہلی کہانی کا نام تھا ''عشق دنیا اور حبِ وطن'' نہ کہ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' یہ کہانی 'زمانہ' میں اپریل 1908ء میں شائع ہوئی تھی لیکن چونکہ یہ اس مجموعے کی پہلی کہانی کا نام ہے اس لیے پریم چند کو تسامح ہوا۔ ''سوزِ وطن'' جون/ جولائی 1908ء میں شائع ہوئی نہ کہ 1909ء میں (نوٹ: ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' اور اس مجموعے کی دیگر تین کہانیاں کسی رسالے میں شائع نہیں ہوئی تھیں)۔

(ب) پہلے ناول سے اگر پریم چند کی مراد 'اسرارِ معابد' سے ہے تو وہ کسی حد تک درست ہوسکتا ہے۔ کیونکہ یہ ناول بنارس کے ایک غیر معروف ہفت روزہ ''آوازۂ خلق'' میں 8 ر اکتوبر 1903ء سے یکم فروری 1905ء تک قسط وار شائع ہوتا رہا، لیکن پریم چند نے اس ناول کا کہیں ذکر نہیں کیا کیونکہ یہ ہر اعتبار سے انتہائی ناقص اور غیر معیاری تھا۔ اور پریم چند نے اسے کتابی صورت میں شائع کرانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔

(ج) 1902ء یا/ اور 1904ء میں پریم چند کا کوئی ناول شائع نہیں ہوا تھا۔ ''کشنا'' پریم چند کا پہلا ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن شواہد کے مطابق یہ 1907ء میں شائع ہوا تھا۔ جب کہ اس کے بعد کا ناول ''ہم خرما و ہم ثواب'' 1906ء کے اواخر سے پہلے پہلے شائع ہوگیا تھا۔ اس کا ہندی ترجمہ ''پریما'' کے نام سے 1907ء میں انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوا تھا۔

(2)

''اس وقت میں سررشتۂ تعلیم میں سب ڈپٹی انسپکٹر تھا اور ہمیر پور کے ضلع میں تعینات تھا۔ [مہوبا]۔ کتاب [سوز وطن] کو نکلے چھ مہینے ہو چکے تھے۔ ایک دن رات کو میں کیمپ میں بیٹھا ہوا تھا [کل پہاڑ میں] کہ کلکٹر صاحب کا پروانہ پہنچا کہ مجھ سے ملو۔ جاڑے کا موسم تھا۔ میں نے بیل گاڑی جتوائی اور راتوں رات تیس چالیس میل کا سفر طے کر کے دوسرے دن صاحب سے ملا۔ ان کے سامنے سوز وطن کی ایک جلد رکھی ہوئی تھی، میرا ماتھا ٹھنکا۔ اس وقت میں ''نواب رائے'' کے نام سے لکھا کرتا تھا۔ مجھے اس کا کچھ کچھ پتہ مل چکا تھا کہ خفیہ پولیس اس کتاب کے مصنف کی کھوج میں ہے۔ میں سمجھ گیا کہ ان لوگوں نے مجھے کھوج نکالا اور صاحب کلکٹر نے اسی کی جواب دہی کے لیے مجھے بلایا ہے......صاحب نے ایک ایک کہانی کا مجھ سے مطلب پوچھا اور آخر بگڑ کر بولے تمھاری کہانیوں میں سڈیشن [SEDITION] بھرا ہوا ہے......آخر کار فیصلہ ہوا کہ میں ''سوز وطن'' کی کل کاپیاں سرکار کے حوالے کردوں اور آئندہ صاحب سے اجازت لیے بغیر کچھ نہ لکھوں۔ میں سمجھا کہ چلو سستا چھوٹ گیا۔ کل ہزار کاپیاں چھپی تھیں اور ابھی مشکل سے تین سو جلدیں فروخت ہوئی تھیں۔ میں نے بقیہ سات سو کاپیاں زمانہ پریس سے منگا کر صاحب کی نذر کردیں۔''

تصحیح:-

(الف) سوز وطن جون/جولائی 1908ء میں شائع ہوئی تھی۔ پریم چند کا مہوبا کا تبادلہ جون 1909ء میں ہوا تھا اور انھوں نے 24/جون 1909ء میں مہوبا میں اپنے عہدے کا چارج سنبھالا تھا۔ یہ واقعہ کتاب کی اشاعت سے لگ بھگ ڈیڑھ سال بعد کا ہے (نہ کہ چھ مہینے بعد کا جیسا کہ پریم چند نے لکھا ہے) ـــــ جاڑوں کے موسم سے مراد نومبر/دسمبر ہو سکتی ہے۔

(ب) ''زمانہ'' پریم چند نمبر میں نگم صاحب کی تحریر پیش خدمت ہےـــــ

''...... چنانچہ سوز وطن کی جس قدر کاپیاں ان کے پاس تھیں وہ انھوں نے حکام کے حوالے کردیں۔ میرے پاس جو اسٹاک تھا اس کی خبر کسی نے نہ لی اور یہ کتابیں ضائع ہونے سے بچ گئیں اور آہستہ آہستہ فروخت ہوتی رہیں۔''

دیگر شواہد اور مندرجہ بالا تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب پریم چند اور نگم صاحب کی ساجھے داری میں چھپی تھی اور پریم چند اپنے حصے کی پانچ سو جلدیں لے کر اپنے ذرائع سے فروخت

کرتے رہے تھے اور کہ انھوں نے صرف وہی جلدیں کلکٹر کے حوالے کیں جو ان کے اپنے اسٹاک میں بچ رہی تھیں۔

نوٹ:۔ اس کتاب کی 'ضبطی' ایک قسم کی بے ضابطہ ضبطی تھی کیونکہ اس وقت کتابوں کی ضبطی کا کوئی قانون موجود نہیں تھا۔ اور یہ کتاب باضابطہ طور پر ضبط نہیں کی جاسکتی تھی۔ لیکن چونکہ پریم چند سرکاری ملازم تھے اس لیے حکام بالا کے دباؤ میں آکر کتاب کی وہ جلدیں جو ان کے اپنے اسٹاک میں تھیں، انھوں نے کلکٹر کے حوالے کردیں۔ کتابوں اور رسالوں وغیرہ کی ضبطی کا قانون 9/فروری 1910ء میں پاس ہوا تھا۔ اس ایکٹ کا مخفف نام تھا۔ ''انڈین پریس ایکٹ 1910ء (ایکٹ نمبر1)

ضمیمہ نمبر دو

پریم چند کے حالاتِ زندگی

از

منشی دیا نرائن نگم ایڈیٹر "زمانہ" کانپور

8 ر اکتوبر 1936ء کو پریم چند کی رحلت کے فوراً بعد نگم صاحب "زمانہ" کا پریم چند نمبر شائع کرنا چاہتے تھے۔ لیکن بوجوہ یہ یادگار نمبر فروری 1938ء میں آسمانِ ادب پر طلوع ہو سکا۔ اس میں دیگر ہم عصر مشاہیرِ ادب کے علاوہ نگم صاحب کا پینتیس صفحوں کو محیط ایک طویل مقالہ بھی شائع ہوا ہے۔

نگم صاحب نے اپنے مقالے کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے — (1) پریم چند کی باتیں (2) مسز پریم چند صاحبہ (3) پریم چند کی بعض تصانیف کا حال — اور (4) پریم چند کے خیالات۔

اس مضمون میں نگم صاحب نے پریم چند ہی کی طرح اپنی یادداشت پر بہت زیادہ بھروسا کیا ہے خاص طور پر "پریم چند کی باتیں" اور "پریم چند کی بعض تصانیف کا حال" میں اپنی ناقص یادداشت کو سند کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کے بغور مطالعے کے بعد مجھے نگم صاحب کے مضمون کی درج بالا دونوں شقوں میں تحقیق کی بہت سی خامیاں نظر آئیں۔ ان دونوں پر مکمل بحث کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

(1) پریم چند کی باتیں

(1) "...... یہ بھی سب لوگ جانتے ہیں کہ وہ 1881ء میں پیدا ہوئے تھے......"

تصحیح:۔ دھنپت رائے/نواب رائے/ پریم چند 31 ر جولائی 1880ء (مطابق ساون بدی

10 ربکری ست 1937) کے روز کائستھ، سری واستو گھرانے کے ایک معمولی سے ڈاک منشی عجائب لال کے گھر بنارس سے چار یا پانچ میل کے فاصلے پر ایک غیر معروف گاؤں لمی میں پیدا ہوئے تھے۔

(2) ''......انٹرنس پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ سنٹرل کالج الہ آباد میں داخل ہوئے اور 4-1903ء کے سیشن میں تعلیم حاصل کر کے انھوں نے اپریل 1904ء میں جونیر انگلش ٹیچرس سرٹیفکٹ کا امتحان اول درجہ میں پاس کیا......''

تصحیح:۔ پریم چند جب نویں درجہ میں تھے، اس سال ان کی شادی ہوگئی تھی اور اسی سال ان کے والد رحلت فرما گئے تھے۔ چنانچہ ایک سال کی تاخیر کے بعد انھوں نے انٹرنس کا امتحان دوسرے درجے میں 1899ء میں پاس کیا۔ والد کی وفات کے باعث معاشی حالات بہت دگر گوں ہو گئے تھے اس لیے کالج کی فیس ادا کرنے کے قابل نہیں تھے۔ چونکہ وہ دوسرے درجے میں پاس ہوئے تھے اس لیے کسی بھی کالج نے ان کی فیس معاف کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ ریاضی کے مضمون میں بہت کمزور تھے (بلکہ ''نالائق'' تھے) یہی وجہ تھی کہ نئے نئے کھلے ہندو کالج نے بھی انھیں داخلہ نہیں دیا۔ انھوں نے اپنے ریاضی کے مضمون کو بہتر بنانے کے لیے بنارس میں رہ کر لائبریری میں اس مضمون کا مطالعہ کرنے کی ٹھانی۔ دہاں اسے ایک دوست کی مدد سے ایک وکیل صاحب کے صاحبزادوں کو ٹیوشن دینے کی پانچ روپے پر نوکری بھی مل گئی۔ وکیل صاحب نے اپنے اصطبل کے اوپر ان کے رہنے کے لیے ایک چھوٹی سی کوٹھری بھی دے دی۔ پانچ روپے میں سے تین روپے (کبھی اڑھائی روپے) وہ گھر میں دیتے تھے۔ باقی دو روپے میں گزارہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اکثر و بیشتر دوست سے ادھار لے لے کر کام چلاتے۔ مہینے کے شروع میں ادھار چکاتے۔ کبھی کبھی ادھار مانگنے میں سنکوچ ہوتا تو فاقوں کا منہ بھی دیکھنا پڑتا۔ ایک روز، دو دن بھنے ہوئے چنے کھانے کے بعد، ایک بک سیلر کی دکان پر وفیسر چکرورتی کی حساب کی شرح جو انھوں نے دو روپے میں خرید کی تھی اور سنبھال سنبھال کر رکھی ہوئی تھی، اس کو صرف ایک ہی روپے میں فروخت کر کے پیٹ پوجا کی سوچ ہی رہے تھے کہ اس بک سیلر کی دکان پر ان کی ملاقات چنار گڑھ کے مشنری اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے ہوگئی۔ ہیڈ ماسٹر کو ایک اسسٹنٹ ماسٹر کی ضرورت بھی تھی۔ پریم چند سے گفتگو کے بعد مطمئن ہو کر انھیں اٹھارہ روپیہ ماہوار کی نوکری کی آفر کی جو انھوں نے فوراً قبول کر لی۔ لیکن چھے ماہ کے اندر اندر اپنے ایک رفیق مولوی ابن علی کے ساتھ

ہو رہی کسی ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانے کے جرم میں مولوی صاحب اور دھنپت صاحب (پریم چند) دونوں کو نوکری سے نکال دیا گیا۔ آخر کافی تگ و دو کے بعد 2/ جولائی 1900ء کے روز بہرائچ کے (سرکاری) ضلع اسکول میں انھیں پانچویں ماسٹر کے طور پر نوکری مل گئی۔ درج بالا تاریخ سے ان کی سرکاری نوکری یعنی اسکول ٹیچری کا آغاز ہوتا ہے۔ 21/ ستمبر 1900ء میں ان کی تبدیلی پرتاپ گڑھ کے لیے ہوگئی۔ یہاں وہ 5/ جولائی 1902ء تک رہے پھر نصف تنخواہ پر دو سال کے لیے گورنمنٹ سنٹرل کالج الہ آباد میں داخلہ لیا۔ وہاں 30/ اپریل 1904ء کو جونیر انگلش ٹیچرس ٹریننگ کا کورس پہلے درجے میں پاس کر کے پھر پرتاب گڑھ واپس جا کر اسی اسکول میں پڑھانا شروع کر دیا۔ اس کے بعد مختلف مقامات پر وقتاً فوقتاً ان کا تبادلہ ہوتا رہا۔

(3) "......انٹر میڈیٹ کا امتحان......1910ء میں سیکنڈ ڈویژن میں (...... پاس کیا)

تصحیح:۔ یہ امتحان انھوں نے 1916ء میں پاس کیا تھا کیونکہ ریاضی اب لازمی مضمون نہیں رہا تھا اس لیے ریاضی کی جگہ دوسرا کوئی مضمون لے کر نوکری ہی کے دوران تیاری کر کے یہ امتحان دیا تھا۔ اس امتحان میں ان کے مضامین تھے:۔ انگریزی لٹریچر۔ منطق، کلاسیکل زبان (فارسی) اور ہسٹری۔

(4) "1905ء سے 1908ء تک گورنمنٹ اسکول کانپور میں اسسٹنٹ ٹیچر رہے۔ کانپور سے مہوبا ہمیر پور میں ڈسٹرکٹ بورڈ کے سب ڈپٹی انسپکٹر مقرر ہو گئے۔ اور مہوبا میں چھ سال تک مسلسل رہے......"

تصحیح — کانپور میں ان کا تبادلہ 13/ مئی 1905ء کو ہوا تھا جہاں وہ 16/ جون 1909ء تک رہے۔ اس تبادلے سے پہلے وہ کچھ عرصہ کے لیے کانپور ہی میں سب ڈپٹی انسپکٹر (قائم مقام) کے طور پر بھی کام کرتے رہے۔ (4/ دسمبر 1907ء سے 29/ اپریل 1909ء تک)۔ مہوبا (ضلع ہمیر پور) میں انھوں نے سب ڈپٹی انسپکٹر کا عہدہ 24/ جون 1909ء کو سنبھالا جہاں وہ (لگ بھگ پانچ برس) یکم جولائی 1914ء تک اسی عہدے پر رہے۔

(5) "...... پھر جب مسلسل دوروں کا بار برداشت نہ ہو سکا اور صحت خراب رہنی تو مجبور ہو کر مدرسی پر لوٹے اور جولائی 1915ء میں گورنمنٹ اسکول بستی میں ٹیچر ہو گئے......

تصحیح:—— بستی میں ان کی تقرری بطور اسسٹنٹ ماسٹر 12/ مئی 1915ء کو ہوئی جہاں وہ 12/ اگست 1916ء تک تعینات رہے۔

(6)...... گورکھپور میں وہ مارچ 1922ء تک رہے...... مارچ 1922ء میں بنارس چلے گئے اور اسی ماہ کانپور آئے اور مہاشے کاشی ناتھ جی منیجر مارواڑی اسکول کی کوشش سے اس اسکول کے ٹیچر ہو گئے...... جہاں اگست 1922ء میں ان کا دوسرا لڑکا امرت رائے پیدا ہوا......اس طرح مارچ 1923ء میں وہ یہاں سے مستعفی ہو کر بنارس چلے گئے......"

تصحیح:۔ بطور ہیڈ ماسٹر، مارواڑی اسکول کانپور کا چارج، پریم چند نے، 23/ جون 1921ء کو لیا تھا۔ اسی سال پندرہ اگست 1921 کو امرت رائے کا جنم ہوا۔ (امرت رائے صاحب نے میرے ایک خط کے جواب میں تحریر فرمایا تھا۔ "میری تاریخ پیدائش یوں تو 15/ اگست 1921ء ہے جو آپ کو میرے ہائی اسکول کے سرٹیفکیٹ میں اور سب جگہ ملے گی۔ مگر چونکہ میری ماں کہتی تھیں کہ میری پیدائش سنیچر کے روز کی ہے۔ اور EPHEMEIRS [تقویم] میں دیکھا کہ 15/ اگست 1921ء سنیچر کا دن نہیں تھا۔ اور میرے دوست جو علم نجوم کے اچھے جانکار ہیں مجھے میری کنڈلی دیکھ کر بتایا کہ ستاروں کی وہ POSITION پچھلی تاریخ کے قریب سے 3/ ستمبر 1921ء کو ملتی ہے۔ تو اب میں نے 3/ ستمبر کو اپنی تاریخ مان لیا ہے۔" (امرت رائے کا خط راقم الحروف کے نام: مورخہ 27/ ستمبر 1991ء) مارواڑی اسکول سے پریم چند نے فروری 1922ء میں استعفا دیا تھا۔

(7) "......لیکن ہندی کے نامور سرپرست سر بجت (سری مت) شیو پرشاد کی تحریک پر انھوں نے ہندی رسالہ "مریادا" کا ایڈیٹوریل چارج لے لیا۔ اس کے ایڈیٹر بابو سمپورن آنند جی کو نان کوآپریشن [ترک موالات] کے سلسلے میں جیل جانا پڑا تو گپت جی نے پریم چند کو یاد کیا۔ ڈیڑھ سال تک وہ اس خدمت کو انجام دیتے رہے......"

تصحیح:۔ بابو سمپورنانند جی دسمبر 1921ء سے جولائی 1922ء تک جیل میں رہے۔ پریم چند نے مارچ 1922ء میں "مریادا" کی ادارت شروع کی تھی ـــ جیٹھ، بکری سمت 1979 (1922ء) کے مریادا میں اپنے قارئین کو مخاطب کرتے ہوئے بابو سمپورنانند نے لکھا ـــ "چھ ماہ جیل میں رہ کر میں پھر دنیا میں لوٹا ہوں۔ رسالے کے ناشر کی مہربانی سے مجھے پھر آپ لوگوں کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقعہ ملا ہے......"

اس حساب سے پریم چند کو بمشکل تین چار ماہ "مریادا" کی ادارت کا موقعہ ملا ـــ بہر حال 'مریادا' کے مالک اور گیان پیٹھ کے بانی شیو پرشاد گپت کی کوشش سے پریم چند کو کاشی ودیا

پیٹھ کے ابتدائی درجوں کے اسکول میں اوائل جولائی 1922ء میں ہیڈ ماسٹر کی نوکری مل گئی۔ یکم جولائی 1923ء سے یہ اسکول بند کردیا گیا تھا۔ اور پریم چند کی بھی اسکول سے چھٹی ہوگئی۔۔۔ (اسی سال 20؍ جولائی کو ان کا اپنا پرنٹنگ پریس بنارس میں سرسوتی پریس کے نام سے جاری ہوا۔ اس میں پریم چند کے ساتھ ان کا سوتیلا بھائی مہتاب رائے چچیرا بھائی [تاؤ کا لڑکا] بلدیو لال اور فراق گورکھپوری حصے دار تھے۔ پریس میں جاب ورک (JOB WOR) کے علاوہ پریم چند کی اپنی کچھ کتابیں بھی شائع ہوئی تھیں۔ لیکن پریس انتہائی محنت کے باوجود گھاٹوں کی فصل اگاتا رہا۔ پھر مارچ 1930ء میں ہندی ماہوار رسالہ "ہنس" جاری کیا۔ اور اگست 1933ء میں ہفت روزہ "جاگرن" کی اشاعت بھی شروع کردی کہ شاید ان کی اشاعت اور فروخت سے پریس کے نقصانات کچھ کم ہوں لیکن ان کے اجرا سے نقصان اور بھی زیادہ ہونے لگا۔ چنانچہ پریس کبھی مہتاب رائے اور کبھی بلدیو رلال کے سپرد کر کے مختلف نوکریاں کر کے اور کتابوں اور مضامین کے معاوضوں سے پریس کا پیٹ بھرتے رہے۔)

(8) "......1925ء میں ہندی کے مشہور دارالاشاعت گنگا پستک مالا آفس لکھنؤ میں غالباً سو روپیہ ماہوار پر انھوں نے لٹریری اسسٹنٹ کی آسامی قبول کرلی۔ یہاں دس ماہ تک کام کیا لیکن گزارہ نہ ہوا تو اپریل 1926ء میں پھر بنارس لوٹے اور جون 1928ء تک وہیں رہے۔ جولائی 1928ء میں منشی بشن نراین مالک مطبع منشی نولکشور کی قدر دانی نے انھیں پھر لکھنؤ کھینچ بلایا...... چنانچہ جولائی 1928ء سے نومبر 1931ء تک وہ نولکشور پریس میں رہ کر مطبع کی مختلف خدمات انجام دیتے رہے......"

تصحیح:۔ ستمبر 1924ء کے وسط سے کچھ پہلے انھوں نے گنگا پستک مالا کاریالیہ کا عہدہ سنبھالا تھا۔ یہاں وہ 30؍ اگست 1925ء تک رہے۔۔۔ 15؍ فروری 1927ء کے روز انھوں نے نولکشور پریس میں ماہنامہ "مادھوری" کے مدیر معاون کا عہدہ سنبھالا۔ 9؍ اکتوبر 1931ء کو نولکشور پریس سے علاحدہ ہوگئے تاہم بوجوہ 13؍ مئی 1932ء تک لکھنؤ ہی میں رہے۔

(9) "......جنوری 1930ء میں انھوں نے "ہنس" نامی ایک ہندی ماہوار رسالہ جاری کیا۔ مگر چھ ماہ بھی مشکل سے گزرنے نہ پائے تھے کہ جون 1930ء میں آرڈیننس کے ماتحت اس سے ایک ہزار کی ضمانت مانگی گئی جس پر آپ نے پرچہ بند کردیا۔ مگر چھ ماہ بعد جب آرڈیننس (ORDINANCE) منسوخ ہوگیا تو آپ نے جنوری 1931ء میں دوبارہ جاری کردیا۔ مگر

دو ہی تین نمبر نکلے ہوں گے کہ قاتل نامی ایک کہانی کی اشاعت کی علت میں پھر ضمانت مانگی گئی....."

تصحیح:—— یہ ضمانت سرسوتی پریس سے طلب کی گئی تھی، ہنس سے نہیں (دیگر "ہنس کا اجرا دس مارچ 1930ء ہوا تھا نہ کہ جنوری میں)—— گورنر کے چیف سیکریٹری کا 24/جولائی 1930ء کا محررہ خط پریم چند کو 29/ جولائی کو ملا۔ اس کے مطابق انڈین پریس آرڈ ینینس (ORDINANCE)1930ء کے سب سیکشن نمبر تین (3) کے تحت سرسوتی پریس سے ضمانت طلب کی گئی تھی۔ جولائی 1930ء کا ہنس اس وقت تک صرف بتیس (32) صفحے تک ہی طبع ہو سکا تھا۔ پریم چند نے آرڈیننس منسوخ کرانے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر اس کا سرورق شری کاشی رام پریس، سے طبع کرا کر بتیس (32) صفحے کا پرچہ ہی شائع کر دیا (اگر یہ ضمانت ہنس سے طلب کی گئی ہوتی تو 32 صفحے کا ہنس بھی شائع ہو کر مارکیٹ میں نہیں آ سکتا تھا۔) "ہنس" اور "سرسوتی پریس" دونوں بند کر دیے گئے کیونکہ دوسرا کوئی پریس "ہنس" شائع کرنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔ اس کی وجہ تھی سرکار مخالف پالیسی——! اسی سال نومبر کے اوائل میں سرسوتی پریس پر پریس ایکٹ کے تحت لگائی گئی پابندی اٹھالی گئی، سرسوتی پریس پھر سے جاری ہو گیا اور "ہنس" کی اشاعت بھی شروع ہو گئی۔

بعد میں ایک اور آرڈینینس جاری ہوا تھا جس کے تحت اگست 1932ء میں "ہنس" سے ایک ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی تھی۔ اگست کا شمارہ چھپ کر بالکل تیار تھا لیکن مارکیٹ میں نہیں بھیجا جا سکا۔ آخر اگست 16/21 کے دوران سرکار نے ضمانت جمع کرانے کا حکم واپس لے لیا تو اگست کا شمارہ مارکیٹ میں آ سکا۔

"قاتل" نامی کہانی "ہنس" ہی میں نہیں بلکہ ہندی کے کسی بھی رسالے میں شائع نہیں ہوئی تھی۔ اردو میں یہ "آخری تحفہ" (1934ء) کے افسانوی مجموعہ میں شامل ہے۔ (10/اگست 1933ء کو انھوں نے جاگرن نامی پندرہ روزہ کی ذمہ داری بھی لے لی۔ اور اسے ہفت روزہ کر دیا۔)

"جاگرن" پندرہ روزہ اخبار تھا جسے ونود شنکر دیاس چلاتے تھے، لیکن مسلسل نقصانات کے نتیجے میں اسے انھوں نے پریم چند کے سر مڑھ دیا۔ پریم چند کی بدقسمتی کہ انھوں نے یہ اخبار ہفت روزہ کر دیا۔ سرسوتی پریس اور "ہنس" پہلے ہی گھاٹے میں چل رہے تھے۔ لیکن پریم چند نے کھلے

استروں کی یہ تیسری مالا بھی اپنے گلے میں ڈال لی۔ دراصل مقصد یہ تھا کہ پریس کو کام ملتا رہے کیونکہ جاب ورک (JOB WORK) سے پریس کا پیٹ نہیں بھر رہا تھا اور پریس سے کام کرانے والے معاوضے کے نام پر انھیں جھوٹے وعدوں سے ٹرخاتے رہتے تھے۔ ادھر کاغذ اور پریس کی دیگر ضروریات کے سامان سپلائی کرنے والے ان کے سر پر ننگی تلوار کی طرح لٹکے رہتے تھے۔ پریم چند کو اپنی کتابوں کی اشاعت اور فروخت سے جو امیدیں وابستہ تھیں وہ بھی چکنا چور ہو رہی تھیں۔ بعض کتابیں تو اس حد تک گھٹیا شائع ہوئی تھیں کہ کوئی انھیں ردی کے بھاؤ پر بھی خرید کرنے کو تیار نہیں تھا۔ ایسے حالات میں ''جاگرن'' کو گود لینا حماقت کی حد کو چھو لینا تھا۔

بہر حال پریم چند کی ادارت میں اس کا پہلا شمارہ 22/اگست 1932ء کو شائع ہوا۔ لیکن پریم چند کی توقع کے خلاف اس نے بھی مسلسل ہو رہے گھاٹوں میں اور اضافہ کر دیا۔ آخر 28/مئی 1934ء کے بعد بابو سمپورنانند نے اسے بڑے پیار سے اپنی باہوں کے حلقے میں لے لیا لیکن وہ بھی اسے بہ مشکل تیرہ شماروں تک شائع کر سکے اور جاگرن سدا کے لیے موت کی ٹھنڈی قبر میں دفن ہو گیا۔

(II) پریم چند کی بعض تصانیف کا حال

(1) ''جہاں تک مجھے یاد ہے پریم چند جی کا سب سے پہلا ناول ''ہم خرما و ہم ثواب'' کے نام سے بابو مہادیو پرشاد ورما لکھنوی کے اہتمام میں شائع ہوا تھا......''

تصحیح:- ''ہم خرما و ہم ثواب'' کا پہلا ایڈیشن نولکشور پریس لکھنؤ سے باہتمام بابو منوہر لال بھارگو سپرینٹنڈنٹ (پریس ہذا) شائع ہوا تھا۔ اس پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے تاہم ''زمانہ'' کے ستمبر 1906ء کے شمارے میں اس کا پہلا اشتہار شائع ہوا۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ستمبر 1906ء سے پہلے پہلے شائع ہو گیا تھا۔ پریم چند کا پہلا ناول دراصل کشنا تھا لیکن یہ ہم خرما و ہم ثواب' کے بعد میڈیکل ہال پریس بنارس سے دسمبر 1906ء یا اس کے بعد شائع ہو سکا۔ زمانہ اگست 1907ء میں اس کا اشتہار شائع ہوا اور زمانہ اکتوبر نومبر 1907 کی اشاعت میں اس پر نوبت رائے نظر کا تبصرہ شائع ہوا۔ یہ ناول اب بالکل ناپید ہے۔ میں نے وسط جون 2000 میں لنڈن جا کر برٹش لائبریری میں اس کو ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن ناکام لوٹا۔ قارئین کی اطلاع کے لیے یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ پہلے ہندوستانی کتابوں کے لیے انڈیا آفس لائبریری مختص تھی لیکن

کچھ عرصہ پہلے انڈین آفس لائبریری اور برٹش میوزیم لائبریری دونوں کا پورا ذخیرۂ کتب، مخطوطے اور آرٹ کی سبھی اشیا وغیرہ اس نئی لائبریری کی بڑی نئی اور کشادہ لائبریری میں منتقل کر دی گئی تھیں۔ دو روز کی انتہائی کوشش کے باوجود گوہر مقصود تک رسائی نہیں ہو سکی۔ اب اس ناول سے ہاتھ دھو لینا چاہیے۔ تاہم خدا سے دعا ہے کہ پریم چند کے کسی اور پریمی کو یہ ناول کسی نا کسی طرح دستیاب ہو جائے۔ تاکہ پریم چند کی ایک اہم یادگار ضائع ہونے سے بچ جائے۔

(2) ''...... 1907ء میں سوز وطن کے نام سے پانچ قصوں کا چھوٹا سا مجموعہ زمانہ پریس سے شائع ہوا......''

تصحیح۔ ''سوز وطن'' جون/ جولائی 1908ء میں زمانہ پریس سے شائع ہوا تھا۔ ''زمانہ'' کے ستمبر۔ اکتوبر 1908ء کے مشترکہ شمارے میں اس کا اشتہار شائع ہوا۔ ''سوز وطن'' حب وطن کی کہانیوں کا مجموعہ تھا۔ یہ مجموعہ ''نواب رائے'' کے قلمی نام سے (حسب دستور) شائع ہوا تھا۔ لیکن صیغۂ تعلیم کے کار پردازان کو کسی نہ کسی طرح پتہ چل گیا کہ اس حب الوطنی کے گناہ کا مرتکب اس محکمہ کا ایک سب ڈپٹی انسپکٹر ''دھنپت رائے'' ہے تو محکمہ کی طرف سے تادیبی کارروائی کے بعد دھنپت رائے/ نواب رائے سے ایک تحریری وعدہ لیا گیا کہ وہ کوئی بھی مضمون شائع کرانے سے پہلے محکمہ ہٰذا کی منظوری حاصل کریں گے۔ دھنپت رائے نے نواب رائے کے قلمی نام سے کچھ عرصہ کے لیے لکھنا بند کر دیا۔ ان کی تحریریں 'د۔ر' یا 'ن۔ر' وغیرہ کے ناموں سے شائع ہونے لگیں۔ لیکن اس انتظام سے وہ خوش نہیں تھے۔ آخر نگم صاحب کے مشورے سے انھوں نے اپنا قلمی نام پریم چند رکھ لیا۔ اس نام سے ان کی پہلی کہانی ''بڑے گھر کی بیٹی'' زمانہ کے دسمبر 1910ء کے شمارے سے شائع ہوئی۔

(3) ''ہندی میں ان کا سب سے پہلا ناول ''پرتگیا'' نامی ہے جو غالباً 1906ء میں لکھا گیا تھا۔ اور جس کا اردو ترجمہ ''بیوہ'' کے نام سے شائع ہوا ہے......''

تصحیح:۔۔۔ پریم چند کے پہلے ہندی ناول کا نام ''پریما'' ہے۔ یہ ''ہم خرما و ہم ثواب'' کا ہندی ترجمہ ہے جو 1907ء میں انڈین پریس، الہ آباد سے شائع ہوا تھا۔ اس وقت تک پریم چند کو ہندی لکھنے کی مہارت نہیں تھی اس لیے یہ ترجمہ کسی اور سے کرایا گیا تھا۔ ہندی ترجمے میں کافی جگہوں پر ردو بدل ہے۔

''پرتگیا'' سرسوتی پریس سے 1929ء کو شائع ہوا اور ''بیوہ'' کا پہلا ایڈیشن پریم چند نے

اپنے اخراجات سے (مطبع کا نام نامعلوم) 1932ء میں شائع کرایا۔ مکتبہ جامعہ سے اس کا چوتھا ایڈیشن 1945ء میں شائع ہوا۔

(4) اس کے بعد گم صاحب نے ان کے کچھ ہندی ناولوں کے بارے میں لکھا ہے۔ کچھ ناول پہلے اردو میں لکھے گئے لیکن ان کی اشاعت پہلے ہندی میں ہوئی۔ ان سب کی ترتیب اور تفصیل تحقیقی اعتبار سے گمراہ کن ہے۔ چنانچہ میں ان کے سبھی ناولوں کے اردو اور ہندی نام دے کر ان کا مختصر حال بیان کرتا ہوں۔

(1) اسرار معابد (اردو) دیوستھان رہسیہ (ہندی)

یہ ناول نما تحریر پریم چند کی پہلی تخلیقی کوشش ہے جس میں ایک مبتدی کی سبھی خامیاں موجود ہیں۔ یہ بنارس کے ایک غیر معروف ہفتہ وار اخبار ''آوازۂ خلق'' میں 8/ اکتوبر 1903ء سے یکم فروری 1905ء تک قسط وار شائع ہوا تھا۔ پریم چند نے اس ناول کی خامیوں کے پیش نظر اسے بھلا دیا تھا۔ لیکن ان کے دوسرے بیٹے امرت رائے نے اسے کسی نہ کسی طرح آوازۂ خلق سے حاصل کر کے ہندی میں ''دیوستھان رہسیہ'' کے نام سے شائع کرا دیا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے پریم چند کی کلیات شائع کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے اور اسے مرتب کرنے کا کام پریم چندیات کے مشہور ماہر شری مدن گوپال کے سپرد کیا ہے۔ اس کی پہلی جلد میں ''دیوستھان رہسیہ'' کے مشکل ہندی/سنسکرت الفاظ کا اردو ترجمہ کر کے مدن گوپال صاحب نے پھر سے اسے ''اسرار معابد'' کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ (سنہ اشاعت: جولائی، ستمبر 2000ء)

(2) ہم خرما و ہم ثواب اور پریما۔۔۔ ان کی تفصیل درج بالا سطور میں پیش کر دی گئی ہے۔

(3) کشنا۔۔۔ اس کے بارے میں بھی تفصیل شروع کی سطور میں نمبر (1) کے تحت پیش کر دی گئی ہے۔

(4) روٹھی رانی (ناولٹ) یہ پریم چند کا طبع زاد ناول نہیں ہے بلکہ راجپوتانہ کے مشہور مورخ و مصنف منشی دیبی پرشاد کے اس ناول کا اردو ترجمہ پریم چند نے کیا تھا۔ یہ پہلے ''زمانہ'' میں اپریل، مئی 1907ء کی مشترکہ اشاعت اور اگست 1907ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ دوسری اشاعت کے آخر میں 'ماخوذ و ترجمہ از ہندی' کے الفاظ بھی تحریر ہیں۔ زمانہ پریس سے جنوری 1919ء میں نواب رائے کے نام سے شائع ہوا تھا۔ امرت رائے نے اسے طبع زاد سمجھتے ہوئے اس کا پھر سے ہندی میں ترجمہ کر دیا تھا۔

(5) جلوۂ ایثار/ وردان:- اردو میں "جلوۂ ایثار" کے نام سے 1912ء اور ہندی میں وردان کے نام سے بکری ست 1977 (1920ء) میں شائع ہوا۔ تفصیل ضمیمہ نمبر 4 میں موجود ہے۔

(6) بازارِ حسن/ سیوا سدن۔۔۔ اردو میں بازارِ حسن براہِ راست لکھا گیا تھا۔ یہ 1921/22ء میں شائع ہوا۔ سیوا سدن کی اشاعت ہندی میں پہلے ہوگئی (بکری ست 1975 (1918ء) تفصیل ضمیمہ نمبر 4 میں موجود ہے۔

(7) گوشۂ عافیت/ پریم آشرم:- یہ ناول بھی اصلاً اردو میں لکھا گیا۔ لیکن ہندی میں پریم آشرم کے نام سے 1922ء میں شائع ہوگیا۔ اردو میں دو حصوں میں 1929ء میں شائع ہوا۔ مکمل تفصیل ضمیمہ نمبر 4 میں دی گئی ہے۔

(8) چوگانِ ہستی/ رنگ بھومی۔۔۔ اصلاً اردو میں لکھا گیا۔ یہ ان کا سب سے طویل ناول تھا۔ ہندی اور اردو میں دو جلدوں میں شائع ہوا۔ ہندی میں "رنگ بھومی" کے نام سے بکری ست 1981 (1924ء) اور اردو میں "چوگانِ ہستی" کے نام سے 1928ء میں شائع ہوا۔۔۔ ضمیمہ نمبر 4 میں مکمل تفصیل دی گئی ہے۔

(9) پردۂ مجاز/ کایا کلپ: یہ براہِ راست ہندی میں لکھا گیا۔ بکری ست 1983 (1926ء) میں شائع ہوگیا۔ اردو میں دو جلدوں میں لاجپت رائے اینڈ سنس کی طرف سے اواخر 1931 یا اوائل 1932 میں شائع ہوا۔ تفصیل ضمیمہ نمبر 4 میں۔

(10) نرملا۔۔۔ ہندی اور اردو میں ایک ہی نام سے چھپا۔ ہندی میں جنوری 1927ء اور اردو میں 1929ء میں شائع ہوا۔ تفصیل کے لیے دیکھئے ضمیمہ نمبر 4۔

(11) پرتگیا/ بیوہ۔۔۔ "پرتگیا" سرسوتی پریس، بنارس سے 1929ء میں شائع ہوا۔ بیوہ، پرتگیا کا اردو ترجمہ ہے اسے پریم چند نے خود اپنے اخراجات پر لکھنؤ سے 1932ء میں شائع کرایا۔ تفصیل ضمیمہ نمبر 4 میں۔

(12) غبن:- ہندی اور اردو دونوں میں ایک ہی نام سے شائع ہوا۔ ہندی میں ایک ہی جلد میں مارچ 1931ء میں شائع ہوا۔ اردو میں اس کی اشاعت مستند حوالوں سے 1933ء (دو جلدوں میں)۔ تفصیل ضمیمہ نمبر 4۔

(13) میدانِ عمل/ کرم بھومی:- پہلے کرم بھومی کے نام سے 1932ء میں اور پھر اردو میں میدانِ عمل کے نام سے 1935ء میں شائع ہوا۔ تفصیل ضمیمہ نمبر 4۔

(14) گئوودان/گودان:۔ یہ پریم چند کا آخری ناول تھا۔ ہندی میں گودان کے نام سے جون 1936ء میں شائع ہوا۔اردو میں گئوودان کے نام سے ترجمہ ہونے کے بعد 1939ء میں شائع ہوا۔تفصیل ضمیمہ نمبر 4۔

(15) نامکمل ناول ''منگل سوتر''—— یہ ادھورا ناول پریم چند نے اپنی جان لیوا بیماری کے دوران تحریر فرمایا تھا۔سب سے پہلے یہ ہنس میں فروری 1948ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ بعد میں ''پریم چند/ پہار''اور''پریم چند سمرتی''میں بھی شائع کیا گیا۔

بہت اہم :—— اردو میں ہندوستان میں اسے کسی ناشر نے شائع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔لیکن پاکستان میں پریم چند کے ایک مداح ڈاکٹر حسن منظر نے اس کا ترجمہ وتعارف 1991ء میں ''مشہور آفسٹ پریس'' کراچی سے شائع کرایا۔کل صفحات 93۔ قیمت 20روپے موصوف نے اس کی مجھے دس کاپیاں ارسال کی تھیں۔ایک کاپی میں نے امرت رائے کو بھیجی تھی۔باقی کی آٹھ کاپیاں میں نے کس کس کو ارسال کی تھیں مجھے یاد نہیں ہے۔صرف ایک کاپی میرے پاس موجود ہے۔

ضمیمہ نمبر تین

زمانہ اور پریم چند

اس باب میں زمانہ کے کار پردازان نے مختلف عنوانات قائم کر کے پریم چند کے تنقیدی مضامین (تبصرے وغیرہ) سوانح عمریاں، ادبی مضامین، متفرق مضامین اور مختصر افسانوں کی زمانہ میں اشاعت کی تفصیل پیش کی ہے۔ یہ تفصیل بہت سی لغزشوں اور غلط بیانیوں سے پُر ہے۔ کہیں کہیں مرتب کی بوالعجبیاں اور کچھ مقامات پر کتابت کی غلطیاں محققین کا منہ چڑا رہی ہیں اور انھیں غلط راہ پر ڈال رہی ہیں۔ اس کے نتیجے میں بعض محققوں نے ان تفصیلات پر آنکھ بند کر کے بھروسا کر لیا ہے اور اپنی تحریروں میں متعدد جگہوں پر ان غلطیوں کو دوہرایا ہے۔ میں اس فہرست کی غلطیوں کی نشان دہی کر رہا ہوں تا کہ مستقبل کے محقق ان غلطیوں کا اعادہ نہ کریں۔

(1) تنقید:

(5) پیک ابر (ترجمہ میگھدوت) اپریل 1917ء کی جگہ جولائی 1917ء تحریر ہے۔

درج ذیل تنقیدیں (تبصرے) اس لسٹ میں موجود نہیں ہیں۔

(1) حال کی بعض کتابیں: اس میں تبصرے مارچ1906ء میں کیے گئے تھے۔

(2) حال کی بعض کتابیں: (آثار اکبری وغیرہ پر تبصرے) اکتوبر 1906ء

(3) تنقید: (وکرم اروسی، ترجمہ از مولوی عزیز مرزا اور وؤ ریتی) فروری 1908ء

(4) بہاری ست سئی (ہندی) از پنڈت پدم سنگھ شرما پر تبصرہ۔ فروری 1920ء

(نوٹ) تبصرے پر کتاب کے مصنف کا نام پدم سنگھ کی بجائے پرم سنگھ لکھ دیا گیا ہے)

(2) سوانح عمریاں:

(1) زمانہ اکبر نمبر (اکتوبر 1905ء بیادگار ابوالمظفر جلال الدین محمد اکبر بادشاہ عرش

آشیانی) اس میں مان سنگھ کی سوانح عمری کا ذکر کیا گیا ہے لیکن راجہ ٹوڈرمل کا کہیں بھی ذکر نہیں کیا گیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ٹوڈرمل کے خاتمے پر ''نواب رائے'' کا نام نہیں دیا گیا۔ بہر حال یہ سوانح عمری پریم چند کی سوانح عمریوں کی کتاب ''باکمالوں کے درشن'' (ناشر: لالہ رام نرائن لال، الہ آباد۔ پہلی اشاعت 1929ء) کی فہرست میں نمبر 2 پر موجود ہے اس لیے اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ یہ تحریر نواب رائے/ پریم چند کی ہے۔

(سوانح عمریوں کی اس کتاب میں بطور مصنف پریم چند کا نام دیا گیا ہے)

(2) زلیخا:- زمانہ کے اکتوبر 1909ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس کا ذکر نہیں ہے۔

(3) جون آف آرک:- زمانہ کے جولائی 1909ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس کا بھی ذکر نہیں ہے (بطور مصنف 'د۔ ژ' کا نام ہے)

(4) قیس: زمانہ جلد نمبر 20 درج ہے۔ مہینہ اور سنہ معلوم نہیں ہو سکا (خدا بخش لائبریری—''پریم چند ادبیات سلسلہ نمبر 10۔ جلد نمبر 1) تاہم ڈاکٹر گوئنکا کے مطابق: زمانہ فروری 1913 (ص 484)

(5) منشی بشن نرائن مرحوم: ('زمانہ' فروری 1931ء ایضاً

تحقیقی اغلاط کی تصحیح

(1) لسٹ میں نمبر 10۔ بھارتیہ و بابو ہریش چند۔ اشاعت جنوری 1924ء کی بتائی گئی ہے۔ درست اشاعت جنوری 1914ء

(2) لسٹ میں نمبر 11۔ کالی داس کی شاعری: اس میں صرف سنہ دیا گیا ہے۔ یہ اگست 1914ء میں شائع ہوا تھا۔

(3) لسٹ میں نمبر 12۔ بہاری—اس بھی صرف سنہ دیا گیا ہے۔ یہ اپریل 1917ء میں شائع ہوا تھا۔

(3) ادبی مضامین:

(1) ہندوستانی فنِ تصویر— ''زمانہ'' اکتوبر 1910ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کا ذکر

نہیں کیا گیا۔

تحقیقی اغلاط کی تصحیح

(1) گالیاں ـــــ (لسٹ میں نمبر 2) یہاں اشاعت دسمبر 1907ء دی گئی ہے۔ حالانکہ یہ دسمبر 1909ء میں شائع ہوا تھا۔

(2) کاؤنٹ ٹالسٹائی اور فن لطیف (لسٹ میں نمبر 7) مارچ 1927ء کی بجائے جون 1920ء ہونا چاہئے۔

(3) ادب کی غرض وغائت (لسٹ میں نمبر 9) اپریل 1937ء کی بجائے اپریل 1936ء ہونا چاہئے۔

(4) متفرق مضامین:

تصحیح ـــــ (فہرست میں نمبر 2) صوبہ متحدہ میں ابتدائی تعلیم: مئی، جون 1908ء کی بجائے مئی، جون 1909 ہونا چاہیے۔ ـــــ درج ذیل مقالے اس فہرست میں موجود نہیں ہیں۔

(1) ہندو تہذیب اور رفاہ عام۔ مارچ 1912ء (اس کے آخر میں لکھا ہے ماخوذ از ڈان یعنی یہ ترجمہ ہے)

(2) ادب میں فرعونیت: دسمبر 1930ء

(5) مختصر افسانے:

اس فہرست میں ''زمانہ'' میں اٹھادن افسانوں کی اشاعت کا ذکر ہے۔ لیکن کم سے کم گیارہ افسانوں یا افسانہ نما تحریروں کا ذکر نہیں کیا گیا جن کی تفصیل میں دے رہا ہوں۔ لیکن اس سے پہلے شائع شدہ افسانوں میں تحقیقی غلطیوں کی تفصیل:

(1) سیر درویش (فہرست میں دوسرا نمبر) یہ افسانہ اپریل، مئی، جون اور جولائی 1910ء کی چار اشاعتوں میں شائع ہوا تھا۔ لیکن تفصیل میں جولائی کا نام شامل نہیں ہے۔

(2) شطرنج ـــــ فہرست میں 54واں نمبر ـــــ پورا نام ''شطرنج کی بازی''۔ اشاعت دسمبر 1924ء درست ہے (ہندی میں یہ کہانی شطرنج کے کھلاڑی کے نام سے مادھوری: اکتوبر 1924ء میں شائع ہوئی تھی)

وہ کہانیاں جو زمانہ میں شائع ہوئیں لیکن فہرست میں ان کا نام نہیں دیا گیا۔

(1) گناہ کا اگن کنڈ: اس افسانہ پر بطور مصنف ''فسانہ کہن'' کا نام دیا گیا تھا۔ اشاعت: مارچ 1910ء (یہ افسانہ پریم چند کے اردو اور ہندی کے مجموں میں موجود ہے)

(2) منادن:۔۔۔ جولائی 1912ء

(3) شامت اعمال:۔۔۔ ستمبر 1914ء

(4) اپنے فن کا استاد:۔۔۔ ستمبر 1916ء

(5) حج اکبر:۔۔۔ دسمبر 1917ء

(6) کپتان:۔۔۔ دسمبر 1917 (زمانہ میں درد اور دوا کے نام سے شائع ہوا۔ خاک پروانہ (مجموعہ) میں کپتان کے نام سے)

(7) شب تار:۔۔۔ ستمبر 1919ء۔۔۔ یہ بیلجیم کے مشہور ادیب مارٹرلنک کے ڈرامے کا ترجمہ ہے۔

(8) شکار:۔۔۔ جون 1919ء

(9) انتقام:۔۔۔ اکتوبر 1923ء

(10) نیچ ذات کی لڑائی:۔۔۔ دسمبر 1925ء

(11) کرکٹ میچ:۔۔۔ جولائی 1937ء (پریم چند کی رحلت کے نو ماہ بعد)

ضمیمہ نمبر چار

پریم چند کی تصانیف

ان دو صفحوں پر زمانہ کے ادارے نے پریم چند کی تصانیف کی تفصیل پیش کی ہے جو کہ تحقیقی اعتبار سے انتہائی ناقص اور گمراہ کن ہے۔ اس خامی کا اعتراف خود ایڈیٹر نے درج ذیل الفاظ میں کیا ہے:۔

''منشی پریم چند کی اردو ہندی تصانیف کی مکمل فہرست درج ذیل ہے۔ اس فہرست کو حتی الوسع مکمل بنانے کی کوشش کی گئی ہے، تاہم ممکن ہے کہ بعض باتیں درج ہونے سے رہ گئی ہوں۔ ہم کو افسوس ہے کہ مرحوم کے وارثان سے بھی ان کی تصانیف کی کوئی مستند فہرست دستیاب نہ ہو سکی۔ اس لیے یہ بھی ممکن ہے کہ بعض چیزیں بالکل ہی نظر انداز ہو گئی ہوں۔''

میں نے پوری پوری کوشش کی ہے کہ ان تفصیلات میں مناسب ترمیمات کر کے انھیں تحقیقی اعتبار سے قابلِ قبول بنایا جائے۔ دیگر ادارہ زمانہ نے تصانیف کی فہرست پیش کرتے وقت تصانیف کی اشاعت کے وقت کی تقدیم و تاخیر کا خیال نہیں رکھا۔ میں نے بھی اس فہرست کی نمبرنگ (NUMBRING) ویسے کی ویسے ہی رہنے دی تا کہ کسی قسم کی بے ترتیبی پیدا نہ ہو۔ تصانیف کے زمانۂ اشاعت کی تفصیل سے قاری خود بہ خود تقدیم و تاخیر کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

اردو تصانیف

(مختصر افسانے)

(1) سوزِ وطن:۔'' پانچ مختصر افسانوں کا مجموعہ جو 1907ء میں نواب رائے کے نام سے زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا۔''

تصحیح:۔۔۔۔ یہ مجموعہ جون/ جولائی 1908ء میں شائع ہوا تھا۔۔۔۔

(2) خاک پروانہ:۔۔۔ ''سات افسانوں کا مجموعہ''

تصحیح:۔۔۔ پریم چند نے اپنے اخراجات سے نگار پریس لکھنؤ سے 1928ء میں شائع کرایا تھا۔ یہ سات نہیں بلکہ سولہ افسانوں کا مجموعہ تھا۔ اکتوبر، نومبر 1928ء کے زمانہ میں اس کا اشتہار شائع ہوا اور فروری 1929ء کے زمانہ میں اس پر تبصرہ شائع ہوا۔

(3) پریم پچیسی (2۔جلد) ''پچیس کہانیوں کا مجموعہ دارالاشاعت پنجاب لاہور نے شائع کیا۔''

تصحیح:۔۔۔ (الف) اس کی پہلی جلد زمانہ پریس سے اکتوبر 1914ء میں شائع ہوئی اور نومبر 1914ء کے زمانہ میں منشی جگت موہن رواں کا تبصرہ شائع ہوا۔ (پریم چند وشوکوش۔ جلد نمبر 2 ص 251) لیکن اس زمانے میں نگم صاحب کے نام پریم چند کے خطوط پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب 1915ء کے پہلے تین ماہ کے دوران شائع ہوئی تھی۔ نومبر 1914ء والا تبصرہ پیشگی تبصرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں بارہ کہانیاں شامل تھیں۔ (مانک ٹالا)

(ب) اس کی دوسری جلد مارچ 1918ء میں شائع ہوئی تھی۔ زمانہ پریس ہی سے اس میں تیرہ کہانیاں ہیں۔

(4) پریم بتیسی (2 جلد) ''بتیس قصوں کا مجموعہ جس کا پہلا ایڈیشن زمانہ پریس کانپور سے اور دوسرا ایڈیشن دارالاشاعت پنجاب لاہور سے شائع ہوا۔''

تصحیح:۔۔۔ (الف) سولہ کہانیوں کی پہلی جلد زمانہ پریس سے اواخر 1920ء میں شائع ہوئی تھی۔

(ب) باقی سولہ کہانیوں کی دوسری جلد دارالاشاعت پنجاب، لاہور سے پہلی جلد سے پہلے ہی اگست 1920ء ہی میں شائع ہوگئی تھی۔

(5) پریم چالیسا (2 جلد) (صحیح نام: پریم چالیسی) ''چالیس کہانیوں کا مجموعہ جو لاہور سے شائع ہوا۔''

تصحیح:۔۔۔ بیس بیس کہانیوں کی دو جلدیں 1930ء میں گیلانی الیکٹرک پریس' بک ڈپو لاہور سے شائع ہوئیں۔

(6) فردوس خیال۔'' گیارہ افسانوں کا مجموعہ جو 1929ء میں انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوا۔''

اس میں دی گئی تفصیلات درست ہیں

(7) زادراہ — ''بارہ افسانوں کا مجموعہ جو 1936ء میں حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی سے شائع ہوا۔

تصحیح: — باقی تفصیلات درست ہیں لیکن ڈاکٹر گوئنکا کے مطابق اس میں پندرہ کہانیاں تھیں (ایضاً ص 161)

(8) دودھ کی قیمت: — ''نو افسانوں کا مجموعہ ہے جسے 1937ء میں عصمت بکڈپو دہلی نے شائع کیا۔''

اس میں دی گئی تفصیلات درست ہیں

(9) واردات: — ''تیرہ افسانوں کا مجموعہ جامعہ ملیہ دہلی سے 1937ء میں شائع ہوا۔''

— اس میں دی گئی تفصیلات درست ہیں — (لیکن ڈاکٹر گوئنکا اس کا سنہ اشاعت 1938ء (فروری) تحریر فرماتے ہیں۔ ایضاً ص 368) نگم صاحب ستمبر 1937ء کے ''زمانہ'' میں صفحہ 203 پر علمی خبریں اور نوٹ کے عنوان کے تحت تحریر فرماتے ہیں ''اس اثنا میں منشی پریم چند کے تیرہ چھوٹے افسانوں کا ایک مجموعہ 'واردات' کے نام سے جامعہ ملیہ پریس سے شائع ہوا ہے۔'' — اکتوبر 1937ء کے زمانہ میں اس کا ایک اشتہار بھی شائع ہوا ہے۔ یہ مجموعہ پریم چند کی رحلت کے بعد شائع ہوا تھا۔ لیکن اس کا نام خود پریم چند کا تجویز کردہ ہے بلکہ ترتیب و تدوین بھی پریم چند ہی نے کی ہوگی کیوں کہ اس میں شامل تیرہ کہانیوں میں سے صرف تین کہانیاں ہی اردو رسائل میں شائع ہوئی تھیں۔ تین کہانیوں کا ماخذ معلوم نہیں اور باقی سبھی کہانیاں ہندی کے رسائل میں شائع ہوئی تھیں۔

مندرجہ ذیل دو افسانوی مجموعوں کا ''زمانہ'' نے ذکر نہیں کیا

(10) خواب وخیال: — زمانہ میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ یہ 1928ء میں لاجپت رائے اینڈ سنس، لاہور کی طرف سے شائع کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر گوئنکا کے مطابق ''زمانہ'' مئی 1928ء (ص 441) پر سولہ کہانیوں کے اس مجموعہ کے شائع ہونے کی اطلاع دی گئی ہے۔ لیکن اب اس مجموعے میں صرف چودہ کہانیاں ہی موجود ہیں۔ (ایضاً ص 118)

(11) آخری تحفہ: — ''زمانہ'' میں اس کا بھی ذکر نہیں ہے۔ یہ کتاب نرائن داس سہگل اینڈ سنس، لاہور سے مارچ 1934ء میں شائع ہوئی۔ اس میں تیرہ کہانیاں ہیں۔ (ایضاً ص 44)

اردو ناول

(1) کشنا "1907ء میں ہندوستانی پریس لکھنؤ میں طبع ہوا۔ اور بابو مہاویر پرشاد
(2) ہم خرما و ہم ثواب "ورما بک سیلرس امین آباد لکھنؤ نے شائع کیا۔"

تصحیح:۔۔۔ درج بالا اطلاع درست نہیں ہے۔

(1) کشنا:۔ میڈیکل ہال پریس بنارس کی طرف سے شائع ہوا۔ پہلی اشاعت: دسمبر 1906ء۔ زمانہ میں اس کا پہلا اشتہار اگست 1907ء میں شائع ہوا۔ اور تبصرہ اکتوبر، نومبر 1907ء میں (ایضاً ص 102)

(نوٹ: اب یہ بالکل دستیاب نہیں ہے۔)

(2) ہم خرما و ہم ثواب:۔ نول کشور پریس لکھنؤ سے 1906ء (جنوری سے جولائی کے دوران کسی بھی ماہ) میں شائع ہوا۔ زمانہ ستمبر 1906ء میں اس کا پہلا اشتہار چھپا۔

(3) جلوۂ ایثار:۔۔۔ اس کی تفصیل درست ہے۔

(4) روٹھی رانی:۔۔۔ "راجپوتانہ کے ایک تاریخی قصہ کا اردو ترجمہ جو 1907ء میں نواب رائے کے نام سے زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا۔"

تصحیح:۔۔۔ یہ ناولٹ "زمانہ" کے دو شماروں، اپریل، مئی 1907 اور اگست 1907ء میں شائع ہوا۔ یہ ناولٹ اصلاً ہندی میں لکھا گیا تھا۔ اس کے مصنف تھے، راجپوتانہ کے مشہور مورخ منشی دیبی پرشاد۔ کتابی صورت میں یہ زمانہ پریس سے 1919ء کے لگ بھگ شائع ہوا۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے میری کتاب: "پریم چند، حیات نو" اشاعت 1993ء ناشر ماڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ نئی دہلی۔2)

(5) بازارِ حسن (2 جلد)۔۔۔ "اس ناول کا فلم بھی بن چکا ہے۔ یہ ناول سیوا سدن کا اردو ترجمہ ہے۔"

تصحیح:۔۔۔ یہ ناول اصلاً اردو میں لکھا گیا تھا۔ لیکن پہلے ہندی میں "سیوا سدن کے نام سے ایک ہی جلد میں ہندی پستک ایجنسی، کلکتہ کی طرف سے دسمبر 1918ء میں شائع ہوا (ڈاکٹر گوئنکا۔ ص 429)

پریم چند نے نظر ثانی کے بعد دوبارہ اردو مسودہ تیار کر کے اسے دارالاشاعت پنجاب، لاہور سے دو

جلدوں میں، ڈاکٹر گوئنکا اور ڈاکٹر جعفر رضا کی تحقیق کے مطابق 1921ء میں شائع ہوا تھا کیونکہ کتاب کے دونوں حصوں پر اشاعت کا سنہ 1921ء طبع ہوا تھا۔ لیکن امتیاز علی تاج کے نام پریم چند کی خط وکتاب کی بنا پر میں نے اس کے دونوں حصوں کی اشاعت (بعد از فروری) 1922ء طے کی ہے (تفصیل۔ میری متذکرہ بالا کتاب: ص200 سے ص206 تک)

(6) گوشۂ عافیت:۔۔۔(2 جلد)۔۔۔ ''دارالاشاعت پنجاب، لاہور سے شائع ہوا۔

تصحیح:۔۔۔یہ ناول کافی طویل تھا۔ لگ بھگ سو اسات سو صفحوں کو محیط تھا۔ اصلاً اردو میں لکھا گیا تھا۔ لیکن ہندی میں ''پریم آشرم'' کے نام سے یہ 1922ء میں شائع ہو گیا تھا۔ اردو میں اس کی اشاعت دارالاشاعت پنجاب، لاہور سے 1929ء کے لگ بھگ ہی ممکن ہو سکی۔ حالانکہ یہ ناول چوگانِ ہستی سے پہلے لکھا گیا تھا۔

(7) چوگانِ ہستی (دو جلد) ''1927ء میں دارالاشاعت پنجاب، لاہور سے شائع ہوئی۔''

۔۔۔ یہ ناول بھی اصلاً اردو میں لکھا گیا تھا لیکن پچھلے دو ناولوں کی طرح پہلے ہندی میں ''رنگ بھومی'' کے نام سے وسط فروری 1925ء میں دو جلدوں میں شائع ہو گیا تھا۔ پھر ترمیم و تنسیخ کے مراحل سے گزر کر ستمبر، اکتوبر 1928ء میں اردو میں دارالاشاعت پنجاب کی طرف سے شائع ہوا۔ یہ ناول سب سے زیادہ طویل تھا۔

(بقیہ) اردو ناول

(8) پردۂ مجاز (دو جلد) ''لاجپت رائے اینڈ سنس لاہور نے شائع کیا۔''

تصحیح:۔۔۔ پریم چند کا یہ پہلا ناول ہے جو اصلاً ہندی میں لکھا گیا اور ''کایا کلپ'' کے نام سے بھارگو پستکالیہ، بنارس کی طرف سے بکری سمت 1983 (1926ء) کو شائع ہوا۔ اردو ناول کے بارے میں ''زمانہ'' کے ادارہ کی یہ اطلاع درست ہے لیکن اشاعت کے بارے میں کچھ بھی رقم نہیں ہے۔ اس کی پہلی اشاعت اواخر 1931ء یا اوائل 1932ء میں ہوئی۔ ہندی میں ایک ہی جلد میں شائع ہوا تھا۔ تاہم اردو میں دو جلدوں میں شائع ہوا۔

(9) نرملا:۔۔۔ ''یہ ناول لاہور سے شائع ہوا۔''

تصحیح:۔۔۔ یہ ناول اردو اور ہندی دونوں میں اسی نام سے شائع ہوا۔ ہندی میں چاند کاریالیہ، الہ آباد کی طرف سے جنوری 1927ء میں شائع ہوا۔ اس کا اردو ترجمہ گیلانی الیکٹرک

پریس بکڈ پو، لاہور سے 1929ء میں شائع ہوا۔

(10) غبن :—— ''یہ ناول بھی اسی نام سے ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوا۔ ہندی میں سرسوتی پریس، بنارس (جو کہ پریم چند کا اپنا پریس تھا) کی طرف سے فروری/ مارچ 1931ء میں شائع ہوا۔ لیکن اردو میں یہ دو حصوں میں لاجپت رائے اینڈ سنس، لاہور کی طرف سے (شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ) 1933ء میں شائع ہوا تھا۔

(11) روحانی شادی: (ڈرامہ) ''عصمت بکڈ پو دہلی نے شائع کیا۔

تصحیح :—— ڈرامے کو ناولوں کے ساتھ نتھی کر دیا ہے۔ بہر حال اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ متذکرہ بالا ادارے سے ستمبر 1926ء میں شائع ہوا۔

اہم نوٹ :—— ''زمانہ'' میں ''روحانی شادی'' ڈرامے کا تو ذکر ہے لیکن ایک بہت ہی اہم ڈراما۔ کربلا کا ذکر نہیں ہے۔ یہ بہت اہم ڈرامہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ہندی میں پہلے شائع ہوا تھا۔ لیکن ہندی کی اشاعت کے بعد یہ پہلے ''زمانہ'' میں جولائی 1926ء سے اپریل 1928ء تک قسط وار شائع ہوا۔ اس کے بعد کتابی صورت میں لاجپت رائے اینڈ سنس، لاہور کی طرف سے شائع ہوا۔ لیکن اس کا سنہ اشاعت کتاب پر درج نہیں ہے۔ سبھی ماہرین پریم چندیات اس کی پہلی اشاعت کے بارے میں خاموش ہیں۔

<u>وہ ناول جو اس لسٹ میں درج ہونے سے رہ گئے</u>

(الف) میدان عمل :—— ہندی میں یہ کرم بھوی، کے نام سے سرسوتی پریس، بنارس کی طرف سے اگست اور نومبر 1932ء کے دوران شائع ہو گیا تھا۔ اردو میں اس کی اشاعت کا سنہ مختلف محققین 1934ء بتاتے ہیں لیکن پریم چند کے خطوط پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب مکتبہ جامعہ، دہلی کی طرف سے 1935ء کے اواخر یا 1936ء کی ابتدا میں شائع ہوئی تھی۔

(ب) گئودان :—— پریم چند کی حیات میں یہ ناول صرف ہندی میں ''گئودان'' کے نام سے جون 1936ء میں سرسوتی پریس، بنارس کی طرف سے شائع ہو گیا تھا۔ لیکن اردو میں پریم چند کی رحلت کے بعد 1939ء میں مکتبہ جامعہ کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ (نوٹ :۔ ہندی میں یہ ایک ساتھ ہندی گرنتھ رتنا کر کاریالیہ، بمبئی کی طرف سے بھی شائع ہوا تھا۔ اور اس کی پہلی اشاعت تین ہزار جلدوں کی تھی)

متفرق

(1) باکمالوں کے درشن:— ''زمانہ میں شائع شدہ سوانحی مضامین کا مجموعہ جسے لالہ رام نرائن لال بک سیلر الہ آباد نے شائع کیا۔''

تصحیح:— اس کتاب کے دو ایڈیشن شائع ہوئے۔ پہلا ایڈیشن 1929ء میں شائع ہوا جس میں گیارہ سوانحی مضامین تھے۔ لیکن دوسرے ایڈیشن میں درج ذیل سات مضامین شامل نہیں ہیں۔ (1) بہاری (2) کیشو (3) رانا جنگ بہادر (4) رینالڈس (5) ٹامس کینس برو (6) رام کرشن بھنڈارکر (7) آنریبل گوپال کرشن گوکھلے۔ ان کی جگہ دوسرے ایڈیشن میں پانچ نئے مضامین ڈال دیئے گئے۔ (1) اکبر (2) مولانا وحیدالدین سلیم (3) بدرالدین طیب جی (4) سرسید احمد خاں اور (5) مولوی عبدالحلیم شرر دوسرا ایڈیشن بھی 1932ء میں اسی پبلشر ہی کی طرف سے شائع ہوا تھا۔

(2) رام چرچا (رامائن کتھا):— 'لاجپت رائے اینڈ سنس نے لاہور سے شائع کیا۔''

تصحیح:— یہ کتاب ڈاکٹر گوئنکا (صفحہ 342) کے مطابق 1928ء میں درج بالا پبلشر کی طرف سے شائع ہوئی لیکن اگلے ہی صفحے پر اس ایڈیشن کے پہلے صفحے کا جو عکس دیا گیا ہے اس میں سنہ اشاعت 1929ء چھپا ہوا ہے۔

ہندی افسانوں کے مجموعے

(1) پریم دوادشی:— ''بارہ افسانوں کا مجموعہ سرسوتی پریس، بنارس سے شائع ہوا۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔''

تصحیح — یہ کتاب دراصل گنگا پستک مالا کاریالیہ، لکھنؤ سے پہلی مرتبہ بکرمی سمت 1983ء (1926ء) میں شائع ہوئی تھی۔

(2) پریم پرتما:— ''یہ مجموعہ 1926ء میں بنارس پریس سے شائع ہوا۔''

تصحیح:— یہ کتاب دراصل شری بھارگو پستکالیہ، گائے گھاٹ، بنارس سے بکرمی سمت 1983 (1926ء) میں شائع ہوئی تھی۔

(3) پریم تیرتھ:— اس میں تین چار جگہ ڈیش ('') دے کر سنہ اشاعت 1926ء بتایا گیا ہے۔ یہاں ڈیش سے مراد ہے درج بالا پریس—

تصحیح:— یہ مجموعہ سرسوتی پریس، بنارس سے 1928ء میں شائع ہوا (گوئنکا ص 250)

اس صفحے پر جو عکس دیا گیا ہے اس میں بھی یہی سنہ درج ہے۔

(4) پریرنا :1932 ،سرسوتی پریس۔

تصحیح:۔۔۔اشاعت کا سنہ اور پریس کا نام درست ہے لیکن صحیح نام تھا "پریرناتمک کہانیاں۔"

(5) پانچ پھول:۔۔۔1935ء۔۔۔سرسوتی پریس۔۔۔

تصحیح:۔۔۔پریس کا نام صحیح ہے لیکن ڈاکٹر گوئنکا اس کی اشاعت 1929ء بتاتے ہیں (ایضاً ص 231)

(6) مانسرودر (دوجلد) "1936ء میں پچاس کہانیوں کا مجموعہ سرسوتی پریس، بنارس سے شائع ہوا۔"

تصحیح:۔۔۔درج بالا سنۂ اشاعت اور پریس کی اطلاع درست ہے لیکن جلد نمبر ایک میں ستائیس کہانیاں اور جلد نمبر دو میں چھبیس کہانیاں (کل ترپن) کہانیاں شامل ہیں۔ پریم چند کی رحلت کے بعد پریم چند کے بیٹے امرت رائے نے اس نام کی چھے جلدیں اور شائع کیں جن میں کل ایک سو پچاس کہانیاں شامل ہیں۔ یہ ایک طرح کی پریم چند کی ہندی کہانیوں کی کلیات کہی جا سکتی ہے۔ پہلی دو جلدوں کی کہانیوں کے ساتھ ان کی تعداد دو سو تین ہو جاتی ہے۔ اور اگر گپت دھن (دو جلدوں کی 26+30) چھپن کہانیوں کو بھی شامل کرلیا جائے تو ان کہانیوں کی کل تعداد 259 رہو جاتی ہے۔ تاہم پریم چند نے اپنی زندگی میں تین سو سے بھی اوپر کہانیاں لکھی تھیں۔

(بقیہ۔۔۔ہندی افسانوں کے مجموعے)

(7) کفن اور دوسرے افسانے "1936 میں سرسوتی پریس سے شائع ہوا۔"

تصحیح:۔۔۔(الف) کفن (کہانی سنگرہ) پرکاشت امرت رائے، ہنس پرکاشن، الہ آباد۔ پہلی اشاعت نامعلوم۔۔۔۔

(ب) کفن اور شیش رچنائیں، سنکلن، شری پت رائے۔ پرکاشت، سرسوتی پریس، بنارس۔

پہلی اشاعت 1937 (الف اور ب۔۔۔ایضاً۔۔۔ص 78)

(8) سپت سروج۔۔۔ "36ء سرسوتی پریس۔"

تصحیح:۔۔۔ہندی پستک ایجنسی کلکتہ، جون 1917ء۔(ایضاً ص407)
(نوٹ:۔اگلے صفحے پر ٹائٹل کا جو عکس دیا گیا ہے اس پر بکری سمت 1975 درج ہے۔
اس حساب سے اشاعت 1918ء کی ہوئی)
(9) پریم پچیسی:"36ء سرسوتی پریس۔"
تصحیح:۔۔۔ ہندی پستک ایجنسی کلکتہ۔ پہلی اشاعت بکری سمت 1980 (1923ء)
(ایضاً ص253)
(10) پریم پورنما:۔۔۔"36ء سرسوتی پریس۔"
تصحیح:۔۔۔ہندی پستک ایجنسی کلکتہ۔ پہلی اشاعت 1918ء (ایضاً ص253)
(11) نوندھی:۔۔۔"36ء سرسوتی پریس۔"
تصحیح:۔۔۔ہندی گرنتھ رتنا کر کاریالیہ۔ بمبئی دسمبر 1917ء (ایضاً ص213)
(12) پریم پرسون:۔۔۔"36ء سرسوتی پریس۔"
تصحیح:۔۔۔ گنگا پستک مالا کاریالیہ۔ لکھنؤ پہلی اشاعت: جولائی 1924ء (ایضاً ص254)
(13) اگنی سمادھ:۔۔۔"36ء سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوا۔"
تصحیح: ۔۔۔ (الف) صحیح نام:۔ "اگنی سمادھی تتھا انیہ کہانیاں ۔" (ب) اشاعت:۔1929ء
(ج) ناشر: نول کشور پریس لکھنؤ۔ (ایضاً ص28)
(14) سمر جاترا:۔۔۔"36ء میں بنارس سے شائع ہوا۔"
تصحیح:۔۔۔(الف) صحیح نام: سمر یاترا۔ (صرف ایک کہانی) ناشر شدھ کھادی بھنڈار، کلکتہ، پہلی اشاعت 1930ء
(ب) سمر یاترا تتھا انیہ کہانیاں، بارہ کہانیوں کا مجموعہ سرسوتی پریس، بنارس پہلی اشاعت۔1932ء

<u>وہ افسانوی مجموعے جن کا اس لسٹ میں ذکر نہیں ہے</u>

(1) پریم پرتما:۔ بھارگو پستکالیہ، گائے گھاٹ، بنارس پہلی اشاعت بکری سمت 1983 (1926ء)
(ایضاً ص253)

(2) پریم پرسودھ:۔ چاند کار یالیہ، الہ آباد، پہلی اشاعت 1926ء (ایضاً ص 254)

(3) پریم تیرتھ:۔ سرسوتی پریس، بنارس، پہلی اشاعت 1928ء (ایضاً ص 250)

(4) پریم چترتھی:۔ ناشر: ہندی پستک ایجنسی کلکتہ، پہلی اشاعت بکرمی سمت 1985 (1928ء)
(ایضاً ص 249)

(5) پریم پرتگیا:۔ ناشر: سرسوتی پریس، بنارس۔ پہلی اشاعت 1929ء (ایضاً ص 253)

(6) سپت سمن:۔ ناشر: سرسوتی پریس، بنارس۔ پہلی اشاعت 1930ء (ایضاً ص 407)

(7) پریم چند کی سروشریشٹھ کہانیاں: ناشر: وشوساہتیہ گرنتھ مالا، لاہور، پہلی اشاعت 1934ء
(ایضاً ص 248)

(8) نوجیون:۔ گوپال پبلشنگ ہاؤس، بانکی پور (پٹنہ) پہلی اشاعت 1935ء (ایضاً ص 213)

(9) پریم پی یُش:۔ ناشر: سٹینڈرڈ پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد۔ پہلی اشاعت 1935ء (ایضاً ص) 253

(10) پریم گنجی:۔ ناشر: گنگا پستک مالا کاریالیہ لکھنؤ۔ پہلی اشاعت بکرمی سمت 1987 (1930ء)
(ایضاً ص 251)

ہندی ناول

(1) سیواسدن: ''بازارِحسن کا ہندی ترجمہ۔''
تصحیح:— پہلی اشاعت: دسمبر 1919ء۔ ناشر: ہندی پستک ایجنسی، کلکتہ (ایضاً
ص 429)

(2) پریم آشرم: (اس پر dots یعنی '' ''' ''ڈال دیئے گئے ہیں جو کہ غلط ہے)
تصحیح:— پہلی اشاعت: جنوری 1922ء۔ ناشر: ہندی پستک ایجنسی، کلکتہ (ایضاً
ص 257)

(3) بردان: (صحیح نام وردان ہے) اس پر بھی dots ڈال دیئے گئے ہیں—
تصحیح:— پہلی اشاعت: بکرمی سمت 1977 (1920ء) ناشر: گرنتھ بھنڈار۔ بمبئی
(ایضاً ص 364)

(4) پرتگیا: ''بیوہ کا ہندی ترجمہ ہے جو پہلے پریما کے نام سے شائع ہوا تھا۔''
تصحیح پریما (ہندی) ہم خرما و ہم ثواب کا ترجمہ تھا۔ پریم چند نے اس کے کردار وہی رہنے دیے لیکن اصل ناول میں کافی تبدیلیاں کردیں حتیٰ کہ کلائمکس بھی بدل دیا گیا۔ اور اس کا نام

پرتکیا رکھا۔ یہ پہلے ''چاند'' الہ آباد میں جنوری 1927ء سے نومبر 1927ء تک قسط وار شائع ہوا۔ 1929ء میں کتابی شکل میں پہلی مرتبہ سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوا۔ (ایضاً ص239)

(5) رنگ بھومی (دو جلد)۔۔۔اس پر کوئی تفصیل نہیں دی گئی۔۔۔

تصحیح:۔۔۔یہ اصلاً اردو میں چوگانِ ہستی کے نام سے لکھا گیا تھا۔ پریم چند ساتھ ساتھ اس کا ہندی کرن بھی کرتے گئے۔ ناشر: گنگا پستک مالا کاریالیہ۔ لکھنؤ۔ پہلی اشاعت: فروری/ مارچ 1925ء

(6) غبن: اس کے بارے میں بھی کوئی تفصیل نہیں دی گئی۔۔۔

تصحیح:۔۔۔ناشر: سرسوتی پریس۔ پہلی اشاعت: 1931ء۔ اس کا اردو ترجمہ خود پریم چند نے اسی نام سے کیا۔

(7) کرم بھومی:۔''میدان عمل کا ہندی ترجمہ ہے۔''

تصحیح:۔۔۔ناشر: سرسوتی پریس۔ پہلی اشاعت: نومبر 1932ء

(8) نرملا۔۔۔اس کے بارے میں بھی کوئی تفصیل نہیں دی گئی۔۔۔

تصحیح:۔۔۔ماہنامہ 'چاند' میں نومبر 1925ء سے نومبر 1926ء تک قسط وار شائع ہونے کے بعد چاند کاریالیہ، الہ آباد ہی سے جنوری 1927ء میں شائع ہوا۔ (ایضاً ص218)

(9) گئودان:''سرسوتی پریس بنارس سے 1930ء میں شائع ہوا۔۔۔

تصحیح:۔۔۔(الف) ہندی میں اس کا نام گودان ہے۔

(ب) پہلی اشاعت: 10/جون 1936ء.

(ج) ناشر: سرسوتی پریس، بنارس، اور رتنا کر کاریالیہ، بمبئی دونوں جگہوں سے ایک ساتھ شائع ہوا

(د) پہلی اشاعت کی تعداد تین ہزار جلد تھی۔ (ایضاً ص132)

(10) کایا کلپ:۔اس پر بھی کوئی تفصیل نہیں دی گئی۔۔۔

تصحیح:۔۔۔پہلی اشاعت بکرمی سمت 1983 (1926ء)۔ ناشر: بھار گو پستکالیہ، بنارس

(11) منگل سوتر:۔(نامکمل ناول جو سرسوتی پریس سے شائع ہوا)

۔۔۔یہ ناول پریم چند نے بستر مرگ پر لکھنا شروع کیا تھا مگر نامکمل رہ گیا۔ پریم چند کی رحلت کے کافی عرصہ بعد ''ہنس'' میں شائع ہوا۔ پھر شری پت رائے نے اسے ''منگل سوتر وانیہ

رچنائیں'' میں فروری 1948ء میں شائع کیا۔(ایضاً ص92-291)

(پریم چند کا پہلا ناول جو اس لسٹ میں شامل نہیں ہے)

(الف) دیوستھان رہسیہ:۔ پریم چند کا پہلا اردو ناول (جو کتابی صورت میں شائع نہیں ہوا تھا) اسرار معابد، اردو ہفت روزہ ''آوازۂ خلق'' میں 8/اکتوبر 1903ء سے کیم فروری 1905ء تک دھنپت رائے عرف نواب رائے الہ آبادی کے نام سے شائع ہوتا رہا۔ درمیان میں اس کی ایک قسط دستیاب نہیں ہو سکی۔ امرت رائے نے اس کا ہندی ترجمہ کر کے اسے اسرار معابد عرف دیوستھان رہسیہ'' کے نام سے ''منگلا چرن'' نامی کتاب میں شامل کیا۔ (ایضاً ص40)

ہندی ڈرامے

(1) کربلا— ''زمانہ میں شائع ڈرامے کا ہندی ترجمہ سرسوتی پریس نے شائع کیا۔''

تصحیح:—یہ اطلاع گمراہ کن ہے۔ یہ ڈرامہ پہلے ہندی میں گنگا پستک کاریالیہ کی طرف سے نومبر 1924ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ بعد میں زمانہ میں جولائی 1926ء سے اپریل 1926ء تک قسط وار شائع ہونے کے بعد کتابی صورت میں لاجپت رائے اینڈ سنس کی طرف سے شائع ہوا (پہلی اشاعت نامعلوم)

(2) سنگرام— کوئی تفصیل نہیں دی گئی—

تصحیح:— پہلی اشاعت: فروری 1923ء۔ ناشر: ہندی پستک ایجنسی، کلکتہ (ایضاً ص399) اردو میں یہ ڈرامہ ''کلیات پریم چند'' جلد 16 مرتبہ مدن گوپال۔ ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (جولائی۔ستمبر 2001) میں اردو رسم خط میں شائع ہو گیا ہے۔

(3) پریم کی ویدی:— کوئی تفصیل نہیں دی گئی۔

تصحیح:— یہ اردو ڈرامہ ''روحانی شادی'' کا ہندی ترجمہ ہے۔ پہلی اشاعت: 1933ء۔ ناشر: سرسوتی پریس، بنارس۔

بچوں کے لیے ہندی کتابیں

(1) کتے کی کہانی ''یہ سب کتابیں سرسوتی پریس سے شائع ہوئیں۔'' (زمانہ)

(2) جنگل کی کہانیاں

(3) رام چرچا (رامائن کی کہانیاں) (نوٹ: از مانک ٹلا— ناشر کے بارے میں دی گئی اطلاع

درست ہے۔ سنہ اشاعت کے بارے میں تفصیلات ذیل میں دے رہا ہوں، جو کہ پریم چند وشوکوش جلد 2 سے حاصل کی ہیں۔

(4) من مودک
(5) شیخ سعدی
(6) درگا داس۔

(1) پہلی اشاعت جولائی 1933ء (ایضاً ص 105)
(2) پہلی اشاعت اندازاً 1936ء۔
جنگل کی زندگی کی بارہ کہانیاں (ایضاً ص 154)
(3) پہلی اشاعت کی اطلاع مہیا نہیں ہے۔ دوسری اشاعت 1938ء۔ سرسوتی پریس (ایضاً ص 343)
(4) اس کی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی۔
(5) اس کی بھی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی۔
(6) پریم چند وشوکوش جلد 2 کے صفحہ 195 پر کتاب کا جو عکس دیا گیا ہے اس میں صاف صاف چھپا ہے: پہلا سنسکرن 1938ء

ہندی ترجمے وتالیفات

(۱) آزاد کتھا۔ "فسانۂ آزاد مصنفہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا خلاصہ سرسوتی پریس نے شائع کیا۔"
تصحیح:— یہ خلاصہ دو قسطوں میں گنگا پستک مالا کاریالیہ لکھنؤ نے بکرمی سمت 1982 (1225ء) میں شائع کیا۔
(2) چاندی کی ڈبیا۔ " گالزوردی کے انگریزی ڈراموں کے ترجمے جو ہندستانی اکیڈمی کی فرمائش سے کیے گئے تھے اور جنھیں اکیڈمی نے شائع کیا۔"
(3) ہڑتال
(4) نیائے۔ یہ تفصیل نامکمل ہے۔ مکمل تفصیل ممکنہ حد تک پیش خدمت ہے۔
(2) The silver Box کا ہندی ترجمہ: ناشر ہندستانی اکیڈمی الہ آباد۔ پہلی اشاعت 1930ء

(3) گالزوردی کے ڈرامے (Strife) کا ترجمہ ۔ ہندستانی اکیڈمی، الہ آباد نے 1930ء میں شائع کیا۔

(4) گالزوردی کے ڈرامے (Justice) کا ترجمہ ناشر: ہندستانی اکیڈمی۔ پہلی اشاعت 1930ء

(نوٹ:۔ یہ تینوں ڈرامے ''کلیات پریم چند'' جلد نمبر 16 میں اردو رسم خط میں شائع ہو گئے ہیں)

(بقیہ) ہندی ترجمے وتالیفات

(5) اہنکار:۔ ''اناطول فرانس کے ڈارمہ کا ہندی ترجمہ۔''

تصحیح:۔ فرانس کے مشہور مصنف اناطول فرانس کے ڈرامہ تھائس (Thias) کا ترجمہ کلکتہ پستک بھنڈار، کلکتہ نے ساون بکری سمت 1980 (1923ء) میں شائع کیا۔

(6) سکھ داس ''مطبوعہ سرسوتی پریس، بنارس۔''

(7) ٹالسٹائی کی کہانیاں درج بالا تفصیلات غلط ہیں

(8) پتا کے پتر پتری کے نام صحیح تفصیلات درج ذیل ہیں۔ (مانک ٹالا)

(9) سرشٹھی کا آرمبھ (تخلیق کائنات)

(6) جارج ایلیٹ کے ڈارمہ کا ترجمہ۔ ناشر: ہندی گرنتھ رتنا کر کاریالیہ، بمبئی۔ پہلی اشاعت: اگست 1920ء

(7) ٹالسٹائی کی کہانیاں:۔ ناشر: ہندی پستک ایجنسی کلکتہ۔ پہلی مرتبہ بکری سمت 1980 (1923ء)

(8) پتا کے پتر پتری کے نام:۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے اپنی بیٹی اندرا گاندھی کے نام لکھے گئے خطوط کا ہندی ترجمہ۔ مطبوعہ: الہ آباد لا جرنل (Law Journal) پریس، الہ آباد۔ پہلی اشاعت 1931ء (ایضاً ص 234)

(9) سرشٹھی کا آرمبھ:۔ برنارڈ شا کے ڈرامے (in the beginning) کا ترجمہ 1938ء میں پہلی اشاعت (ایضاً: ص 428)

(10) گلپ سموچیہ:۔ ''مطبوعہ سرسوتی پریس بنارس۔''

تصحیح:۔ (الف) پریم چند کی چار کہانیوں کے علاوہ مختلف ہم عصر کہانی کاروں کی

کہانیوں کا مجموعہ۔ ناشر اور پہلی اشاعت نامعلوم (ایضاً: ص 122)

(11) گلپ رتن:۔ مرتب پریم چند۔ اس میں پریم چند کی چار کہانیوں کے علاوہ دیگر ہندی مصنفوں کی بہترین کہانیاں شامل ہیں۔ مطبوعہ: سرسوتی پریس، بنارس۔ پہلی اشاعت 1929ء (ص 122)

نوٹ:۔ ہندی میں افسانہ/کہانی کو گلپ بھی کہتے ہیں (مانک ٹالا)

زمانہ

پریم چند نمبر

حصہ اول

پریم چند کے خودنوشت حالات

وسط 1926ء میں ایک دوست نے جو صوبہ متحدہ کے اسکولوں کے لیے اردو ادب کی درسی کتابیں تیار کر رہے تھے، راقم الحروف سے منشی پریم چند صاحب کے مختصر حالات زندگی دریافت کیے تھے۔ میں نے اس کے لیے خود پریم چند ہی کو تکلیف دی۔ چنانچہ میرے اصرار اور تقاضے پر انھوں نے ایک خط میں اپنے خاص خاص واقعات لکھ بھیجے تھے۔ میں نے اس کی نقل دوست موصوف کی خدمت میں بھیج دی اور اصل خط اپنے پاس رکھ لیا جو ابھی تک دفتر ''زمانہ'' میں محفوظ ہے، اس خط کا عکس اس وقت ہدیۂ ناظرین ہے، خط کی پوری عبارت جس سے حالت پر روشنی پڑتی ہے ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

ایڈیٹر ''زمانہ''

بنارس

17/جولائی 1926ء

بھائی جان تسلیم۔ کارڈ کے لیے مشکور ہوں، میرے حالات نوٹ کرلیں۔ پیدائش ستمبر 1937 بکری ہے۔ باپ کا نام منشی عجائب لال سکونت موضع مڈھوالہی متصل پانڈے پور بنارس۔ ابتداءً آٹھ سال تک فارسی پڑھا، پھر انگریزی شروع کیا۔ بنارس کالجیٹ اسکول سے انٹرنس پاس کیا والد کا انتقال پندرہ سال کی عمر میں ہوگیا، والدہ بھی ساتویں سال گذر چکی تھیں، پھر تعلیم کے صیغہ میں ملازمت

کی۔ 1901ء سے لٹریری زندگی شروع کی، رسالہ ''زمانہ'' میں لکھتا رہا، کئی سال تک متفرق مضامین لکھے۔ 1904ء میں ایک ہندی ناول پریما لکھ کر انڈین پریس سے شائع کرایا۔ 1912ء میں جلوۂ ایثار اور 1918ء میں بازارِحسن لکھا۔ ہندی میں سیوا سدن، پریم آشرم، رنگ بھوم، کایا کلپ چاروں ناول دو دو سال کے وقفہ کے بعد نکلے۔ ان کے اردو ترجمے عنقریب شائع ہوں گے۔ کہانیوں کے مجموعے پریم پچیسی، پریم بتیسی اردو میں نکلے، ہندی میں بھی کئی مجموعے شائع ہوئے۔ 20ء میں ملازمت سے کنارہ کش ہو گیا۔ جب سے خانہ نشین ہوں باقی اُمور آپ کو خود ہی معلوم ہیں۔

کربلا[1] آپ نکال رہے ہیں، بہتر میں اس کے آگے کے حصے جلد ہی بھیج دوں گا۔ اردو کی تاریخ کے ترجمہ کے متعلق کیا عرض کروں، اس میں آپ کا فیصلہ میرے فیصلے سے بہتر ہوگا۔ اگر ''زمانہ'' کی تقطیع کے صفحات ہیں تو دو روپیہ فی صفحہ اجرت کسی طرح زیادہ نہیں، اس سے کم میں ترجمہ کرنا میرے نقصان کا باعث ہوگا، اگر منظور فرمادیں تو میرے پاس مسودہ بھجوادیں۔ ناول جاڑوں میں شروع کروں گا، برسات میں ترجمہ ختم کر ڈالوں۔

اور سب خیرت ہے۔ الیکشن کا کام مجھے تو نہیں ملا نہ ملنے کی فکر، مگر اب دیکھتا ہوں کہاں مل سکتا ہے۔ بارش معمولی ہے گرمی بھی کچھ کم ہو گئی ہے۔

بچے اچھی طرح ہیں، آپ بار بار مجھے بلاتے ہیں، ایک دفعہ بنارس کی ہوا کھایئے، میں بہت جلد آؤں گا، موقعہ ملا تو ہفتہ عشرہ میں آپ مجھے کانپور میں دیکھیں گے۔

بچوں کو دعا۔ خدارا کچھ نوین[2] وغیرہ کا حال بھی لکھ دیا کیجئے۔ آپ کے باعث مجھے ان لوگوں کا حال چال جاننے کی بھی فکر رہا کرتی ہے۔ مثلاً بابو رام[3] سرن کا ذکر آپ مطلق نہیں کرتے[4] سیٹھ جی کے حالات سے مجھے بھی کچھ انٹرسٹ ہے۔ یہ حضرات مجھے بھول گئے ہیں۔ لیکن مجھے تو ان کی یاد آیا کرتی ہے۔

دھنپت رائے

(1) یہ ڈرامہ زمانہ میں شائع ہو چکا ہے۔
(2) ایڈیٹر ''زمانہ'' کے چچازاد بھائی جن کا دسمبر 30ء میں عین شباب میں انتقال ہو گیا۔
(3) مسٹر رام سرن نگم ڈپٹی کلکٹر بنارس جو ایڈیٹر ''زمانہ'' کے حقیقی بھائی ہیں۔
(4) بابو رام بھروسے سیٹھ ڈپٹی کلکٹر پنشنر جو ایڈیٹر ''زمانہ'' کے پرانے ہم سبق اور محبِ خاص ہیں۔

جب تک پریم چند جی کانپور میں رہے ان سب صاحبوں سے قریب قریب روزانہ ملاقات ہوا کرتی تھی۔ اور وہ ایڈیٹر ''زمانہ'' کے خاص خاص احباب واعزا کو اپنا ہی عزیز سمجھنے لگے تھے۔ درحقیقت پریم چند اور سینہ جی نے ایڈیٹر ''زمانہ'' کے ساتھ ہمیشہ حقیقی بھائیوں جیسی محبت کی ہے۔ ا۔ز۔

('ا۔ز' سے مراد ہے ایڈیٹر زمانہ ــــ سا نک ثاا!)

منشی پریم چند کی کہانی، ان کی زبانی

پانچ سال ہوئے فروری 1932ء میں منشی پریم چند نے رسالہ ''ہنس'' بنارس کا ایک ''آتم کتھا'' نمبر شائع کیا تھا جس میں مشاہیر ادب اور بعض دیگر معززین ملک کے خودنوشت حالات زندگی درج کیے گئے تھے۔ اس نمبر میں پریم چند جی نے ''جیون سار'' کے عنوان سے اپنے سوانح حیات بھی لکھے تھے اس مضمون کا ترجمہ ذیل میں ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

ایڈیٹر

میری زندگی ہموار میدان کی طرح ہے جس میں کہیں کہیں گڈھے تو ہیں لیکن ٹیلوں، پہاڑوں، گہری گھاٹیوں اور غاروں کا پتہ نہیں ہے۔ جن حضرات کو پہاڑوں کی سیر کا شوق ہو انھیں یہاں مایوسی ہوگی۔

میرا جنم سمبت 1937ء میں ہوا، والد ڈاک خانہ میں کلرک تھے، والدہ مریض تھیں۔ ایک بڑی بہن بھی تھی۔ اس وقت والد شاید بیس روپیہ پاتے تھے، چالیس روپیہ تک پہونچتے پہونچتے ان کا انتقال ہوگیا۔ یوں تو وہ بڑے دوراندیش محتاط اور دنیا میں آنکھیں کھول کر چلنے والے آدمی تھے، لیکن آخری عمر میں ایک ٹھوکر کھا ہی گئے اور خود تو گرے ہی تھے اسی دھکّے میں مجھے بھی گرا دیا۔ پندرہ برس کی عمر میں انھوں نے میری شادی کردی جس کے چند سال بعد ہی انھیں سفر آخرت کے چندر پیش ہوگیا اس وقت میں نویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ گھر میں میری بیوی سوتیلی ماں اور ان کے دولڑکے تھے۔ مگر آمدنی ایک پیسے کی نہ تھی، گھر میں جو کچھ تھا چھ ماہ تک والد کی علالت اور اس کے بعد تجہیز وتکفین میں خرچ ہوگیا، مجھے ایم۔اے پاس کرکے وکیل بننے کا ارمان تھا۔ سرکاری ملازمت اس زمانہ میں بھی اتنی ہی مشکل سے ملتی تھی جتنی کہ اب۔ دوڑ دھوپ کرکے شاید دس بارہ روپیہ کی کوئی جگہ پا جاتا، مگر یہاں تو آگے پڑھنے کی دھن تھی۔ مگر پاؤں میں لوہے کی نہیں اشٹ دھات کی بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اور میں پہاڑ پر چڑھنا چاہتا تھا۔

پاؤں میں جوتے نہ تھے، بدن پر ثابت کپڑے نہ تھے، گرانی الگ، دس سیر کے جو تھے۔ اسکول

سے ساڑھے تین بجے چھٹی ملتی تھی، کوینس کالج بنارس میں پڑھتا تھا، ہیڈ ماسٹر صاحب نے فیس معاف کر دی تھی، امتحان سر پر تھا اور میں بانس کے پھاٹک پر ایک لڑکے کو پڑھانے جایا کرتا تھا، جاڑے کا موسم تھا، چار بجے شام کو پہنچ جاتا اور چھ بجے چھٹی پاتا تھا، وہاں سے میرا گھر پانچ میل پر تھا۔ تیز چلنے پر بھی آٹھ بجے رات سے پہلے گھر نہ پہنچ سکتا۔ سویرے پھر آٹھ بجے گھر سے چل دیتا ورنہ وقت پر اسکول نہ پہنچتا۔ رات کو کھانا کھا کر کپی کے سامنے پڑھنے بیٹھتا اور نہ معلوم کب سو جاتا۔ پھر بھی ہمت باندھے ہوئے تھا۔

میٹریکولیشن تو کسی طرح پاس ہو گیا لیکن سکنڈ ڈویزن میں پاس ہوا اور کوینس کالج میں داخلہ کی کوئی امید نہ رہی۔ فیس صرف اول درجہ میں پاس ہونے والوں کی معاف ہو سکتی تھی، خوش قسمتی سے اسی سال ہندو کالج کھل گیا تھا۔ میں نے اس نئے کالج میں پڑھنے کا ارادہ کیا۔ مسٹر رچرڈسن پرنسپل تھے، ان کے مکان پر گیا۔ وہ سر سے پاؤں تک ہندوستانی لباس میں ملبوس تھے۔ اور دھوتی پہنے فرش پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ لیکن مزاج تبدیل کرنا اتنا آسان نہ تھا، میری گذارش سن کر (ابھی میں آدھی ہی بات کہہ پایا تھا) بولے کہ گھر پر میں کالج کی بات نہیں سنتا۔" ناچار کالج گیا، ملاقات تو ہوئی مگر ناامیدی کے سوائے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اب کیا کروں، اگر کسی کی سفارش لے آتا تو شاید میری درخواست پر غور ہوتا، لیکن ایک دیہاتی لڑکے کو شہر میں جانتا ہی کون تھا۔

روز گھر سے اسی ارادہ سے نکلتا کہ کس سے سفارش لکھالاؤں لیکن بارہ میل کی منزل مار کر شام کو یوں ہی گھر واپس آ جاتا، شہر میں کوئی بات پوچھنے والا بھی نہ تھا۔

کئی دنوں کے بعد ایک سفارش ملی، ایک صاحب ٹھاکر اندر نارائن سنگھ ہندو کالج کی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے۔ ان سے جا کر رویا، انھیں مجھ پر رحم آ گیا اور انھوں نے سفارشی چٹھی لکھ دی، اس وقت میری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ بہر حال خوش خوش گھر آیا، دوسرے دن پرنسپل صاحب سے ملنے کا ارادہ تھا لیکن گھر پہنچتے ہی مجھے بخار آ گیا اور دو ہفتہ سے پہلے نہ ٹلا نیم کا کاڑھا پیتے پیتے ناک میں دم آ گیا۔ ایک دن دروازہ پر بیٹھا ہوا تھا کہ میرے پروہت جی آ گئے۔ میری حالت دیکھ کر مزاج پرسی کی اور فوراً کسی کھیت سے ایک جڑ کھود لائے اور اسے دھو کر سات دانے کالی مرچ کے ساتھ پسوا کر مجھے پلا دیا، اس نے جادو کا اثر کیا۔ بخار چڑھنے میں گھنٹے بھر کی دیر تھی مگر اس دوا نے گویا گھنٹہ بھر کے اندر ہی اس کا گلا گھونٹ دیا، میں نے پنڈت جی سے بار بار اس جڑی کا نام پوچھا مگر انھوں نے نہ بتایا، کہا نام بتا دینے سے اس کا اثر جاتا رہے گا۔

غرض ایک مہینے کے بعد دوبارہ مسٹر رچرڈسن سے ملا اور انھیں ٹھاکر صاحب کا سفارشی خط

دکھلایا۔ انھوں نے میری طرف گھور کر دیکھتے ہوئے پوچھا:۔

''اتنے دنوں تک کہاں تھے؟''

''بیمار ہو گیا تھا۔''

''کیا بیماری تھی؟''

میں اس سوال کے لیے تیار نہ تھا، اگر بخار بتاتا ہوں تو شاید صاحب مجھے جھوٹا سمجھیں، بخار میری سمجھ میں معمولی بات تھی جس کے لیے اتنی لمبی غیر حاضری کی ضرورت نہ تھی۔ کوئی ایسی بیماری بتانے کی فکر ہوئی جو مجبوری اور تکلیف کے علاوہ رحم کے جذبات کو بھی اُبھار سکے اس وقت مجھے اور کسی بیماری کا نام یاد نہ آیا۔ ٹھاکر اندرنارائن سنگھ سے جب میں سفارش کے لیے ملا تھا تو انھوں نے اپنے اختلاج قلب کے مرض کا ذکر کیا تھا، ان کے الفاظ مجھے یاد آ گئے۔

میں نے کہا ''پلپٹیشن آف ہاٹ سر''(Palpitation) of Heat Sir)

صاحب نے تعجب ہو کر میری طرف دیکھا اور کہا ''اب تم بالکل اچھے ہو؟''

''جی ہاں۔''

''اچھا فارم داخلہ بھر کر لاؤ۔''

میں نے سمجھا چلو بیڑا پار ہوا، فارم لیا، خانہ پُری کی اور پیش کر دیا، صاحب اس وقت کسی کلاس میں پڑھا رہے تھے، تین بجے مجھے فارم واپس ملا، اس پر لکھا تھا ''اس کی لیاقت کی جانچ کی جائے۔''

یہ نیا مرحلہ پیش آیا تو میرا دل بیٹھ گیا، انگریزی کے سوا اور کسی مضمون میں پاس ہونے کی امید نہ تھی اور حساب و ریاضی سے تو میری روح کانپتی تھی، جو کچھ یاد تھا وہ بھی بھول گیا تھا، اب کوئی دوسری صورت کیا ہو سکتی تھی، تقدیر پر بھروسہ کر کے کلاس میں گیا اور اپنا فارم دکھایا، پروفیسر صاحب بنگالی تھے، انگریزی پڑھا رہے تھے، واشنگٹن اروِنگ کا "Rip Van Winkle" کا سبق تھا میں پیچھے کی قطار میں جا کر بیٹھ گیا۔ اور دو ہی چار منٹ میں مجھے معلوم ہو گیا کہ پروفیسر صاحب اپنے مضمون پر پوری طرح حاوی ہیں۔ گھنٹہ ختم ہونے پر انھوں نے آج کے سبق پر مجھ سے مختلف سوالات کیے اور میرے جوابات سن کر میری عرضی پر ''اطمینان بخش'' کا لفظ لکھ دیا۔

دوسرا گھنٹہ حساب کا تھا، اس کے پروفیسر بھی بنگالی تھے، میں نے اپنا فارم دکھایا، نئی درسگاہوں میں عموماً وہی طلبا آتے ہیں جنھیں کہیں جگہ نہیں ملتی، یہاں بھی یہی حال تھا۔ کلاسوں میں کم استعداد اور ناقابل طلباء بھرے پڑے تھے، پہلے ریلے میں جو آیا وہ بھرتی ہو گیا۔ بھوک میں ساگ پات بھی لذیذ

معلوم ہوتا ہے، مگر اب پیٹ بھر گیا تھا، طلباء چُن چُن کر لیے جاتے تھے۔ ان پروفیسر صاحب نے حساب میں میرا امتحان لیا اور میں فیل ہوگیا۔ فارم پر حساب کے خانہ میں "نا قابل اطمینان" لکھ دیا گیا۔

میں اتنا نا امید ہوا کہ فارم لے کر پھر دوبارہ پرنسپل کے پاس نہ گیا، سیدھا گھر چلا آیا۔ حساب میرے لیے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی تھی جس پر میں کبھی نہ چڑھ سکا۔ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں حساب میں دو مرتبہ فیل ہوا اور نا اُمید ہوکر امتحان دینا چھوڑ دیا۔ دس بارہ سال کے بعد جب ریاضی کا مضمون اختیاری ہوگیا تو میں نے دوسرے سبجکٹ لے کر آسانی سے انٹرمیڈیٹ پاس کرلیا۔ اس وقت تک ریاضی کی بدولت صدہا طلباء کی آرزوؤں کا خون ہوا۔ خیر میں نا امید ہوکر گھر تو لوٹ آیا لیکن پڑھنے کی تمنا باقی رہی، گھر بیٹھ کر کیا کرتا، کسی طرح حساب پختہ کر کے پھر کالج میں داخل ہو جاؤں، یہی دھن تھی، مگر اس کے لیے شہر میں رہنا ضروری تھا۔ اتفاق سے ایک وکیل صاحب کے لڑکوں کو پڑھانے کا کام مل گیا، پانچ روپے تنخواہ ٹھہری، میں نے دو روپیہ میں گذر کر کے تین روپیہ گھر دینے کا مصمم ارادہ کیا۔ وکیل صاحب کے اصطبل کے اوپر ایک چھوٹی سی کچی کوٹھری تھی اس میں رہنے کی اجازت مل گئی، ایک ٹاٹ کا ٹکڑا بچھالیا، بازار سے ایک چھوٹا سا لیمپ لے آیا اور شہر میں رہنے لگا، گھر سے کچھ برتن بھی لایا، ایک وقت کھچڑی پکا لیتا اور برتن دھو مانج کر لائبریری چلا جاتا، حساب تو بہانہ تھا، ناول وغیرہ پڑھا کرتا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا فسانۂ آزاد انھیں دنوں پڑھا، چندر کانتا سنتت[1] بھی پڑھا بنکم بابو کے اردو ترجمے بھی جتنے لائبریری میں ملے سب پڑھ ڈالے جن وکیل صاحب کے لڑکوں کو پڑھاتا تھا ان کے سالے میٹریکولیشن میں میرے ساتھ پڑھتے تھے۔ انھیں کی سفارش سے مجھے یہ ٹیوشن ملا تھا۔ اس دوستی کی وجہ سے جب ضرورت ہوتی ان سے پیسے اُدھار لے لیا کرتا اور تنخواہ ملنے پر حساب بیباق کر دیتا۔ کبھی دو۲ روپے ہاتھ آتے، کبھی تین۳ جس دن تنخواہ کے دو تین روپے ملتے میری قوت ارادی کی باگ ڈھیلی ہو جاتی، للچائی آنکھیں حلوائی کی دوکان کی طرف کھینچ لے جاتیں اور دو تین آنے کے پیسے ختم کیے بغیر واپس نہ آتا۔ پھر اسی دن گھر جاتا اور دو ڈھائی روپے دے آتا۔ دوسرے دن سے پھر اُدھار لینا شروع کر دیتا لیکن کبھی کبھی اُدھار لینے میں پس و پیش بھی ہوتا جس کی وجہ سے سارا دن روزہ رکھنا پڑتا۔

اس طرح چار پانچ مہینے گذر گئے۔ اسی درمیان ایک بزاز سے دو ڈھائی روپے کے کپڑے لیے تھے روز ادھر سے نکلنا ہوتا تھا، اس کا مجھ پر پورا بھروسہ تھا، جب مہینے دو مہینے ہو گئے اور میں روپے نہ چکا سکا

---

[1] بابو دیوکی نند کھتری کی مشہور ناول کا نام جو 28 جلدوں میں ہے اور جس کا نام ہندی کی سو مشہور کتابوں میں ہے کیونکہ اس کی وجہ سے ہندی پڑھنے اور لکھنے کا شوق پبلک میں پھیلا۔

تو پھر میں نے ادھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا، چکر دے کر نکل جاتا، تین سال کے بعد اس کے روپے ادا کر سکا۔ اسی زمانہ میں شہر کا ایک بیلدار مجھ سے کچھ ہندی پڑھنے آیا کرتا تھا، اس کا گھر وکیل صاحب کے مکان کی پشت پر تھا۔ ''جان لو بھیا'' اس کا تخن تکیہ تھا۔ چنانچہ سب لوگ اسے ''جان لو بھیا'' ہی کہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے اس سے آٹھ آنے پیسے اُدھار لیے تھے۔ یہ پیسے اس نے مجھ سے میرے گھر گاؤں میں جا کر پانچ برس کے بعد وصول کیے۔ اب بھی میری پڑھنے کی خواہش تھی لیکن روز بروز نا امید ہوتا جاتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کہیں نوکری مل جائے تو کرلوں لیکن نوکری کس طرح اور کہاں ملتی ہے، یہ مجھے معلوم نہ تھا۔

جاڑے کا موسم تھا، مگر کوڑی پاس نہ تھی، دو دن تک تو ایک ایک پیسے کے بھنے ہوئے چنے کھا کر کاٹے، میرے مہاجن نے اُدھار دینے سے انکار کر دیا تھا، اور میں لحاظ کے مارے اس سے مانگنے کی جرأت نہ کرسکتا تھا، چراغ جل چکے تھے۔ اس وقت میں ایک بک سیلر کی دوکان پر ایک کتاب بیچنے گیا جو پروفیسر[1] چکرورتی کی بنائی ہوئی ارتھمیٹک کی شرح تھی اور جسے میں نے دو سال ہوئے خریدی تھی، اب تک اسے بڑی احتیاط سے رکھا تھا۔ لیکن آج جب چاروں طرف سے مایوس ہوگیا تو اسے فروخت کرنے کا ارادہ کیا، کتاب کی قیمت دو روپے تھی لیکن ایک روپیہ پر سودا ہوا، میں روپیہ لے کر دکان سے اُترا ہی تھا کہ لمبی مونچھوں والے ایک متین شخص نے مجھ سے پوچھا۔

''تم یہاں کہاں پڑھتے ہو؟''

میں نے کہا ''پڑھتا تو کہیں نہیں' پر کہیں نام لکھانے کی فکر میں ہوں۔''

''میٹریکولیشن پاس ہو؟''

''جی ہاں''

''نوکری تو نہیں چاہیے؟''

''نوکری کہیں ملتی ہی نہیں''

یہ بھلے مانس کسی چھوٹے سے اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور انھیں ایک اسسٹنٹ ماسٹر کی ضرورت تھی، اٹھارہ ۱۸ روپے تنخواہ پر مجھے ملازم رکھ لیا۔ اس وقت یہ اٹھارہ روپے میری مایوس تمنا کی معراج تھے۔ میں دوسرے دن ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس حاضر ہونے کا وعدہ کر کے چلا تو پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ یہ 1899ء کی بات ہے۔ میں گردو پیش کے حالات کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا۔ اور اگر ریاضی کی وجہ سے

---

[1] یہ کتاب اتنی مشہور ہے کہ آج تک اعلیٰ درجہ کے نصاب میں داخل ہے اور لڑکے اس کو صرف چکرورتی کہہ کر پکارتے ہیں۔

اٹک نہ جاتا تو ضرور آگے تک جاتا، مگر ریاضی نے سارے ارمان خاک میں ملا دیے۔

(2)

پہلے پہل 1907ء میں میں نے کہانیاں لکھنا شروع کی۔ ڈاکٹر ربیندر ناتھ کی کئی کہانیاں میں نے انگریزی میں پڑھی تھیں، ان میں سے بعض کا ترجمہ کیا، اور پہلا ناول تو میں نے 1901ء ہی میں لکھنا شروع کیا۔ میرا ایک ناول 1902ء میں شائع ہوا اور دوسرا 1904ء میں، لیکن کہانیاں سب سے پہلے 1907ء ہی میں لکھیں۔ میری پہلی کہانی کا نام تھا ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' وہ 1907ء میں رسالہ ''زمانہ'' میں چھپی۔ اس کے بعد میں نے زمانہ میں چار پانچ کہانیاں اور لکھیں۔ 1909 میں پانچ کہانیوں کا مجموعہ سوز وطن کے نام سے زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا۔ اس وقت ملک میں تقسیم بنگالہ کی شورش بر پا تھی اور کانگریس میں ''گرم دل'' کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ ان پانچوں کہانیوں میں حب وطن کا ترانہ گایا گیا تھا۔

اس وقت میں سرشتۂ تعلیم میں سب ڈپٹی انسپکٹر مدراس تھا اور ہمیر پور کے ضلع میں تعینات تھا۔ کتاب کو نکلے چھ مہینے ہو چکے تھے۔ ایک دن رات کو میں اپنے کیمپ میں بیٹھا ہوا تھا کہ کلکٹر صاحب کا پروانہ پہنچا کہ ''فوراً آ کر مجھ سے ملو جاڑے کا موسم تھا میں نے بیل گاڑی جتوائی اور راتوں رات تیس چالیس میل کا سفر طے کر کے دوسرے دن صاحب سے ملا۔ ان کے سامنے ''سوز وطن'' کی ایک جلد رکھی ہوئی تھی، میرا ماتھا ٹھنکا، اس وقت میں ''نواب رائے'' کے نام سے لکھا کرتا تھا، مجھے اس کا کچھ کچھ پتہ مل چکا تھا کہ خفیہ پولیس اس کتاب کے مصنف کی کھوج میں ہے۔ میں سمجھ گیا کہ ان لوگوں نے مجھے کھوج نکالا اور صاحب کلکٹر نے اسی کو جواب دہی کے لیے مجھے بلایا ہے۔

صاحب نے مجھ سے پوچھا: ''کیا یہ کتاب تم نے لکھی ہے؟''

میں نے کہا ''ہاں''

صاحب نے ایک ایک کہانی کا مجھ سے مطلب پوچھا، اور آخر میں بگڑ کر بولے ''تمھاری کہانیوں میں سڈیشن بھرا ہوا ہے، اپنی تقدیر پر خوش ہو کہ انگریزی عملداری میں ہو، مغلوں کا راج ہوتا تو تمھارے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے جاتے، تمھاری کہانیاں یک طرفہ ہیں، تم نے انگریزی سرکار کی توہین کی ہے وغیرہ'' آخر کار فیصلہ یہ ہوا کہ میں ''سوز وطن'' کی کل کاپیاں سرکار کے حوالے کر دوں اور آئندہ صاحب سے اجازت لیے بغیر کچھ نہ لکھوں، میں سمجھا کہ چلو سستا چھوٹ گیا، کل ہزار کاپیاں چھپی تھیں اور ابھی مشکل سے تین سو جلدیں فروخت ہو سکی تھیں، میں نے بقیہ سات سو کاپیاں زمانہ پریس سے منگا کر

صاحب کی نذر کردیں۔

میں سمجھا بلا ٹل گئی، لیکن افسران محکمہ کی اس سے سیری نہ ہوئی، چنانچہ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کلکٹر صاحب نے ضلع کے دوسرے افسروں سے بھی میرے بارے میں مشورہ کیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس، دو ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی انسپکٹر مدارس جن کا میں ماتحت تھا میری تقدیر کا فیصلہ کرنے بیٹھے، ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب نے میری کہانیوں سے ثابت کیا کہ ان میں شروع سے لے کر آخر تک باغیانہ خیالات اور انقلاب انگیز جذبات کے سوا اور کچھ نہیں۔ محکمہ پولیس کے خداوند نے کہا کہ ایسا خطرناک آدمی سخت سزا کا مستحق ہے۔ ڈپٹی انسپکٹر صاحب کو مجھ سے بڑی محبت تھی۔ اس ڈر سے کہ کہیں معاملہ طول نہ پکڑے انھوں نے کہا کہ وہ دوستانہ طریقہ پر میرے سیاسی خیالات کا پتہ لگا کر کمیٹی کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کریں گے۔ دراصل ان کا ارادہ تھا کہ مجھے سمجھا بجھا کر رپورٹ میں لکھ دیں کہ مصنف صرف قلم کا مرد ہے مگر سیاسی اُمور سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کمیٹی نے اس مشورہ کو پسند کیا حالانکہ پولیس کے خداوند اس وقت بھی پیتر ے بدلتے رہے۔

مگر کلکٹر صاحب نے ڈپٹی صاحب سے پوچھا "آپ کو امید ہے کہ وہ اپنے دل کی باتیں آپ سے کہہ دے گا؟"

ڈپٹی صاحب نے کہا "ان سے میری گہری دوستی ہے۔"

"آپ دوست بن کر اس کے دل کی تھاہ لینا چاہتے ہیں، میں اسے کمینہ پن سمجھتا ہوں۔"

ڈپٹی صاحب اس جواب کے لیے تیار نہ تھے، صاحب کی باتوں سے مرعوب ہوکر بولے "میں تو حضور کے حکم...... مگر صاحب نے بیچ ہی میں بات کاٹ دی "نہیں یہ میرا حکم نہیں ہے۔ میں ایسا حکم نہیں دینا چاہتا، اگر کتاب سے سڈیشن ثابت ہوتا ہوتو مصنف پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے ورنہ تنبیہ کر کے چھوڑ دیجیے، منھ میں رام اور بغل میں چھری مجھے پسند نہیں۔"

جب کئی دن بعد یہ واقعہ ڈپٹی صاحب نے مجھ سے بیان کیا تو میں نے پوچھا "کیا آپ سچ مچ میری مخبری کرتے؟"

وہ ہنس کر بولے "نہیں یہ ناممکن تھا کوئی لاکھ روپے بھی دیتا تو بھی میں ایسا نہ کرتا۔ میں تو صرف عدالتی کارروائی روکنا چاہتا تھا، اور میں خوش ہوں کہ وہ رک گئی۔ مقدمہ عدالت میں جاتا تو سزا ہو جانا یقینی تھی۔ یہاں آپ کی پیروی کرنے والا کوئی نہ تھا، مگر صاحب بڑے شریف آدمی ہیں۔" میں نے بھی منظور کیا کہ واقعی بہت شریف ہیں۔

(3)

میں ہمیر پور ہی میں تھا کہ مجھے پیچش کی شکایت پیدا ہوگئی گرمی کے دنوں میں یہاں کوئی سبز ترکاری نہ ملتی تھی۔ ایک بار کئی دن لگاتار خشک اروی کھانا پڑی۔ ایک روز پیٹ میں ایسا درد ہوا کہ تمام دن مچھلی کی طرح تڑپتا رہا، چورن کھایا، پیٹ پر گرم بوتل پھیری، جامن کا عرق پیا، غرض دیہات میں جتنی دوائیں مل سکتی تھیں سب کھائیں لیکن درد کم نہ ہوا۔ دوسرے دن پیچش ہوگئی۔ لیکن درد جاتا رہا۔

اسی طرح ایک مہینہ ختم ہوگیا۔ اس کے بعد میں ایک قصبہ میں پہنچا تو وہاں کے تھانہ دار صاحب نے مجھ سے تھانہ ہی میں ٹھہرنے اور کھانے کو کہا۔ کئی دن سے مونگ کی دال کھاتے کھاتے اور پرہیز کرتے کرتے پریشان ہوگیا تھا۔ سوچا کیا برج ہے، آج یہیں ٹھہر جاؤ کھانا تو لذیذ ملے گا۔ تھانہ میں ہی اڈا جما دیا۔ داروغہ جی نے زمیں قند پکوایا، پکوڑیاں، دہی بڑے، پلاؤ سب کچھ بنوایا، میں نے بھی خاص طور پر کھایا، لیکن کھاپی کر جب تھانے میں داروغہ جی کے پھوس کے بنگلے میں لیٹا تو دو ڈھائی گھنٹے کے بعد پھر پیٹ میں درد ہونے لگا۔ ساری رات اور اگلے دن پھر کراہتا رہا۔ سوڈے کی دو بوتلیں پینے کے بعد تے ہوئی تو چین ملا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ یہ تمام زمیں قند کی خرابی ہے۔ تب سے اروی اور زمین قند دونوں کی صورت دیکھ کر کانپ جاتا ہوں۔ درد تو خیر جاتا رہا لیکن پیچش کی دائمی شکایت ہوگئی۔ پیٹ چوبیس گھنٹے تنا رہتا۔ ابھرن کی شکایت برابر قائم رہی، کچھ دنوں تک روزانہ بلا ناغہ چار پانچ میل ٹہلنے جاتا، کسرت کرتا، پرہیزی کھانا کھاتا اور کوئی نہ کوئی دوا بھی کھایا کرتا، لیکن پیچش میں کوئی کمی نہ ہوئی اور بدن بھی سوکھا جاتا تھا۔ کئی مرتبہ کانپور آکر علاج کرایا۔ ایک بار مہینے بھر الہ آباد میں آیورویدک اور ڈاکٹری دوائیں کھاتا رہا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔

تب میں نے اپنے تبادلہ کی درخواست کی۔ چاہتا تو یہ تھا کہ رونہیلکھنڈ میں تبدیلی ہو، مگر پٹکا گیا بستی کے ضلع میں اور وہ حلقہ ملا جو نیپال کی ترائی کے قریب ہے۔ خوش قسمتی سے یہاں میرا تعارف پنڈت منن دویدی گجپوری سے ہوا جو ڈمریا گنج میں تحصیلدار تھے۔ ان کے ساتھ اکثر علمی مباحث پر بات چیت ہوتی رہی۔ لیکن بستی آکر پیچش کی شکایت اور بڑھ گئی۔ تب میں نے چھ مہینے کی چھٹی لی اور لکھنؤ کے میڈیکل کالج میں علاج کرایا۔ یہاں فائدہ نہ ہوا تو بنارس کے ایک حکیم کا علاج کیا۔ تین چار مہینے کے بعد تھوڑا فائدہ معلوم ہوا لیکن بیماری جڑ سے نہ گئی، رخصت کے بعد جب پھر بستی پہنچا تو وہی حالت ہوگئی، تب میں نے دورے کی نوکری چھوڑ کر بستی ہائی اسکول میں اسکول ماسٹری قبول کرلی۔ یہاں سے تبدیل ہو کر

گورکھپور پہنچا مگر پیچش کی شکایت حسب سابق قائم رہی یہاں ہمارا تعارف مہابیر پرشاد جی پوتدار سے ہوا جو ہندی لٹریچر کے فاضل مادر وطن کے سچے خادم اور بڑے جفاکش و محنتی شخص ہیں۔ میں نے بستی میں ہی ہندی کے رسالہ "سرسوتی" میں کئی کہانیاں چھپوائیں، پوتدار جی کی صلاح سے میں نے "سیوا سدن" نامی ناول لکھا۔ گورکھپور ہی میں میں نے پرائیویٹ طور پر بی۔اے بی پاس کیا۔ سیوا سدن کی جو قدر و منزلت ہوئی اس سے بڑی حوصلہ افزائی ہوئی اور میں نے دوسرا ناول پریم آشرم لکھا، اس اثنا میں کہانیاں بھی برابر لکھتا رہا۔

پوتدار جی کے مشورے سے میں نے پانی کا علاج شروع کیا لیکن تین چار مہینے کے غسل اور پرہیز کا اُلٹا اثر یہ ہوا کہ میرا پیٹ بڑھ گیا اور مجھے پیدل چلنے میں تکلیف محسوس ہونے لگی۔ ایک مرتبہ کئی دوستوں کے ساتھ مجھے ایک زینہ پر چڑھنا پڑا اور لوگ تو دھڑا دھڑ چڑھ گئے مگر میرے پاؤں اٹھتے ہی نہ تھے۔ بڑی مشکل سے ہاتھوں کا سہارا لیتے ہوئے اوپر پہنچا۔ اسی دن مجھے اپنی کمزوری کا احساس ہوا، سمجھ گیا کہ اب تھوڑے دنوں کا مہمان اور ہوں، پانی کا علاج بند کر دیا۔

ایک دن شام کے وقت اردو بازار میں شری بجت دسرتھ پرشاد جی دویدی ایڈیٹر سودیش سے ملاقات ہوگئی، کبھی کبھی ان سے بھی لٹریچر کا تذکرہ ہوتا رہتا تھا۔ انھوں نے میری زرد صورت دیکھ کر کہا "بابو جی آپ تو بالکل ہی پیلے پڑ گئے ہیں۔ اس کا علاج کیجیے۔

مجھے اپنی بیماری کا ذکر بہت برا لگتا تھا۔ میں اپنی بیماری کو بھول جانا چاہتا تھا۔ جب دو ہی چار مہینے کی زندگی ہے تو پھر کیوں نہ ہنستے ہوئے مروں، میں نے چڑھ کر کہا، مر ہی تو جاؤں گا بھائی یا اور کچھ؟ میں موت کے خیر مقدم کو تیار ہوں۔ بیچارے دویدی جی نے ندامت سے سر نیچے کر لیا، بعد کو مجھے بھی اپنی اس تلخ گفتاری پر بڑا افسوس ہوا۔ یہ 1920ء کا واقعہ ہے۔ ان دنوں تحریک عدم اشتراک عمل زوروں پر تھی۔ جلیانوالہ باغ کا واقعہ ہو چکا تھا، انھیں دنوں مہاتما گاندھی نے گورکھپور کا دورہ کیا، غازی میاں کے میدان میں اونچا پلیٹ فارم تیار کیا گیا، دو لاکھ سے کم کا مجمع نہ تھا۔ تمام ضلع کی عقیدت مند پبلک دوڑی آئی تھی، ایسا مجمع اس سے پہلے میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ مہاتما جی کے درشنوں کی یہ برکت تھی کہ میرے ایسے مردہ دل آدمی میں بھی جان آ گئی۔ اس کے دو ہی چار دن کے بعد میں نے اپنی بیس سال کی سرکاری ملازمت سے استعفا دے دیا۔

اب دیہات میں کچھ کام کرنے کی طبیعت ہوئی۔ پوتدار جی کا دیہات میں ایک مکان تھا ہم اور وہ دونوں وہاں چلے گئے اور چرخے چلانے لگے۔ ایک ہی ہفتہ بعد میری پیچش کم ہوگئی یہاں تک کہ ایک

مہینے کے اندر بالکل صحت ہوگئی، مگر اس کے بعد میں بنارس چلا آیا اور اپنے دیہات میں بیٹھ کر پرچار اور ادبی خدمت میں زندگی بسر کرنے لگا۔ غلامی سے نجات پاتے ہی میں نو سال کے پرانے مرض سے چھٹکارا پاگیا۔ اس تجربے نے مجھے پورے طور پر "قسمت پرست" بنا دیا اب مجھے کامل یقین ہے کہ جو مالک کی مرضی ہوتی ہے وہی ہوتا ہے۔ انسان کی کوئی کوشش اس کی مرضی کے بغیر کامیاب نہیں ہوتی۔

قطعات تاریخ وفات منشی پریم چند

(از پروفیسر حامد حسن قادری)

(1)

پیام مرگ دھنپت رائے آمد　　　چو برقِ خرمنِ ہندی و اردو
زگوہر ہائے گفتار "پریم" آہ　　　تہی شد دامنِ ہندی و اردو
بگو سالش زردے یاس وافسوس　　　خزانِ گلشنِ ہندی و اردو

1355ھ

(2)

مثلِ نثر پریم چند ادیب　　　ہند کم دیدہ ہندی و اردو
چوں ندارند درغمِ مرگش　　　چشمِ نم دیدہ ہندی و اردو
گفت تاریخِ رحلتش حامدؔ　　　آہ غم دیدہ ہندی و اردو

1355ھ

(3)

رفت پریم چند ہم درپس راشدؔ آہ آہ　　　اے اجل از سنان تو زخم بدل خوریم چند؟
ملک وزباں زمرگ بسکہ بخوں نشستہ اند　　　سالِ وفات او بگو "آہ غم" پریم چند

1355ھ

پریم چند اور مسز پریم چند

یہ درد انگیز مضمون محترمہ مسز پریم چند صاحبہ (شریمتی شیورانی دیوی) نے ہماری درخواست پر اس یادگار نمبر کے لیے لکھا ہے۔ ہم اسے شائع کر کے خلوص قلب سے دست بہ دعا ہیں کہ ایشور آپ کو اس حادثۂ عظیم کے برداشت کی قوت اور سکون خاطر عطا فرمائے، اور بچوں کی عمر دراز کرے۔

ایڈیٹر "زمانہ"

25۔ جون 2½ بجے رات کو 1936

"بٹیا دھنو[1]! ذرا پنکھا کھول دو بڑی گرمی ہے۔" یہ ان[2] کے الفاظ تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد میرا چھوٹا لڑکا بنو[3] دوڑتا ہوا میرے کمرے میں آیا اور بولا "اماں! بابو جی کو تے ہوئی ہے۔" خوف اور غم کے مارے میں چونک پڑی، اور جھپٹ کر جب ان کے پاس پہنچی تو خون کی تے دیکھ کر تھرا گئی جیسے کسی نے برقی تار کو چھوا کر زخمی کر دیا ہو۔ تھوڑی دیر میں بعد وہ صاف الفاظ میں بولے۔ "رانی! اب میں چلا۔"

آئے ہوئے غم کی آندھی سے سنبھل کر صبر و استقلال سے میں نے اپنے فطرتی تحکمانہ لہجہ میں کہا "چپ رہو! آپ مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے، وہ خون کی تے کی طرف اشارہ کر کے بولے" جس کے منہ سے اتنا خون نکلے کیا اس سے بھی جینے کی امید رکھتی ہو میں نے کہا" امید کیوں نہ کروں؟ میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے!" انھوں نے منہ پھیر لیا میں نے دھنو کو دوڑا کر ڈاکٹر کو بلوایا، ڈاکٹر نے آ کر تسکین بخش لہجے میں کہا کہ "صرف بلغم کی خرابی ہے، میں نے ایسے کئی مریضوں کو اچھا کیا ہے۔" ان الفاظ سے مجھے تسلین ہوئی، اور یقین ہو گیا کہ جلد ہی اچھے ہو جائیں گے۔

مگر اس دن سے آپ کو اچھی طرح نیند نہیں آئی، رات کو آپ روشنی میں لکھتے پڑھتے تھے اس غیر معمولی علالت کے زمانہ میں بھی آپ برابر لکھتے رہے، اسی حالت میں انھوں نے "منگل سوتر" کے بیسیوں صفحے لکھ ڈالے، مجھے خوف تھا کہ کہیں طبیعت اور خراب نہ ہو جائے، اس لیے میں نے کئی بار ان کو

---

[1] منشی پریم چند جی کا بڑا لڑکا سری پت رائے۔ [2] پریم چند جی۔ [3] منشی پریم چند کا دوسرا لڑکا امرت رائے۔

لکھنے پڑھنے سے روکا، پہلے تو وہ مان گئے، مگر پھر میں انھیں نہ روک سکی کبھی کبھی ان کو رات بھر نیند نہ آتی تھی، اور میں یہ سوچ کر کہ اس طرح پڑھنے لکھنے میں ان کا جی بہل جائے گا ان کو کتاب دے دیتی تھی۔ میں رات دن ان کی چار پائی کے چاروں طرف چکر کاٹتی رہتی تھی، ان کا سر سہلایا کرتی تھی اور ان کے سامنے ہمیشہ خوش رہنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔

ایک رات کو

ان کے پیٹ میں درد تھا، اور میں ان کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھی، جب درد کچھ کم ہوا تو بولے ''رانی! مجھے تمھاری اور بنّو کی بڑی فکر ہے، دھنّو تو ہاتھ پیر والا ہے، بیٹی کی شادی ہوگئی ہے وہ آرام سے ہے، مگر تمھاری اور بنّو کی کیا حالت ہوگی؟'' اس وقت میرے صبر و تحمل کا پیمانہ لبریز ہوگیا زندگی میں پہلی مرتبہ میں ان کے سامنے رو پڑی، ورنہ میں ہمیشہ ہر رنج و غم کو سہہ لیتی تھی مگر اس دن برداشت نہ ہو سکی، تاہم فوراً میں نے اپنے آنسوؤں کو روک لیا اور انھوں نے میرے دل کو دیکھ لیا مگر اشکوں کو نہ دیکھ سکے، مجھے معلوم تھا کہ وہ سب تکلیفیں برداشت کر سکتے تھے مگر میرے آنسوان کے واسطے ناقابل برداشت تھے۔ وہ کہنے لگے ''رانی! میں بھی تمھیں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا، یہاں سب کا فتیں جھیلنے کے لیے تیار ہوں مگر میرا اختیار ہی کیا ہے؟'' اس کے بعد اس کے بعد.................. وہ کہنے لگے ''رانی! تم اگلے جنم کی ماں ہو، اس جنم میں میری دیوی ہو۔'' میں نے ان کا منھ بند کر دیا، پھر بھی وہ کہنے لگے:۔

''تمھیں میری روح و قلب کی طاقت ہو، گھبرانا مت کیونکہ تم بھی یہاں بیٹھی نہ رہو گی؟'' اس طرح اس رات الٹے وہی مجھے دلاسا دیتے رہے۔ میں چپ چاپ بیٹھی ہوئی ان کے پاکیزہ الفاظ سن رہی تھی۔ میری آنکھیں جھپکی ہوئی تھیں، اور ان کا دست نازک میری پیشانی پر تھا۔

بارہ سال پہلے

پریس کھل گیا تھا، اور آپ خود وہاں کام کرتے تھے، جاڑے کے دن تھے، مجھے ان کے پرانے کپڑے ٹھیک نہ معلوم ہوئے، گرم کپڑے بنانے کے لیے دو مرتبہ چالیس چالیس روپے دیئے مگر انھوں نے دونوں مرتبہ روپے مزدوروں کو دے دیئے۔ جب میں نے پوچھا کہ کپڑے کہاں ہیں؟ تو ہنس کر بولے کیسے'' کپڑے؟ وہ روپے تو میں نے مزدوروں کو دے دیے۔ شاید ان لوگوں نے کپڑا خرید لیا۔'' اس پر میں ناراض ہوئی تو وہ متین لہجہ میں بولے'' رانی جو دن بھر تمھارے پریس میں کام کرے، وہ بھوکوں

مرے اور میں اونی سوٹ پہنوں؟ یہ نہیں ہوسکتا۔" ان کی اس دلیل پر میں جھنجھلا کر بولی "میں نے تمھارے پریس کا ٹھیکہ نہیں لیا ہے۔" مگر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے اور بولے، اگر تم نے میرا ٹھیکہ لیا ہے تو میرا رہا ہی کیا؟ سب کچھ تمھارا ہی ہے، پھر ہم دونوں ایک ہی کشتی پر سوار ہیں، ہمارے تمھارے فرائض جدا نہیں، جو میرا ہے وہ تمھارا ہے، میں نے تو اپنے کو تمھارے ہی ہاتھوں سونپ دیا ہے۔" میں لاجواب ہو کر بولی کہ "میں تو ایسا خیال بھی نہیں کرنا چاہتی" اس پر انھوں نے محبت سے بھرپور الفاظ میں کہا" تم پگلی ہو۔"

جب میں نے دیکھا کہ وہ جاڑے کے کپڑے نہیں بنوائیں گے، تو میں نے ان کے بھائی صاحب کو روپیہ دے کر کہا کہ آپ ہی ان کے لیے کپڑے بنوا دیں۔ انھوں نے کپڑا خریدا اور جب سوٹ لے کر آیا تو آپ اسے پہن کر میرے پاس آئے اور کہا کہ "میں سلام کرتا ہوں تمھارا حکم بجالایا۔" میں نے بھی ہنس کر دعا دی اور بولی۔ "ایشور تمھیں چین نصیب کرے اسی طرح ہر سال نئے نئے کپڑے پہنتے رہو۔" اس کے بعد میں نے کہا" سلام تو بڑوں کے لیے واجب ہے میں نہ تو عمر میں بڑی ہوں اور نہ رشتہ ہی میں، پھر آپ مجھے سلام کیوں کرتے ہیں؟" انھوں نے جواب دیا" مگر رشتہ یا عہدہ کوئی چیز نہیں ہیں میں تو دل دیکھتا ہوں اور تم نے ماں کا دل پایا ہے، جس طرح ماں بچوں کو کھلا پلا کر خوش ہوتی ہے اسی طرح تم بھی مجھے دیکھ کر خوش ہوتی ہو، اور اس لیے میں ہمیشہ تم کو سلام کیا کروں گا۔" اس دن سے ہمیشہ جب وہ نیا کپڑا پہنتے تب آ کر مجھے سلام کیا کرتے تھے۔ پچھلے مئی کے مہینے میں انھوں نے غسل کر کے نئی بنیاین پہن کر مجھے سلام کیا تھا۔ مگر ہائے افسوس یہ ان کا آخری سلام ثابت ہوا۔

سات سال پہلے

لکھنؤ میں وہ "مادھوری" کے ایڈیٹر تھے، کانگریس کا طوفانی زمانہ تھا، میرے دل میں بھی ملکی خدمت کا جذبہ پیدا ہوا، چنانچہ میں بھی اپنا زیادہ تر وقت کانگریس ہی کے کام میں صرف کرنے لگی۔ ایک دن انھوں نے کہا "آج میں گھر ہی پر رہوں گا کیا اچھا ہوا گر آج تم بھی نہ جاتیں، اکیلے میری طبیعت کیسے لگے گی۔" میں رک گئی مگر اتنے میں کئی بہنیں آ کر مجھے گھسیٹ لے گئیں، آخر میں کیا کرتی، اس دن شہر میں میرے نام سے نوٹس تقسیم ہوئے تھے اس لیے مجھے مجبوراً جانا پڑا۔ آٹھ بجے رات کو جب لوٹی تو لڑکوں کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ بھی کانگریس آفس کی طرف گئے ہیں۔ آخر آپ رات کے دو بجے آئے۔ میرے پوچھنے پر مسکرا کر بولے" تمھیں وطن کی محبت مجبور کرسکتی ہے تو کیا مجھے نہیں کرسکتی؟" میں نے اسی لہجہ میں جواب دیا" ضرور کیوں نہیں، تبھی تو پوتھے کے پوتھے لکھا کرتے ہو، رات کی رات ایک ایک بات کے سوچنے میں لگا دیتے ہو، پھر بھی روپیوں کے

درشن نہیں ہوتے، میں کیسے کہوں کہ اب تک سرکاری پنشن پانے لگتے۔" انھوں نے مجھے بیچ ہی میں روک دیا اور متین لہجہ میں بولے۔ اس کی کیا شکایت کرتی ہو، میں تو مزدور ہوں، لکھنا میرا فرض ہے یہی میری مزدوری ہے اس میں مجھے صبر ہے، دکھ کی بات صرف یہ ہے کہ اگر میں جیل خانہ چلا گیا تو تمھاری اور بچوں کی حالت کیا ہوگی؟ کون ہماری خبر لے گا"..........اس طرح اُس دن بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

مگر آج

آہ، آج میں لُٹ گئی ہوں، میرا تمام خزانہ خالی ہوگیا ہے۔ آج مجھے اپنی حالت پر افسوس آتا ہے، افسوس میں کتنی بدنصیب ہوں، میرے تمام خیالات اور اعتقادات مٹے جا رہے ہیں۔ ایشور کے انصاف پر بھی میرا اعتقاد کم ہو رہا ہے۔ یہ میری زندگی کی اماوس ہے، مجھے بار بار یہی خیال آتا ہے کہ وہ کتنے عظیم الشان تھے، کیسے فرشتہ خصلت تھے اور میں ان پر کس طرح حکومت کرتی رہی کہ اس قدر قریب ہونے پر بھی میں ان کے اوصاف کی قدر نہ کرسکی۔ بلکہ سچ پوچھئے تو یہ کہنا درست ہوگا کہ میں ان کی عظمت کو بھی پوری طرح محسوس نہ کرسکی، مگر انھوں نے مجھے نباہ دیا، مجھے چاہا، پیار کیا اور بڑی خاطر داری کے ساتھ اپنے دل میں اونچے سے اونچے آسن پر بٹھایا، اس دن مجھے کتنا غرور تھا، میں ان کی ملکہ تھی۔ وہ دنیا کی نظروں میں افسانہ نگاری کے شہنشاہ تھے۔ مگر میرے شوہر ہوتے ہوئے بھی عزیز دوست تھے۔ مجھے ان کی بدولت دنیا کی تمام راحتیں تمام نعمتیں موجود تھیں، آج میں اکیلی ہوں، آج میری زندگی کی تمام طاقت برباد ہوگئی ہے، میرا دل ویران ہوگیا ہے۔ نہ قلم چلتا ہے اور نہ گھر گرستی کا کام کرسکتی ہوں، افسوس ان کے بعد میں بالکل مفلس ہوگئی!

آج اس گھر میں ان کا نایاب تبسم نہیں، اُن کی ایڈیٹری کی جگہ خالی پڑی ہوئی ہے اور سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہے، آج میرا ناخدا نہیں ہے، میں اپنا سب کچھ نیوچھاور کر ان کو بچانا چاہتی تھی، مگر افسوس کچھ نہ کرسکی۔ آدمی کی سعی اتنی حقیر ہے، اس کا مجھے آج اندازہ ہو رہا ہے۔

ان کی یادگار "ہنس"[1] آج بھی زندہ ہے، مگر "ہنس" کا وہ گوہر بے بہا کہاں ہے؟ کیا میں اسی لیے زندہ ہوں کہ میرے دیوتا جس چھوٹے سے نونہال کو چھوڑ گئے ہیں اس کو اپنے خون جگر سے سینچ کر بڑا کر جاؤں۔

میرے دیوتا نے سچ کہا تھا کہ تم پگلی ہو آج دنیا کی نظروں میں بھی پگلی ہوں، بار بار یہی صدا میرے کانوں میں گونج رہی ہے کہ "میں پگلی ہوں۔" آہ میں لٹ گئی! ہاں میں لٹ گئی۔　ماتم زدہ

---

1. منشی پریم چند کا جاری کردہ رسالہ "ہنس"

ان کی رانی اور داسی

منشی پریم چند کی یاد

از منشی پیارے لال شاکر میرٹھی سابق ایڈیٹر "ادیب"

منشی پریم چند سے میری پہلی ملاقات کانپور ریلوے اسٹیشن پر جون 1907ء میں ہوئی تھی۔ میں بنوں (صوبہ سرحد) سے منشی دیانراین نگم کا طلبیدہ کانپور آرہا تھا، اور وہ میرے استقبال کو اسٹیشن پر آئے تھے۔ گاڑی سے اترتے ہی میں تو سامان اُتروانے کی غرض سے بریک کی طرف چل دیا، اور میری بیوی بچے ایک طرف پلیٹ فارم پر کھڑے ہوکر میرا انتظار کرنے لگے۔ منشی صاحب اِدھر اُدھر نظر مارتے ہوئے وہیں آنکلے اور میری بیوی سے "بچوں کے والد کا نام" دریافت کیا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ وہ میرے ہی بچے ہیں تو بڑے تپاک سے بولے، اور ہنس ہنس کے باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں آیا تو میری بیوی نے ان کا تعارف کرایا کہ آپ "منشی نواب رائے" ہیں۔ کچھ دیر تو پلیٹ فارم ہی پر باتیں ہوتی رہیں۔ بعد ازاں باہر نکل کر گاڑی پر سوار ہوئے۔ اسٹیشن سے نیا چوک[1] کافی دور ہے، لیکن منشی پریم چند کی وجہ سے دوری مطلق محسوس نہ ہوئی۔ وہ راستے بھر بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے گویا بہت پُرانے ملنے والے ہیں۔

اس زمانہ میں منشی پریم چند "نواب رائے" کے نام سے لکھتے تھے، اور صرف زمانہ کے لیے لکھتے تھے مضمون نویسی کا انھیں کچھ زیادہ شوق نہ تھا، لیکن چونکہ منشی دیانراین نگم سے ان کے خاص تعلقات تھے، اس لیے جو کچھ لکھتے تھے وہ زمانہ کے لیے ہوتا تھا۔ پہلے پہل میں نے ان کے مضامین زمانہ ہی میں دیکھے تھے اور میں ان کو زورِ قلم اور بالغ نظری کا قائل تھا۔

میرے کانپور آنے سے برس ڈیڑھ برس قبل ان کا پہلا ناول "ہم خرما و ہم ثواب" لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے اس کو 1907ء میں بنوں ہی میں پڑھا تھا، اور بعض خصوصیات کی وجہ سے اس کو پسند بھی کیا تھا۔ کانپور آنے کے بعد ایک دن جب میں نے اس کے متعلق تذکرہ کیا تو وہ

---

[1] جہاں دفتر زمانہ واقع ہے۔ ان دنوں ایسٹ انڈین ریلوے کا اسٹیشن نیا چوک سے دو میل سے زائد فاصلہ پر واقع تھا، اب سنٹرل اسٹیشن قائم ہو جانے سے اس فاصلہ میں بہت کمی ہو گئی ہے۔

قہقہہ مار کر ہنسنے لگے مجھے سخت تعجب ہوا۔ معاً خیال ہوا کہ کہیں میرے سمجھنے میں غلطی تو نہیں ہوئی ہے۔ مگر انھوں نے خود ہی میری الجھن کو دور کر دیا۔ اور اس ناول کی تصنیف کی غرض و غایت بیان کر دی۔ انھیں خود بھی یہ ناول پسند تھا۔ اس کے بعد انھوں نے اس کو ہندی میں ترجمہ کیا۔ اور اس کا نام "پریما" رکھا۔ ہندی زبان میں یہ ان کی پہلی کتاب تھی اس کے بعد میرے قیام کانپور کے زمانہ میں ان کی دو کتابیں اور شائع ہوئیں، یعنی "کشنا" 1908ء میں بنارس سے اور "سوز وطن" 1909ء میں کانپور سے میرے الہ آباد چلے آنے کے بعد ان کا ایک اور ناول "جلوۂ ایثار" کے نام سے 1912ء میں الہ آباد سے شائع ہوا۔ اس وقت تک جو کچھ انھوں نے لکھا "نواب رائے" کے نام سے لکھا مگر "نواب رائے" کو ادبی دنیا میں کوئی خاص پوزیشن حاصل نہ تھی۔

"سوز وطن" ایک مختصر کتاب تھی جس میں پانچ چھ مختصر افسانے تھے اور قیمت بھی چار[1] پانچ آنے سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن یہی وہ کتاب ہے جس نے انھیں "پریم چند" بنا دیا۔ یہ افسانے جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے ملکی و قومی جذبات کے ترجمان تھے، اور عام طور پر ان کو بہت پسند کیا گیا تھا۔ منشی صاحب کا تعلق محکمۂ تعلیم سے تھا۔ "سوز وطن" پر نہ صرف اعتراض ہوا بلکہ ملازمت تک کے لالے پڑ گئے۔ خدا خدا کر کے وہ بلا ٹل گئی اور اسی کے ساتھ منشی جی کی بھی کایا پلٹ ہو گئی!

"نواب رائے" کے بجائے اب انھوں نے اپنے افسانوں کے لیے "پریم چند" نام اختیار کیا۔ "پریم چند" کے نام سے ابتداً تمام افسانے زمانہ ہی میں شائع ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد دو چار افسانے "ہمدرد" (دہلی)[2] میں بھی شائع ہوئے۔ میں اس زمانہ میں "ادیب" الہ آباد کا ایڈیٹر تھا ان کے افسانے "نواب رائے" کے نام سے ادیب میں بھی شائع ہوتے رہتے تھے۔ میں نے ایک بار لکھا کہ ادیب کے لیے جو افسانے آپ بھیجتے ہیں ان میں اپنا نام "پریم چند" کیوں نہیں لکھتے؟ انھوں نے جواب دیا کہ "میں منشی دیا نرائن نگم سے وعدہ کر چکا ہوں کہ 'پریم چند' کے نام سے کسی اور پرچے میں نہ لکھوں گا۔ بلا وجہ ان کا دل دکھانا مجھے منظور نہیں۔"

1910ء یا 1911ء کا ذکر ہے۔ منشی صاحب اس زمانہ میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے اور ہمیر پور

---

1. "سوز وطن" 5 قصوں کا مجموعہ تھا قیمت 5 ر تھی۔ "ایڈیٹر"
2. مولانا محمد علی نے ان قصوں کے لیے تیس روپیہ فی قصہ پیش کیا تھا۔
3. کشنا کی پہلی اشاعت دسمبر 1906ء میں ہوئی
سوز وطن کی پہلی اشاعت جون/ جولائی 1908

میں قیام تھا۔ کسی خاص ضرورت سے مجھے کانپور جانا پڑا۔ اتفاق سے بازار میں منشی پریم چند سے ملاقات ہوگئی۔ ایک گھنٹہ تک ساتھ رہا۔ اسی ایک گھنٹہ میں دنیا بھر کی باتیں ہوگئیں میں نے "سوز وطن" کے بارے میں کیفیت دریافت کی تو کہا۔ "کیا کہوں بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا وہ تو خیریت گزری کہ کتابیں دے کر پیچھا چھوٹ گیا ورنہ جان پر آبنی تھی۔" اس کے بعد "جان بچی اور لاکھوں پائے" کہہ کر بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ پھر کہنے لگے کہ جانتے ہو یہ بلا کیسے نازل ہوئی؟ میں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو پھر ایک قہقہہ لگایا۔ اس کے بعد فرمایا۔ "منشی دیانرائن نگم کے مطبع سے پہلی کتاب "سوز وطن" شائع ہوئی تھی۔ معلوم نہیں کیا وجہ ہوئی کہ کتاب[1] پر پبلشر کا نام بھی کھل گیا[2]۔ خود ہی سوچو ایک سرکاری ملازم اور سوز وطن ایسی مسموم کتاب کا مصنف! توبہ توبہ، وہ تو اچھا ہوا کہ کتابوں پر بلا ٹل گئی ورنہ کیا عجب تھا کہ مانڈلے کی ہوا کھانی پڑتی اتنا کہہ کر پھر ایسے زور کا قہقہہ لگایا کہ بازار والے بھی ہکا بکا ہو گئے۔

کانپور میں کم و بیش ڈیڑھ دو سال تک میرا ان کا ساتھ رہا۔ قریب قریب ہر روز ملاقات ہوتی تھی، اور اپنے دکھ درد کی بات ایک دوسرے سے کہتے تھے۔ ان کی طبیعت میں حد درجہ انکسار اور استغنا تھا۔ اگر چہ خود بھی کچھ خوشحال نہ تھے کہیں دوسروں کی تکلیف کا اس قدر احساس تھا کہ فوراً مدد کو تیار ہو جاتے تھے۔ تصنع سے ان کو نفرت تھی اور صاف دلی وصاف گوئی شیوہ۔ حد درجہ زندہ دل بذلہ سنج اور ظریف الطبع تھے۔ ہمیشہ قہقہہ مار کر ہنستے تھے اور اس زور سے ہنستے تھے کہ دیکھنے والے کو بھی ہنسی آجاتی تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ منشی دیانرائن نگم کے ہاں مخصوص احباب جمع تھے۔ منشی نوبت رائے نظر منشی پریم چند اور راقم الحروف بھی موجود تھے۔ قریب ہی کسی چھت پر گراموفون میں برٹ شپرڈ کا مشہور لافنگ سانگ (Isatina Corner) بجنے لگا۔ کچھ دیر تو منشی پریم چند خاموش ہوئے، پھر یہ کہہ کر کہ لیجئے میں بھی اس کے قہقہہ میں اس کا ساتھ دیتا ہوں قہقہہ مارنے لگے!

منشی پریم چند کو مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جس پر ایک آدھ کتاب ان کی نظر سے نہ گزری ہو۔ اس کے ساتھ ہی حافظہ بلا کا تھا۔ قصہ کہانی کی کتابیں پڑھنا اور ان کو یاد رکھنا تو کوئی قابل تعریف بات نہیں، لیکن منشی پریم چند علمی وسیاسی کتب ورسائل کے اہم مطالب کو اس طرح دہرا دیا

[1] ناتجربہ کاری اور پریس ایکٹ کے قواعد سے ناواقفیت سے یہ غلطی ہوگئی تھی۔ لیکن مجسٹریٹ نے اس کے پاداش میں ایڈیٹر زمانہ پر بھی پچاس روپیہ کا تاوان عائد کیا تھا۔

[2] نئی چھپی ہوئی کتابوں کے داخلہ فارم میں مصنف کا پورا نام اور پتہ (مع دستخط) درج کیا جاتا ہے۔

ـــ سب ڈپٹی انسپکٹر (مانک تالا)

کرتے تھے گویا پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ سیاسی معاملات میں ان کا دماغ خوب کام کرتا تھا۔ رسالہ زمانہ میں اہم سیاسی واقعات و حالات پر ایک ماہانہ تبصرہ ''رفتار زمانہ'' کے عنوان سے شائع ہوا کرتا تھا۔ یہ تبصرہ زمانہ کے خصوصیات میں تھا اور لوگ نہایت توجہ و شوق سے اس کو پڑھتے تھے۔ 8-1907ء کے بعض تبصروں کا بڑا اجز و منشی پریم چند ہی لکھتے تھے انھوں نے بعض کتابوں پر تنقیدیں بھی لکھیں اور وہ تنقیدیں زمانہ کی بہترین تنقیدوں میں شمار کی جا سکتی ہیں۔

وسط 1908ء میں انڈین پریس الہ آباد کے پروپرائٹر (بابو چنتامنی گھوش مرحوم) نے انھیں بلایا تھا۔ بات چیت کر کے کانپور پہنچے تو معلوم ہوا کہ انڈین پریس ایک اردو رسالہ جاری کرنا چاہتا ہے جس کی ادارت کے لیے اس کی نظر نواب رائے پر ہے۔ شرائط وغیرہ بھی طے ہو گئے تھے مگر ان کے احباب نے رائے دی کہ ملازمت ترک کر کے الہ آباد جانا مناسب نہیں بلکہ ایک سال کی رخصت لے لو۔ اس مدت میں پرچہ چل گیا تو رہنا، ورنہ آ کر پھر اپنی جگہ سنبھال لینا۔'' یہ مشورہ منشی پریم چند کو پسند آیا۔ پرچہ کا نام انھوں نے ''فردوس'' تجویز کیا تھا، اور اس کے لیے بہت سے مضامین بھی ادھر اُدھر سے منگا لیے تھے۔ لیکن بعض وجوہ سے وہ تجویز التوا میں پڑ گئی۔ [1]

پانچ چھ برس تک میرا منشی پریم چند سے باقاعدہ خط و کتابت کا سلسلہ بھی قائم رہا۔ ان کی طرح ان کے خطوط بھی بہت صاف ہوتے تھے۔ کانپور میں ایک دفعہ وہ میرے یہاں سے ایک کتاب (coming race) لے گئے تھے۔ کتاب پڑھی تو انھیں بہت پسند آئی۔ کہنے لگے کہ جی چاہتا ہے کہ اس کو ترجمہ کر ڈالوں میں نے جواب دیا کہ اس کا اردو ترجمہ لاہور میں ہو چکا ہے اور آنے والی قوم کے عنوان سے ''ترقی'' [2] میں باقساط شائع ہو چکا ہے اور بہت جلد کتابی صورت میں بھی آ جائے گا۔ یہ سن کر فرمایا کہ پھر میں ہندی میں ترجمہ کیے دیتا ہوں۔ انھوں نے ترجمہ کیا اور ''پاتال لوک کی سیر'' نام رکھا۔ ایک بار میں نے لکھنؤ سے خط لکھا تو اس ترجمہ کے متعلق بھی دریافت کیا کہ اس کا کیا حشر ہوا؟ جواب دیا کہ فلاں پبلشر نے مسودہ کو اس طرح ہضم کیا کہ ڈکار تک نہ لی۔ پبلشروں اور کتب فروشوں کی ذات سے انھیں ہمیشہ نقصان پہنچتا رہا ہے۔ لکھنؤ اور دہلی میں جب ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے انھیں لوگوں کا رونا رویا، اور نام لے لے کر بتایا کہ فلاں اتنی رقم دبائے بیٹھا ہے، اور فلاں اتنا روپیہ ہضم کرنے پر تلا ہوا ہے وغیرہ۔

ان کا مشہور ناول ''بازار حسن'' شائع ہوا تو چند ماہ بعد میں نے اس کے متعلق انھیں اپنی رائے لکھی جس کے لیے وہ کئی بار تقاضا کر چکے تھے۔ میں نے اسی خط میں یہ بھی لکھا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ نے (vanity Fair) کا چربہ اُتارا ہے، کیا یہ ٹھیک ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ نہ میں نے

1. یہ 1907 کی بات ہے۔ پرچے کا اجرا جنوری 1908 میں ہونے والا تھا لیکن وہ تجویز التوا میں پڑ گئی (مانک ٹالا)
2. پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی لاہور کا مشہور رسالہ جو اب بند ہو گیا ہے

کہ آپ نے (vanity Fair) کا چربہ اُتارا ہے، کیا یہ ٹھیک ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ نہ میں نے چربہ اُتارا نہ اس کی تقلید کی، لیکن یہ درست ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد ہی مجھے اس کے لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ تصور ایک حد تک ملتا جلتا ہے، لیکن دونوں کی راہیں جداگانہ ہیں!"

جب منشی پریم چند بمبئی جانے کی تیاریاں کر رہے تھے تو میں نے انھیں مشورہ دیا کہ دور کے ڈھول سہانے ضرور ہوتے ہیں، لیکن اچھا یہی ہے کہ اس ارادے سے باز رہئے ورنہ اپنی مٹی پلید کیجئے گا۔ میں نے دنیائے فلم کے اندرونی حالات ان پر ظاہر کیے اور بتایا کہ ڈائرکٹروں سے کسی بھلے مانس کی نہیں پٹ سکتی۔ انھوں نے جواب دیا کہ سب کچھ طے ہو چکا ہے، اب تو جانا ہی پڑے گا۔ "خیر اور نہ سہی تو اسی بہانے بمبئی کی سیر ہو جائے گی۔"

میں کسی ذاتی ضرورت سے ایک دن بنارس گیا اور اسی رات کی گاڑی سے واپس چلا آیا۔ کسی ذریعہ سے منشی پریم چند کو علم ہو گیا کہ میں بنارس آیا تھا۔ مجھے یہ علم تو تھا کہ ان کی طبیعت فلم کی رنگینیوں سے اُچاٹ ہو چکی ہے، لیکن یہ نہ جانتا تھا کہ وہ بمبئی کو چھوڑ چکے ہیں۔ انھوں نے شکایت کی کہ "آپ کی ذات سے یہ توقع نہ تھی کہ بنارس آئیں اور ملاقات کیے بغیر چلے جائیں" دنیائے فلم کے بارے میں تحریر کیا کہ "بہت تلخ تجربہ ہوا، ایسی صورتیں پیدا ہو گئی تھیں کہ کنارہ کشی کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔"

ایک دن پھرتا پھراتا میں منشی پریم چند کے مکان کی طرف جا نکلا۔ سوچا ادھر آیا ہوں تو ان سے بھی مل لینا چاہئے۔ ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو انھیں تخت پر عجیب شان سے دیکھا۔ پیٹ کے بل اوندھے پڑے ہیں، دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے اوپر اٹھی ہوئی ہیں، سامنے ایک ہندی کتاب کھلی ہوئی ہے، قلم تیزی سے چل رہا ہے۔ اور قلم کی رفتار کے ساتھ ساتھ ٹانگیں بھی برابر ہل رہی ہیں۔ معاً خیال ہوا کہ اس وقت کسی کتاب پر تنقید لکھی جا رہی ہے۔ اندر پہنچتے ہی میں نے دریافت کیا۔ کہئے کس کی توضیع ہو رہی ہے؟ ہنس کر جواب دیا۔ توضیع تو کسی کی نہیں ہو رہی آج ذرا "روٹھی رانی" کو منا رہا ہوں۔ "روٹھی رانی" ہندی کی ایک مختصر کتاب تھی جو انھیں دنوں شائع ہوئی تھی۔ اسی کو انھوں نے اردو میں لکھا تھا۔ اور بعد ازاں وہ قصہ زمانہ میں باقساط شائع ہوا۔ منشی پریم چند کو اس کے بعد بھی بارہا میں نے اسی شان سے لکھتے دیکھا۔ میز کرسی پر بیٹھ کر لکھنے کا انھیں بہت کم اتفاق ہوتا تھا۔ یہ ان کی خاص "ادا" تھی جس کو زندگی بھر انھوں نے نبھایا۔

منشی پریم چند کے ساتھ ان کے ایک عزیز (نام اس وقت ذہن سے اُتر گیا ہے) وہ ایک ہونہار جوان تھے۔ لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ منشی پریم چند کو ان سے بڑی تقویت تھی۔ انھیں کی موجودگی نے انھیں

(sub-Deputy Inspictor) سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس بننے کی ترغیب دی۔ منشی پریم چند سب ڈپٹی انسپکٹر ہو کر کانپور سے چلے گئے۔ انھیں زیادہ تر دورہ میں رہنا پڑتا تھا۔ گھر کی طرف سے کسی قسم کی فکر نہ تھی۔ لیکن ان کی یہ "بے فکری" زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی کیونکہ یہ نوجوان عزیز خفیف علالت کے بعد دنیا سے سدھار گئے اس جوانا مرگی کا منشی پریم چند کو بہت قلق ہوا۔ 1910ء میں انھوں نے مہو باسے لکھا تھا "اس صدمہ سے کمر ٹوٹ گئی، ہمت پست ہوگئی۔ جس انسپکٹری کو بڑی آرزوؤں اور تمناؤں کے بعد حاصل کیا تھا وہی اب جی کا جنجال ہو رہی ہے۔ بیوی کو تنہا چھوڑ کر دورہ پر کیسے جاؤں۔" اس کے بعد انھوں نے دوبارہ کوشش کی اور مدرسی پر اپنا تبادلہ کرالیا۔

منشی پریم چند کی وفات سے ایک ڈیڑھ ماہ قبل ایک مہربان الہ آباد تشریف لائے تھے۔ ان کی معرفت منشی پریم چند نے پیغام بھیجا تھا کہ اگر خود نہیں آسکتے تو خط لکھنے میں کیا قباحت ہے۔ ایک ہفتہ کے بعد پھر یہی پیغام ایک اور صاحب کی معرفت ملا۔ میں نے سوچا کہ خط لکھنے کی کیا ضرورت ہے اب خود ہی چل کر ان سے ملاقات کروں گا۔ کچھ دن کے بعد ان کی علالت کی خبر سنی، مگر کون جانتا تھا کہ ان کی یہ علالت مرض الموت ثابت ہوگی۔ افسوس! میں بنارس تک نہ جا سکا، اور وہ عدم کو روانہ ہو گئے!

دنیائے دنی کا کچھ عجب طور ہوا   دورِ اجل آہ عیش کا دور ہوا
شاکر اٹھو کہ اٹھ گئے سب احباب   محفل کا رنگ اور سے اور ہوا

---

1 بے نرائن لال

منشی پریم چند ایک ہم سبق کی نگاہ میں

از بابو لال کرشن بی۔ ایل۔ ٹی پنشنر ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ اسکول

جہان نقش برآب ست وزندگی برباد
غلام ہمت آنم کہ دل برونہ نہاد

منشی پریم چند کی شہرت ایک ادیب اور ناولسٹ کی حیثیت سے ہوئی۔ لیکن شاید زیادہ لوگ اس حقیقت سے واقف نہ ہوں گے کہ آپ فن تعلیم کے ماہر اور تربیت یافتہ معلّم بھی تھے۔ پندرہ سولہ سال[1] سررشتہ تعلیم میں گورنمنٹ کی ملازمت کرنے کے بعد ترک موالات کے سلسلہ میں آپ مستعفی ہو گئے تھے۔

طالب علمی اور ملازمت کے زمانہ میں مرحوم کا نام دھنپت رائے تھا۔ ٹریننگ کالج میں جب آپ ماڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، آپ کو لوگ بابو دھنپت رائے یا ماسٹر دھنپت رائے کہتے تھے۔ ناول نویسی و مضمون نگاری کے لیے آپ نے اپنا لقب اول "نواب رائے" اور پھر "پریم چند" رکھا۔ آخری لقب دم آخر تک رہا اور اسی نام سے بابو دھنپت رائے اپنے زمانہ کے باکمال افسانہ نویس و مایۂ ناز ادیب و قابلِ فخر قوم پرست حامی ہندو مسلم اتحاد مشہور ہوئے۔ آپ کا ایک لقب اور بھی تھا جس کا ذکر آگے آئے گا۔ آپ 1902ء میں ٹریننگ کالج الہ آباد کی پریپیرٹری کلاس (prepatary class) میں داخل ہوئے۔ انٹرنس پاس امیدوار ایک سال اسی کلاس میں تعلیم پاتے تھے اور دوسرے سال جونیر کلاس میں اس وقت صوبہ ہذا میں صرف یہی ایک ٹریننگ کالج تھا۔ جونیر و سینیر کلاس کے یوپلی ٹیچرز ساتھ ساتھ تعلیم و تربیت حاصل کرتے تھے۔ اس کے پرنسپل ہر دل عزیز مسٹر کیمپسٹر مرحوم اپنے شاگردوں کے سچے بہی خواہ اور مددگار تھے۔ یہاں سے 1904ء میں مرحوم جونیر کلاس کا امتحان درجہ اول میں پاس کرکے جونیر سرٹیفکیٹ

---

[1] دور جولائی 1900ء سے 15 رفروری 1921 تک لگ بھگ بیس سال (مانک ٹالا)

(J.C.) ٹیچر کی سند لے کر نکلے۔ بعدہ سرکاری ملازمت کے دوران میں پرائیویٹ طور پر اول ایف۔ اے۔ اور پھر بی۔ اے کے امتحانات پاس کیے۔ فی الحقیقت ؎

بالائے سرش ز ہوش مندی
می تافت ستارۂ بلندی

پرنسپل صاحب آپ سے بہت خوش تھے۔ اس لیے انھوں نے آپ کو ٹریننگ کالج کے ماڈل اسکول کا ہیڈ ماسٹر مقرر کردیا تھا۔ اس زمانہ میں راقم الحروف بھی ٹریننگ کالج کے سینیر کلاس میں زیر تعلیم تھا۔ ہم سب لوگ یعنی مدرسان ماڈل اسکول کالج ہوسٹل میں رہتے تھے۔ اس کو روحانی کشش سمجھنا چاہیے کہ میرا منشی صاحب سے خاص طور پر تعارف ہوا اور بہت جلد دوستانہ تعلقات ہو گئے۔ آپ طبعاً بڑے غیور وذہین واقع ہوئے تھے۔ منشی پریم چند ابتداء سے ہی کتب بینی کے بڑے شائق تھے۔ چنانچہ ایک روز میرے ساتھ مسٹر سچد انند سہنا بیرسٹر موجودہ وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی وآنریری سکریٹری کاسستھ پاٹھ شالہ سے، جن کی خدمت میں مجھے پیشتر سے نیاز حاصل تھا ملاقات کی تاکہ وقتاً فوقتاً ان کے کتب خانہ سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ ایک مرتبہ کہیں سے مولوی ذکاء اللہ صاحب دہلوی کی تاریخ ہند لے آئے اور چند ہی روز میں اس کی تینوں یا چاروں ضخیم جلدوں کا ختم کر ڈالا۔ اور اس غور سے پڑھا جیسے اس پر کوئی تنقیدی مضمون لکھنا ہے۔ بہرحال اس کے متعلق زبانی گفتگو ضرور ہوئی۔ اس ابتدائی زمانہ میں آپ نے ایک ناول ''کرشنا'' لکھا اور چھپوایا۔ غالباً 1905ء میں آپ کا تبادلہ ماڈل اسکول سے گورنمنٹ ہائی اسکول کانپور کو ہو گیا۔ دانستہ یا نادانستہ آپ کا ''کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی'' پر پورا عمل تھا اسی کا نتیجہ وہ شہرت ہے جو مرحوم کو عرصہ سے حاصل ہو چکی تھی۔ اور جس کے باعث ان کی یاد میں جگہ جگہ صف ماتم بچھی ہے اور ماتمی جلسے ہو رہے ہیں۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد

غالباً 1909ء میں آپ کی تحریک پر یہ کمترین بھی خریداراں زمانہ کے حلقہ میں داخل ہوا اور ابھی تک وہ سلسلہ قائم ہے۔

بابو دھنپت رائے پستہ قامت دبلے پتلے آدمی تھے مگر مضبوط پنجہ کھولنے پر انگلیوں کو موڑنا معمولی انسان کے لیے آسان نہ تھا۔ ان کی وضع قطع سادہ تھی۔ اچکن پانجامہ یا کھلے گلے کا لمبا کوٹ پہنتے تھے۔ ممکن ہے کبھی پتلون بھی استعمال کرتے ہوں لیکن یاد نہیں پڑتا۔ اس زمانہ میں غیر ملکی فیشن کا بھوت لوگوں کے سر پر اتنا زیادہ سوار نہ تھا۔ سر پر ہندوستانی ٹوپی یا صافہ ہوا کرتا تھا۔ جس طرح مرحوم کی وضع قطع سادہ

تھی۔ آپ کی عادتیں اور اخلاق بھی سیدھا سچا اور تصنع سے بالاتر تھا۔ خلوص آپ کا ہمیشہ سے شعار تھا۔ آواز بلند تھی اور خواہ مخواہ کسی سے دبنے والے آدمی نہ تھے۔ ہوسٹل میں لڑنا جھگڑنا درکنار آپ کو کبھی کسی سے نالائم یا خلاف تہذیب گفتگو کرتے ہوئے بھی نہیں دیکھا گیا۔ ملازموں کے ساتھ بھی اچھی طرح پیش آتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ کس قدر خوش اخلاق، صلح کل، ہمدرد اور خوددار انسان تھے۔

پڑھتے لکھتے وقت اکثر اپنا کمرہ اندر سے بند کر لیا کرتے تھے۔ اور تفریح کے وقت دل کھول کر تفریح کرتے۔ آپ کی اور مرحوم بابو گرجا کشور صاحب اسسٹنٹ کمشنر آبکاری کی وجہ سے ہمارا ایک چھوٹا سا لافنگ کلب (LAUGHING CLUB) بن گیا تھا جس کا روزانہ اجلاس میرے ہی کمرہ میں ہوا کرتا تھا۔ اس میں شاید اور بھی دو ایک صاحب تھے لیکن اس وقت خیال نہیں آتا بہرحال ان میں سبھی ہنسنے والے تھے مگر دھنپت رائے غضب کرتے تھے۔ جب ہنستے تو خوب ہنستے اور قہقہہ پر قہقہہ لگاتے چلے جاتے اسی وجہ سے ہم لوگ خاص کر یہ احقر اور گرجا کشور ان کو ''بمبوق''[1] کہا کرتے تھے۔ اور ممکن ہے یہ لقب میرا ہی اختراع ہو۔ اکثر اسی نام سے ان سے راقم کی خط و کتابت بھی ہوا کرتی تھی۔

1927ء یا 1928ء میں مرحوم دیوریا ضلع گورکھپور تشریف لائے تھے۔ اس وقت میں کنگ ایڈورڈ اسکول دیوریا کی خدمت کر رہا تھا۔ آپ غریب خانہ پر مقیم رہے اور دو تین دن خوب لطف صحبت رہا مگر اس وقت ان کی قہقہہ بازی میں بہت فرق آ چکا تھا البتہ خلوص و وضعداری ویسی ہی تھی۔ صحت بھی پہلی سی نہ تھی۔ یہ انحطاط مسلسل دماغی انہماک پاس وضع و دیگر افکار کا قدرتی نتیجہ تھا۔ مگر اس وقت بھی یہ کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ یہ ہنسی اس قدر جلد روپوش ہو جائے گی اور یہ ماہتاب محبت ہمیشہ کے لیے پردۂ تاریکی میں چھپ جائے گا۔

خوش ست عمر دریغا کہ جاودانی نیست
بس اعتماد بریں پنج روز فانی نیست

---

[1] کانپور میں قیام کے زمانہ میں احباب ہمیشہ آپ کو اسی نام سے مخاطب کیا کرتے تھے۔

منشی پریم چند مرحوم ایک شاگرد کی نگاہ سے

از منشی منظور الحق کلیمؔ

میرا جولائی 1916ء سے مئی 1918ء تک کا زمانہ استاذی منشی پریم چند مرحوم کے ساتھ شاگردی کی حیثیت سے بسر ہوا۔ آپ اس زمانہ میں نارمل اسکول گورکھپور میں فرسٹ اسسٹنٹ تھے۔ آپ کا معمول تھا کہ اسکول میں عموماً ٹھیک وقت پر پہنچ جاتے۔ رہنے کے لیے آپ کو اسکول ہی میں سرکاری مکان ملا تھا۔ گھنٹہ بجا اور آپ شاعرانہ انداز میں نکلے۔ اکثر آپ کھلے سر بال پریشان اور ایک کوٹ پہنے ہوئے جس کے بٹن کھلے رہتے۔ عام طور پر دھوتی پہنے ایک عجیب انداز رفتار سے اسکول آتے تھے۔ لڑکے جتنا ان کا ادب کرتے تھے کسی دوسرے کا نہیں کرتے تھے۔ میری جماعت کو تاریخ پڑھاتے تھے۔ ان کا دستور یہ تھا کہ خود تاریخ کی کتاب لے کر پڑھتے چلے جاتے، چونکہ لڑکے مڈل اور ٹریننگ پاس ہوتے تھے۔ اس لیے زیادہ وقت نہیں پڑتی تھی۔ ایک گھنٹہ میں جو کچھ پڑھانا ہوتا 15 منٹ میں پڑھا کر تاریخ کے متعلق وہ باتیں بیان کرتے جو اس تاریخ میں نہ ہوتیں۔ نہیں معلوم ان کی معلومات کتنی وسیع تھیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ جو کچھ تاریخ میں پڑھ کر سناتے اس کے خلاف مختلف تاریخی حوالوں سے بیان کرتے۔ بعض واقعات کے متعلق یہ بھی دکھلاتے کہ محض ہندو مسلمانوں میں نفاق پیدا کرنے کے لیے لکھی گئی ہیں۔ غرض ان کا گھنٹہ عجیب و غریب معلومات کا گھنٹہ ہوتا۔ گھنٹہ ختم ہونے کے قبل یہ بھی فرما دیتے کہ دیکھو جو کچھ میں نے بیان کیا ہے وہ سمجھنے کی چیز ہے امتحان میں وہی لکھنا جو تمھاری کتاب میں ہے ورنہ فیل ہو جاؤ گے۔

کلاس میں ان کے آتے ہی ایسی زندہ دلی پیدا ہو جاتی تھی کہ ہر ایک ان کی طرف مخاطب ہو جاتا۔ یہ ضروری نہ تھا کہ جو سبجکٹ پڑھانا ہے وہی پڑھایا جائے۔ بلکہ جس موضوع کی طرف ان کا رجحان یا لڑکوں کا تقاضا ہوا بیان فرمانے لگے۔ اگر کلاس میں پڑھاتے وقت کوئی ہنسی کی بات آ گئی تو بے اختیار ہنسنے لگتے۔ کسی کا خوف و ہراس نہیں تھا۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ انسپکٹر صاحب معائنہ کے لیے آئے

بابو بچن لال صاحب ہیڈ ماسٹر مرحوم جو بہت سیدھے آدمی تھے کچھ پریشان سے تھے۔ تمام لڑکے بھی اپنے اپنے ڈریس سے آراستہ تھے مگر ہمارے استاد مرحوم کا وہی عالم تھا جو پہلے لکھ چکا ہوں ننگے سر، بال پریشان کوٹ کا بٹن کھلا ہوا۔ انسپکٹر صاحب کلاس میں آئے مگر اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا کچھ انگریزی میں گفتگو ہوئی اس کے بعد انسپکٹر صاحب چلے گئے۔

اُس زمانہ میں استاد مرحوم کے ایک چھوٹا بچہ دھنو تھا۔ اس کو ہم لوگ اکثر کھلاتے تھے جس وارڈ میں ہم لوگ تھے اس کے بعد ہی استاد مرحوم کا مکان تھا۔ اس لیے انھیں جب ضرورت ہوتی ہم لوگوں کو بلا لیتے۔ اس زمانہ میں جس قدر افسانے لکھے گئے اور رسالوں میں بھیجے گئے تقریباً کل کے کل میرے صاف کیے ہوئے تھے۔ میں نے اس زمانہ میں ایک ناول محمود اور سائرہ کے نام سے لکھا تھا۔ ایسا شفیق استاد پاکر اصلاح نہ لیتا تو غلطی تھی چنانچہ میں نے اسے انھیں دکھایا۔ دوسرے روز یہ کہہ کر اسے واپس کر دیا کہ اتنی فرصت کس کو ہے کہ اتنی بڑی کتاب دیکھے۔ اگر شوق ہے تو چھوٹے چھوٹے افسانے لکھو۔ پھر میں نے کبھی ہمت نہ کی۔ دو چار افسانے تعمیل حکم میں لکھے، جو زمانہ میں چھپ گئے۔

آپ کے افسانے کی عالم گیر شہرت کی وجہ سے اکثر لوگ دور دراز سے ان سے ملنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ دو صاحب ملنے کے لیے آئے، ایک اعظم گڑھ کی کسی تحصیل کے تحصیلدار تھے، دوسرے کوئی رئیس تھے۔ رئیس نے کچھ روپیہ بھی پیشکش کیا تھا، تحصیلدار صاحب کا نام غالباً مَتن دویدی تھا۔

جب نان کوآپریشن میں ملازمت سے الگ ہوئے تو تمام لڑکے اسکول چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے مگر آپ نے سبھوں کو روکا اور بتایا کہ یہ راستہ بہت دشوار ہے میں تو اس قابل ہو گیا ہوں کہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال لوں مگر تم لوگ اس قابل نہیں اس لیے اگر تم لوگوں نے اسکول چھوڑا تو سخت دشواری میں پڑ جاؤ گے، چنانچہ بہت سے لڑکے اسکول میں رہ گئے پھر بھی چند لڑکے فرطِ محبت میں تعلیم سے دست کش ہو گئے۔

منشی پریم چند مرحوم ایک رفیق کار کی نگاہ میں

از مرزا محمد عسکری بی۔اے لکھنوی

منشی پریم چند صاحب مرحوم سے مجھ سے پہلی مرتبہ مولانا ظفر الملک صاحب ایڈیٹر "الناظر" کی ہمراہی میں ملاقات ہوئی۔ جب یہ دونوں صاحب غریب خانہ پر تشریف لائے تھے۔ یہ واقعہ 1924ء یا 1925ء کا ہے جب میں بعد فراغ ملازمت کلکتہ سے آ گیا تھا۔ اسی زمانہ میں شمس العلماء مولانا کمال الدین صاحب پروفیسر عربی و فارسی لکھنؤ یونیورسٹی کی جدوجہد سے لکھنؤ میں انجمن اردو قائم ہوئی تھی، اور میں و رسید مسعود حسن صاحب رضوی بھی اس کے ممبر تھے۔ خیر مولانا ظفر الملک صاحب نے منشی پریم چند صاحب کا تعارف کراتے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ دیکھئے یہ بھی آپ کی انجمن کے ایک سرگرم ممبر ہوں گے اور جس تعریف کے وہ مستحق تھے یعنی اردو میں ان کی افسانہ نگاری اور ہندی میں ان کی شہرت یہ سب مختصراً بیان کی۔ منشی صاحب کو دیکھ کر میرے اوپر ایک خاص اثر پڑا۔ میانہ قد، چھریرا بدن، کتابی رو چہرہ، ناک نقشہ نہایت درست، آنکھیں بڑی اور نمایاں، سفید صافہ باندھے ہوئے جوان پر بہت زیب دیتا تھا۔ یہ صافہ میں نے ان کو اکثر باندھے دیکھا ہے۔ مجھ پر منشی صاحب کی ذہانت اور قابلیت کا بیک نظر بڑا اثر ہوا۔ ہر چند کو انھوں نے گفتگو میں کم حصہ لیا مگر ہنسی اور مذاق کی باتوں میں ہمارے ساتھ شامل رہے۔ اور اگر سچ پوچھا جائے تو ہم دونوں سے زیادہ ہنسے۔ منشی صاحب کی یہ خصوصیت تھی (جو ان کی زندہ دلی اور نیک دلی کی خاص علامت تھی) کہ اکثر ہنستے تھے اور زور سے قہقہہ کے ساتھ ہنستے تھے۔ میں نے ان کو دو تین برس کے دوران میں ہمیشہ شگفتہ رو اور ہنس مکھ پایا۔ کبھی غصہ ان کے چہرے پر نہ دیکھا۔ کبھی کبھی میں ان سے مذاقاً کہتا تھا کہ کیوں صاحب کیا آپ کو کبھی غصہ نہیں آتا؟ کیا آپ گھر میں بھی غصہ نہیں کرتے۔ اس پر وہ ہمیشہ ہنس دیتے تھے۔ یہ شگفتہ روئی اور خوش مزاجی انسان کے لیے ایک نعمت عظمیٰ ہے۔ سنا جاتا ہے کہ اس سے عمر بڑھتی ہے مگر افسوس ہے کہ منشی صاحب اس قاعدہ سے مستثنیٰ نکلے اور ہنوز بوڑھے

نہیں ہوئے تھے کہ داعی اجل کو لبیک کہا۔ مجھ کو اچھی طرح یاد نہیں ہے کہ منشی صاحب ''انجمن اردو'' کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے یا نہیں مگر اتنا ضرور یاد پڑتا ہے کہ وہ ممبر ہو گئے تھے اور ایک ایسے قابل ومشہور اردو ہندی نگار شخص کی شرکت پر انجمن کو فخر و ناز تھا۔

1926ء میں جب منشی نولکشور کے مطبع سے میرا تعلق ہوا یعنی پبلشنگ ڈپارٹمنٹ کا میں سپرنٹنڈنٹ ہوا تو اسی کے کچھ عرصہ بعد رسالہ ''مادھوری'' کے تعلق سے منشی صاحب بھی وہاں ملازم ہوئے۔ غالباً یہ 1927ء یا 1928ء کا واقعہ ہے۔ گو ''مادھوری'' کا دفتر ایک کمرہ میں کوٹھے پر تھا مگر منشی صاحب کی اور بعض اسٹاف ''مادھوری'' کی نشست میرے کمرہ کے متصل ایک دوسرا کمرہ تھا اسی میں تھی۔ اسی زمانہ میں جب کہ ہر وقت کا ساتھ تھا۔ مجھ سے اور ان سے ملاقات بڑھی اور مجھ کو ان کے کیریکٹر کے مطالعہ کا اچھا موقع ملا۔ اس زمانہ میں منشی صاحب ''مادھوری'' کے علاوہ مطبع کی کچھ ٹیکسٹ بک بھی تیار کرتے تھے۔ جو شخص بڑے بڑے ناولوں کا مصنف ہو مختصر افسانہ نویسی میں ید طولیٰ رکھتا ہو اس کے متعلق چھوٹے بچوں کی کتابوں کی تیاری کی گئی۔ میں اکثر کہا کرتا تھا کہ دیکھئے گھوڑ دوڑ کا گھوڑا ایکے اور تانگے میں جتے تو کیسا چلے گا۔ انھیں ٹیکسٹ بکوں کی اردو کی نظر ثانی جب میرے متعلق کی گئی تو منشی صاحب نے کہا کہ مرزا صاحب۔ اب پھٹ سے جوڑی ہو گئی۔

جیسا میں نے اوپر ذکر کیا منشی صاحب کی خوش خلقی، نیک نفسی اور ہنسوڑ پن سے ان کے تمام ساتھی جو اس کمرہ میں بیٹھتے تھے بے انتہا خوش تھے۔ ان کے قہقہوں کی آواز سے کمرہ گونج جاتا تھا اور روشن ہو جاتا تھا۔ میرے نزدیک "BEAMING LAUGHTER" یعنی روشن کرنے والی ہنسی اسی کو کہتے ہیں۔ جب میں اپنی کتاب ''نوادر'' لکھ رہا تھا تو اس کے لطیفے کبھی کبھی ان کو بھی سناتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک مؤذن کا لطیفہ جو اذان دیتے وقت دور بھاگتا جاتا تھا اور جب اس سے پوچھا گیا کہ یہ کیا حرکت ہے تو جواب دیا کہ اپنے اذان کی آواز میں بھی سننا چاہتا ہوں کہ دور سے کیسی معلوم ہوتی ہے۔ اس لطیفہ کو سن کے مرحوم اتنا ہنسے کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میری کتاب ''نوادر'' (جو اس وقت ناتمام حالت میں تھی) کے بڑے معترف اور قدر دان تھے۔

ایک مرتبہ مالک مطبع منشی بشن نراین صاحب بھارگو مرحوم کے بعض ہوا خواہوں نے ان کو یہ سمجھایا کہ اسٹیٹ پر قرضہ کا بار ہے۔ اس کے کم کرنے کی ایک یہ صورت ہے کہ عملہ کی تنخواہ گھٹا دی جائے۔ چنانچہ اہلکاران بکڈپو و پریس کو جمع کیا گیا اور ایک صاحب نے نہایت معقولیت سے یہ تقریر کی کہ چونکہ اسٹیٹ پر بار بہت ہو گیا ہے تجویز ہے کہ آپ لوگ اپنی تنخواہوں سے تھوڑا تھوڑا تخفیف کرنے کی اجازت دیں۔ اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ اکثر جگہ ایسی حالت میں ایسا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ اسپیچ سن کر

میں نے مختصراً کہا کہ اگر یہ واقعہ صحیح ہے کہ اسٹیٹ اتنی زیر بار ہے کہ تخفیف کی ضرورت ہے تو کم سے کم میں اپنی تنخواہ اس وقت تک کہ قرضہ ادا ہو جائے، نصف کر دینے پر راضی ہوں اور اگر ایسا نہیں ہے یعنی تخفیف تنخواہ کا محض ایک بہانہ ہے تو میں ایک پیسہ بھی تخفیف کرانا نہیں چاہتا۔ منشی صاحب مرحوم نے میری اس صاف گوئی کی تعریف کی اور صاف کہہ دیا کہ میری بھی یہی رائے ہے۔ اس ادنیٰ واقعے سے منشی صاحب کی خودداری اور مستقل مزاجی ثابت ہوتی ہے۔

منشی بشن نراین صاحب کے انتقال کے بعد میں نے اپنی ملازمت فوراً ترک کر دی اسی کے تھوڑے ہی دن بعد منشی صاحب بھی وہاں سے علیحدہ ہو گئے۔

منشی صاحب کبھی کبھی منشی دیانراین صاحب نگم کی ہمراہی میں بھی غریب خانے پر تشریف لاتے تھے۔ اور اب تو چونکہ بے تکلفی ہو گئی تھی بہت دیر تک نہایت پُر لطف صحبت رہتی تھی۔

افسوس صد ہزار افسوس کہ مجھ سے اور ان سے اس پانچ چھ برس کے عرصہ میں ملاقات نہیں ہوئی مگر میں یہ سن کر بہت خوش ہوا تھا کہ وہ ایک معقول تنخواہ پر کسی ڈرامیٹک یا فلم کمپنی کے ڈرامہ نگار ہو گئے ہیں۔ ان کے انتقال کی خبر ایک اچانک تیر کی طرح میرے دل پر لگی۔ اکتوبر 1936ء کے پرچہ کلیم میں ایک اشتہار نظر پڑا تھا جس میں کسی ادبی کانفرنس کے سلسلہ میں داعیوں کی فہرست میں منشی پریم چند کا نام سب سے پہلے تھا۔ یہ کانفرنس اکتوبر ہی میں ہونے والی تھی۔ کس کو معلوم تھا کہ کانفرنس کا داعی اس کے اجتماع سے قبل ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہے گا۔ رہے نام اللہ کا۔

روحانیت

"یہ مادیت ہی ہمیں روحانیت کی طرف لے جائے گی۔ نظام زندگی کو خود مشیت کو پلٹا دیتی رہتی ہے"　　(پردہ مجاز)

مذہب

"مذہب کو تولنے کے لیے عقل اتنی ہی بیکار ہے جتنا بیگن کو تولنے کے لیے سونار کا کانٹا..... یا تو مذہب کی روشنی اتنی تیز ہے کہ عقل کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں یا پھر اس میں ایسی زبردست تاریکی ہے کہ عقل کو کچھ نظر ہی نہیں پڑتا۔"　　(چوگان ہستی)

آہ! منشی پریم چند

از مرزا فدا علی خنجرؔ لکھنوی

منشی پریم چند کی ناوقت موت پر جتنا غم کیا جائے کم ہے۔ منشی صاحب ہندوستان کے ان اقبال مند ادیبوں میں تھے جن کے ادبی کمالات کا اعتراف کرنے پر ان کے حاسد بھی مجبور تھے۔ یہی واحد خصوصیت ان کو ادب دانشا کی بلند ترین چوٹی پر پہنچانے کو کافی ہے۔ چہ جائے کہ تمام وہ خوبیاں جو مبداء فیاض نے ان کی فطرت میں فراہم کر دی تھیں۔ وہ ازل سے خالص ادبی ذوق لائے تھے۔ ان کی زندگی ابتدا سے انتہا تک اردو، ہندی زبان کی توسیع وترقی میں صرف ہوئی اور اب جب کہ وہ بزم ادب میں موجود نہیں تو یہاں کے چپہ چپہ میں ان کا ماتم بپا ہے۔

واقعی منشی صاحب عصر حاضر کے بہترین افسانہ نویس تھے۔ انھوں نے ذہن رسا کی مدد سے انسانی فطرت کی جیسی عدیم النظیر تصویریں کھینچی ہیں، اس کا جواب نہ اردو ادب پیش کر سکتا ہے اور نہ ہندی لٹریچر۔ انھوں نے حب وطن اور اخلاق واخوت کی سچی تعلیم دی ہے۔ اعلیٰ اور پست دونوں طبقوں کی خصوصیات پر بڑی کامیابی سے روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے عیوب ومحاسن نمایاں کرنے میں نہ کسی کی رعایت کی ہے اور نہ کسی سے تعصب برتا ہے۔ انھیں سیرت نگاری میں کمال حاصل تھا۔ وہ افسانے نہیں لکھتے تھے بلکہ اس پردے میں سماج کا حقیقی مرقع پیش کر دیتے تھے۔ جو نہ صرف نشاط روح کا باعث ہوتا تھا بلکہ حقیقت بین نگاہوں کے لیے عبرت آموزی کے اسباب بھی فراہم کرتا تھا۔ قدرت نے انھیں مذاق سلیم کے ساتھ ساتھ خوش طبعی اور زندہ دلی کا جوہر بھی عطا کیا تھا اس لیے ان کی تحریروں میں دل آویز شگفتگی اور حلاوت پائی جاتی ہے جو ان کے افسانوں کو اور زیادہ دل دلچسپ بنا دیتی ہے۔ ان کا تجربہ وسیع اور نظر غائر تھی، وہ زندگی کے تمام مسائل کو آسانی سے سمجھ لیتے تھے اور انھیں مقبول عام انداز سے بیان کر جاتے تھے۔ شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کے حقیقت نگار قلم نے سیرتِ انسانی کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا۔ مجھے عرصہ سے ان کا نیاز حاصل کرنے کی تمنا تھی اور جس قدر ان کے رشحاتِ قلم سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ اتنی

ہی یہ آرزو بڑھتی جاتی تھی۔ آخر یہ مراد اس وقت حاصل ہوئی جب بابو رادھے لال صاحب کپور جنرل منیجر منشی نولکشور نے 1924ء میں مجھے کلکتے سے طلب کر کے ناولوں کا صیغہ حوالے کیا۔ اور منشی پریم چند آنجہانی مادھوری آفس میں بلائے گئے۔

منشی صاحب بے حد خلیق، ہنس مکھ اور منکسر آدمی تھے۔ میں نے انھیں ہمیشہ مسکراتے ہوئے پایا۔ چونکہ پبلشنگ ڈیپارٹمنٹ میں میرا قیام 1928ء تک رہا اس لیے وقتاً فوقتاً منشی صاحب سے نیاز حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ جب انھیں کوئی کام نہ رہتا تو پبلشنگ ڈیپارٹمنٹ میں چلے آتے اور اپنی گل فشانیوں سے ہمارے تھکے ہوئے دماغ کو تازہ کر دیتے قلم کی طرح ان کی زبان میں بھی زور تھا۔ گفتگو بہت سلیس اور دلچسپ ہوتی کہ اس کے سننے کا دل سے اشتیاق ہوتا۔ لیکن فرائض کا خیال ان دل آویز صحبتوں کو دیر تک قائم نہ رہنے دیتا۔

وہ پرانی کہانیوں اور قصوں کے بے انتہا شائق تھے۔ اکثر راقم الحروف سے فرمائش کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ جب کبھی ان کے مذاق کے مطابق کوئی چھوٹی موٹی کتاب مل جاتی تو میں اسے ان کی خدمت میں پیش کر دیتا تھا۔ وہ خوش ہو جاتے اور نہایت ذوق سے پڑھتے۔ جب واپس کرنے لگتے تو اس کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرتے۔ یہ خیالات ان کی ناقدانہ قوت کا مظہر ہوتے۔

وہ ہر تصنیف پر گہری نظر ڈالنے کے عادی تھے۔ آج کل جن مضامین کو بے حقیقت سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ ان کے مطالعہ سے بہترین اور مفید نتائج اخذ کر لیتے تھے۔ نقد و تبصرہ ان کی طبیعت ثانی بن چکا تھا در اصل وہ اتنی صحیح رائے قائم کرتے تھے کہ کسی کو اس میں کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہ رہتی تھی۔ لیکن تنقید ہی ادب اردو کی وہ صنف ہے جس سے ہندوستانی بھڑ کتے ہیں کیونکہ وہ تعریف کے سوا کوئی کلمہ سننا پسند نہیں کرتے تاہم منشی صاحب کا یہ کمال تھا کہ زبانی اور تحریری تنقیدوں میں اتنا لطیف اسلوب بیان اختیار کرتے تھے جو طبائع پر گراں نہ ہوتا تھا۔ پڑھنے اور سننے والے اس میں تلخیوں کے بدلے حلاوت محسوس کرتے تھے۔

جس زمانہ کا تذکرہ لکھ رہا ہوں، ان دنوں میں نے اردو[1] کے ان پڑھ (اُمی) شاعروں کا ایک

---

[1] میں نے اردو کے اکثر بے پڑھے لکھے شاعروں کا تذکرہ قلمبند کیا ہے۔ ادب نواز حضرات سے ملتمس ہوں کہ جن صاحبان کو کسی اُمی شاعر کے حالات سے آگاہی ہو۔ وہ براہ کرم ان کے مختصر حالات معہ سنہ ولادت اور وفات کے مؤلف کو منیجر نامی پریس نامی پریس لین لکھنؤ کے پتہ سے سرفراز فرما کر شکر گذاری کا موقعہ دیں۔

تذکرہ قلم بند کرنا شروع کیا تھا کچھ مسالہ جمع کرلیا تھا۔ ایک مرتبہ بر سبیل تذکرہ اس کا ذکر آ گیا۔ منشی صاحب نے سنا تو اس کے دیکھنے کے شائق ہوئے اور تقاضا کیا کہ جس قدر حصہ لکھا جا چکا ہے مجھے دکھاؤ۔ ان کے اصرار اور تقاضوں سے مجبور ہو کر میں نے اسی طرح جا بجا سے کٹا پٹا مسودہ حاضر کر دیا۔ تقریباً آٹھ دس روز انھوں نے اسے اپنے پاس رکھا۔ پھر واپس کرتے وقت اس کے بابت نہایت حوصلہ افزا خیالات ظاہر کیے جن کا اعادہ ضروری نہیں۔ ساتھ ہی اپنی دستخطی تحریر بھی عنایت کرتے ہوئے فرمایا کہ اسے تذکرہ کے ساتھ شائع کر دیجیے گا۔ یہ تحریر جو 7رنومبر 1927ء کو عطا فرمائی گئی تھی ہنوز محفوظ ہے اور جب کبھی اس تذکرے کے چھپنے کی نوبت آئے گی تو انشاءاللہ زیب عنوان ہوگی۔ چونکہ اس تحریر سے بھی منشی صاحب کی تنقید نگاری پر تھوڑی بہت روشنی پڑتی ہے۔ اس واسطے اس کا وہ اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں جس کا تعلق اُتنی شعرا سے ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

> ''موزونیت ایک وہبی صفت ہے، جسے خدا نے یہ صفت عطا کی ہے۔ اسے عروض وقوافی کا منت شناس بننے کی ضرورت نہیں۔ علمیت اگر اس صفت کو حشو زوائد سے پاک، دائرہ نگاہ کو وسیع اور قوت بیان کو موثر کر دیتی ہے، وہاں شاعری میں تصنع اور آورد کا رنگ پیدا کر دیتی ہے۔ ان ای شعرا کے کلام میں شاعر کے اصلی جذبات نظر آتے ہیں اور اپنی بے ساختگی سے دل پر ایک خاص کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ اگر چہ ان شعرا نے اپنے زمانے کے اساتذہ کی تقلید کی ہے اور ان کا انداز بیان بھی وہی ہے لیکن ان کے موثر ترین اشعار وہی ہیں جو بندشوں کی قید اور ترکیبوں کی پیچیدگیوں سے پاک ہیں۔''

اس کے بعد سے تعلقات گہرے ہو گئے اور ان کی عنایتوں میں خلوص و یگانگت جھلکنے لگی۔ میرے متعدد افسانوں کو دلچسپی سے پڑھا اور ان پر آزادانہ رائے ظاہر کی۔ بعض افسانوں کی نسبت تو ایسی پسندیدگی کا اظہار فرمایا کہ مجھے غلط فہمی میں مبتلا ہو جانا پڑا اور یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ آپ مبالغہ فرماتے ہیں۔ لیکن یہ میری غلطی تھی جیسا کہ انھوں نے بعد میں ثابت کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ داد دینے میں وہ نہایت کشادہ دل واقع ہوئے تھے مضمون یا افسانے کا جو حصہ پسند آ جاتا تھا۔ خوب دل کھول کر تعریف کرتے تھے۔

افسوس! ان کی صحبت سے زیادہ عرصہ تک لطف اندوز ہونے کا موقع نہ مل سکا۔ اور مجھے بوجوہ جنوری 1928ء میں پبلشنگ ڈیپارٹمنٹ سے علیحدہ ہو کر کلکتے جانا پڑا اور کچھ عرصہ بعد منشی صاحب بھی علیحدہ ہو گئے۔ سالہا سال گزر گئے لیکن ملاقات تو ملاقات خط و کتابت کا بھی موقعہ نہ ملا۔ پھر جب ایک فلم کمپنی کی طلبی پر منشی صاحب بمبئی گئے اور ان کا پہلا افسانہ فلم بن کر مارکٹ میں آیا تو میں نے اس کے متعلق

چند استفسارات لکھ کر ان کی خدمت میں ارسال کیے۔ انھوں نے نہایت توجہ سے میرے تمام سوالوں کا تفصیلی جواب دیا۔ کاش! میری طویل علالت کے سلسلے میں وہ خط ضائع نہ ہو جاتا تو آج فلمی دنیا کے اکثر نکات ظاہر کیے جا سکتے تھے۔

اس بیان سے منشی صاحب کے وسیع اخلاق کو ظاہر کرنا مقصود تھا۔ کیونکہ وہ سب سے جھک کر ملنے اور خلوص سے پیش آنے کے خوگر تھے۔ یہی چیزیں ہیں جو احباب کے قلوب میں ان کی یاد کو ہمیشہ برقرار رکھیں گی اور اردو، ہندی ادب کا یہ خادم نہیں بلکہ محسن اعظم جہان ادب میں ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

تلقین عمل اور اصلاح

''بہشت'' ''دوزخ''

سورگ اور نرک کے خیال میں وہ رہتے ہیں جو کاہل ہیں، مردہ ہیں، ہماری دوزخ اور بہشت سب اسی زمین پر ہے۔ ہم اس دارِ عمل میں کچھ کرنا چاہتے ہیں۔

''نوک جھونک'' (پریم چند)

نظام سلطنت

''نظام سلطنت مشیت ایزدی کی ظاہری صورت ہے۔'' (لال فیتہ)

''پریم وہ پیالہ نہیں جس سے آدمی چھک جائے۔'' (پردہ مجاز)

پریم چند کے چند اوصاف

(از مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہاؔ بی، اے، ایل ایل۔ بی مصنف سیر المصنفین)

یہ اردو کی بدقسمتی ہے کہ منشی پریم چند جیسا افسانہ نویس آخر اکتوبر 1926ء کو صرف چھپن سال کی عمر میں داغ مفارقت دے گیا۔

اگر آپ کے حالات زندگی نظر غور سے دیکھے جائیں تو یہ ایک مثال اور سیکڑوں مثالوں میں شامل کرنے کے قابل ہے کہ اہل علم ہمیشہ مفلس اور تنگ حال رہتے ہیں۔ قدرت اس بارے میں فیاض نہیں ہے۔ وہ جس کو علم دیتی ہے۔ اس کو دولت نہیں دیتی۔ ایسی مثالیں بہت ہی شاذ ہیں کہ علم اور دولت دونوں کسی ایک شخص میں جمع ہوگئی ہوں۔ ماں کی شفقت سے وہ بچپن ہی میں محروم ہو گئے تھے اور والد ماجد بھی اُن کو آغاز شباب ہی میں چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ چنانچہ ذاتی مصارف کے علاوہ سوتیلی ماں بھائی اور ننہال کے بعض افراد کا بار کفالت بھی ان کے سر آپڑا تھا۔ تعلیم بھی تکمیل کو نہ پہونچی تھی کہ ان کو اپنا اور اپنے اقربا کا پیٹ پالنا ضروری ہوگیا۔ سنا ہے کہ سب سے پہلے پانچ روپیہ ماہوار کی ٹیوشن ملی اور اسی قلیل آمدنی میں وہ اپنی اور اپنے خاندان کی پرورش کرتے رہے۔ پہلی بیوی سے انھیں رنج پہنچا، گندم نما جو فروش احباب سے بھی سابقہ ہوا۔ بعض حضرات نے دھوکے دیے اور کچھ رقمیں وصول کر کے روپوش ہو گئے۔ ان تمام مصائب کے باوجود ان کے چہرہ پر کبھی شکن تک نہیں پڑی اور ان کی خوش مزاجی اور ہمدردی میں کوئی فرق نہ آنے پایا۔ ان کا ہنس مکھ چہرا اور ان کے مزاج کی شگفتگی برابر قائم رہی۔ دوست نوازی اور اولوالعزمی میں بھی کوئی کمی نہ ہوئی بلکہ عزت و شہرت کے ساتھ ساتھ ان کا نقطۂ خیال اور وسیع و کشادہ ہوتا گیا۔

کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ ایک چالاک نوکر گھر کا بہت کچھ اثاثہ لے کر چلا گیا تھا، بیوی کا زیور کئی سو روپیہ نقد، کچھ سرکاری کیش سرٹیفکٹ وغیرہ جو ایک صندوق میں بند تھے کارگزار ملازم لے کر غائب ہوگیا۔ سنا ہے کہ اس نقصان کے بعد بھی پریم چند جی اپنی معمولی خندہ پیشانی کے ساتھ اس واقعہ کا ذکر کیا

کرتے تھے۔ ان کی اہلیہ محترمہ نے بھی جو خود ایک قابل مصنفہ اور بڑی نیک سیرت اور بلند ہمت خاتون ہیں اس نقصان کا چنداں خیال نہیں کیا۔

واقعی ایسے نیک سیرت خوش اخلاق اور باکمال آدمی کی موت نہایت تکلیف دہ ہے۔ مجھ کو ذاتی طور پر ان سے نیاز حاصل نہیں تھا اور نہ میں افسانوں کے پڑھنے کا چنداں شوق رکھتا ہوں، لیکن ایک عرصہ سے رسالہ 'زمانہ' کی بدولت ان کے نتائج افکار کو دیکھتا رہا ہوں۔ اس لحاظ سے میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کی ابتدا اور ان کی انتہا کا حال مجھے معلوم ہے۔ غالباً اردو ادب میں یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے چھوٹے چھوٹے قصوں کے پیرایہ میں نہایت سادگی کے ساتھ دیہاتی زندگی اور ہماری روزمرہ کی ضرورتوں پر بہت ہی خوب لکھا ہے۔ وہ بادشاہوں اور امرا اور دولت مندوں کے قصے بیان نہیں کرتے بلکہ جو کچھ متوسط الحال طبقہ میں گزرتا ہے، اس کا نقشہ نہایت عمدگی کے ساتھ کھینچ دیتے ہیں۔ چونکہ ان کی تعلیم مکمل نہ تھی اور جو کچھ انھوں نے حاصل کیا وہ اپنے ہی شوق کا نتیجہ تھا، لہٰذا ان کی تحریرات میں معمولی الفاظ جگہ پاتے تھے۔ وہ ایک غریب گھر میں پیدا ہوئے اور ان کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لیے وہ متوسط الحال گھرانوں کے حال سے بخوبی واقف ہو گئے تھے۔ یہی دو چیزیں ان کا کمال تھیں اور انھیں دو چیزوں کی بدولت وہ کامیاب ادیب بن گئے۔ چونکہ قدرت کا منشا تھا کہ وہ اس قسم کے افسانہ نویس ہوں اس لیے قدرت نے ان کے ساتھ فیاضی نہیں برتی، اور ان کو مفلس گھرانے میں پیدا کیا۔ شاید وہ کسی امیر کے یہاں پیدا ہوتے تو اپنی زندگی اچھی بری طرح گزار کر مر جاتے اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی کہ دھنپت رائے کوئی شخص تھے۔ یہ اسی افلاس اور مصائب کا نتیجہ تھا کہ دھنپت رائے سے وہ منشی پریم چند ہو گئے، ایسا نام جس کی عظمت اور جس کی محبت ہم سب خدمت گزاران اردو کے دلوں میں جاگزیں ہے۔

پریم چند اور علامہ یوسف علی

علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب سابق ممبر انڈین سول سروس نے لندن سے ایڈیٹر 'زمانہ' کے نام ایک خط مورخہ 10 راپریل 1918ء میں لکھا تھا کہ آپ نے منشی پریم چند کی جو کتابیں میرے پاس بھیجیں اور ان کے حالات زندگی کی جو تفصیلات لکھیں ان کے لیے میں آپ کا بہت شکرگزار ہوں۔ جب آپ کی ان سے ملاقات ہو تو میری طرف سے ان سے کہہ دیجیے گا کہ میں اردو میں ان کے طرز تحریر کا بڑا مداح ہوں اور اگر وہ مجھے مشورہ کی اجازت دیں تو میں کہوں گا کہ انھیں ایسے ناول اور قصے لکھنا چاہئیں جن سے قومی جذبات کے نشو و نما میں مدد ملے، مگر جو فوق العادت واقعات سے پاک ہوں۔

پریم چند
ایک انسان و مصنف کی حیثیت سے

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری

بیس سال سے بھی پہلے کی بات ہے کہ جب میں نے پریم چند کو پہلی بار دیکھا تو میور سینٹرل کالج الہ آباد میں بی۔اے کا طالب علم تھا۔ 1916ء کے موسم گرما کی ایک شام کو ہماری ملاقات ایک وسیع عمارت کے برآمدے میں ہوئی جس میں اب امپیریل بنک کی شاخ گورکھپور کا دفتر ہے۔ مجھے اس وقت دہری خوشی ہوئی تھی، ایک مسرت تو پریم چند سے پہلی بار ملاقات کی تھی۔ اس پر اس خبر سے کہ اب مستقل طور پر میرے مکان کے پاس ہی وہ قیام پذیر ہوں گے مزید خوشی حاصل ہوئی۔ بہر کیف جس ملاقات کی اس روز ابتدا ہوئی اس نے جلد ہی ایک گہری دوستی کی شکل اختیار کر لی جس کا سلسلہ صرف ان کی ناوقت اور افسوسناک موت ہی کے بعد ٹوٹا۔

مجھے خوب یاد ہے کہ اس پہلی ملاقات کے دن مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ اتنے دنوں تک نہ ملنے سے مجھے کوئی نقصان ہوا ہے۔ میں پانچ چھ سال پہلے ہی سے جب میری عمر دس بارہ سال کی تھی پریم چند کے نام سے غائبانہ محبت کرنے لگا تھا۔ اس لیے اب جب ان سے دوبدو ملاقات کی نوبت آئی مجھے اس بات پر دلی افسوس ہوا کہ میں اتنے دنوں تک ان سے ملاقات کیے بغیر کیوں رہا۔ میں اسکول ہی میں پڑھتا تھا، جب میں نے ان کی پہلی کہانی ''زمانہ'' میں پڑھی تھی لیکن اس کا اثر اب تک محو نہ ہوا تھا۔ گھریلو زندگی کے سین اور بیانیہ نثر کی پرتاثیر قوت جس کی بدولت روزمرّہ زندگی کے مانوس اور معمولی مناظر متشکل ہو کر چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ یہ میرے لیے ایک نیا ذہنی تجربہ تھا، گو میں اس وقت سنِ تمیز کو بھی نہ پہنچا تھا لیکن مجھ پر اس سیدھی سادی کہانی کا ایک عجیب نرم و نازک اثر پڑا۔

پریم چند کے یہاں میری روزانہ کی آمد و رفت شروع ہوگئی۔ گرمی کی چھٹیوں میں ہر روز میری

شام ان کے ساتھ بسر ہونے لگی، جو وقت ان کے لطف صحبت میں گذرتا تھا وہ بڑا سکون بخش، سبک سیر اور تیز رو ہوتا تھا، آج جب میں ان اوقات کا خیال کرتا ہوں تو ان کی پُر خلوص انسانیت، ان کے زندگی کا اطمینان بخش پُر سکوت توازن، ان کے اعلیٰ تخیل اور کمال فن کی یاد میرے حافظے میں ابھی تک باقی ہے۔
پریم چند طبعاً بہت سادگی پسند تھے۔ ان کے مزاج میں نام کو بھی بناوٹ نہ تھی۔ اب میں ذہنی حیثیت سے ایک نظر بازگشت ڈالتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں بالکل نامحسوس طور پر ان سے اس قدر جلد ایسا بے تکلف ہوگیا۔ میں کیا دراصل ہر شخص جسے ان سے معمولی سے معمول تعارف ہوگا، اپنی جگہ پر یہی محسوس کرے گا۔ آج میں ایک ایسے دوست کا ماتم کر رہا ہوں، جس کی ذات سے خود دوستی کو عزت حاصل تھی۔
جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے ان سے پہلی دفعہ ملنے کے بعد مجھے اس بات کا افسوس ہوا تھا کہ میں پہلے ان سے کیوں نہ مل سکا۔ آج میں ان کے پرانے دوستوں میں اپنے کو تنہا پاتا ہوں البتہ "زمانہ" کے نامور ایڈیٹر منشی دیا نراین نگم کو مجھ سے بھی زیادہ دنوں سے پریم چند کو جاننے کا فخر حاصل ہے۔ ان کا غم اور ان کا نقصان مجھ سے بھی سوا ہے۔

ہماری گفتگو مختلف موضوعات پر ہوتی، اور ختم ہونا جانتی ہی نہ تھی۔ پریم چند کا دماغ بڑا متجسس اور مشتاق تھا! مگر ہماری بات چیت زیادہ تر زندگی اور ادب کے مسائل کے متعلق ہوتی تھی۔ پریم چند میں خود بینی نہ تھی، یہاں تک کہ جب ان کی تصانیف کی عالم گیر مقبولیت اور لاکلام عظمت کا ذکر ان کے سامنے کیا جاتا تھا تو وہ گھبرا سے جاتے تھے۔ انھیں اپنے متعلق بات کرنے کی عادت نہ تھی اور نہ بار بار کسی اور سے اپنی تعریف سننے کے آرزومند رہتے تھے۔ حالانکہ "اعلیٰ دماغوں کی یہ آخری کمزوری" اہل قلم اور صاحبان فن میں ابھی ناپید نہیں ہے، لیکن بات چیت کی رو میں کبھی کبھی نامعلوم وقفوں کے بعد اور بالکل غیر مربوط طریقہ پر وہ اپنی زندگی کے بکھرے ہوئے واقعات کو اشارتاً بیان کر جاتے تھے۔ یوں تو وہ اپنے متعلق مشکل سے صرف چند ہی جملے کہتے تھے لیکن چند لفظوں ہی میں خدا معلوم کتنا بیان کر جاتے تھے۔ میں ان واقعات کو کسی قدر ترتیب کے ساتھ لکھنے کی کوشش کروں گا۔

پریم چند کے والد نے ضلع بنارس کے موضع پانڈے پور میں تھوڑی سی کاشتکاری وراثتاً پائی تھی۔ وہی ان کا آبائی وطن تھا، جہاں پریم چند نے ایک چھوٹا سا خوبصورت مکان بنالیا ہے۔ کاشتکاری کی آمدنی قریب قریب نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس لیے ان کے باپ نے ڈاک خانہ کی نوکری کر لی تھی جہاں ترقی کر کے غالباً وہ کسی چھوٹے سے ڈاک خانہ کے ڈاک منشی ہوگئے۔ اس طرح ان کا گھر اور خاندانی روایات اوسط طبقہ کے اس درجہ کی روایات کا نقشہ پیش کرتے ہیں جسے انگریزی مصنف جارج گسنگ

(GEORGE GISSING) نے اپنے اوراق میں غیر فانی بنا دیا ہے۔

اس طبقہ کے دوسرے لڑکوں کی طرح پریم چند بھی ایک ہائی اسکول میں داخل ہوگئے اور ان کی تعلیم ابتدائی درجوں کو چھوڑ کر گورکھپور کے ایک اسکول میں شروع ہوگئی جہاں ان کے والد ملازم تھے۔ پریم چند نے مجھ سے بتایا کہ لڑکپن میں ان کی دوستی اپنے درجہ کے ایک لڑکے سے ہوگئی جو ایک تمباکو فروش کا بیٹا تھا۔ روزانہ وہ اپنے کم عمر دوست کے ساتھ اسکول کے بعد اس کے مکان پر جاتے تھے۔ وہاں تمباکو کے بڑے بڑے سیاہ پنڈوں کے پیچھے تمباکو فروش اور اس کے احباب بیٹھ کر برابر حقہ پیتے اور طلسم ہوشربا پڑھتے تھے۔ یہ کبھی نہ ختم ہونے والی طولانی کہانی ہے جو اپنی طوالت، وسعت اور مختلف النوع قصوں کے لحاظ سے یورپ کے عہد وسطی کے رومانی افسانوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیتی ہے۔ اس کی طوالت کا یہ حال ہے کہ اس کا حجم کم و بیش ''انسائیکلو پیڈیا برٹینکا'' کے برابر ہوگا۔ غرض یہاں پریم چند اپنے کمسن دوست کے ساتھ بیٹھ کر ''طلسم ہوشربا'' کے افسانے سنتے، یہاں تک کہ شام ہو جاتی جب وہ اپنے گھر چلے جاتے۔ یہ سلسلہ تقریباً ایک سال جاری رہا لیکن اسی اثناء میں پریم چند ہمیشہ کے لیے رومانی کہانیوں میں ڈوب گئے درحقیقت ان قصوں کو جس دلچسپی اور اشتیاق سے انھوں نے سنا تھا اس سے ان کے قوت بیان میں روانی اور وضاحت کے انداز جذب ہوگئے اور ان لذیذ حکایتوں کی روح ان میں تحلیل ہوگئی۔ کچھ دنوں کے بعد یہی قوتیں پریم چند کی تصانیف میں کس حسن سے پھلی پھولیں۔

پریم چند کے والد کا انتقال اس وقت ہوا جب ان کی عمر مشکل سے چودہ سال کی ہوگی۔ اس وقت وہ بنارس کے ایک ہائی اسکول میں آٹھویں یا نویں درجے میں پڑھ رہے تھے۔ ان کی ماں تقریباً آٹھ سال پہلے مر چکی تھیں۔ پریم چند اپنے سوتیلی ماں اور سوتیلے بھائی کے ساتھ اس دنیا میں تنہا رہ گئے۔ دونوں ان کے بعد بھی بقید حیات ہیں۔ اب انھیں زندگی کے سخت ترین امتحان اور بے انتہا تکلیف دہ آزمائش سے گذرنا پڑا۔ پریم چند نے اپنے ایک افسانہ میں پُر اثر اور زہر میں بجھے ہوئے نشتر کی طرح الفاظ میں اپنی زندگی کے ان لمحات کی طرف اشارہ کیا ہے جو انھوں نے اپنے والد اور سوتیلی ماں کے ساتھ بسر کیے اور جس وقت ان کی عمر پانچ چھ سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس افسانہ کا عنوان ''سوتیلی ماں'' ہے اس کی نزاکت اور عظمت میں خاموش مگر تیز تلخیاں بھی ہیں۔ لیکن کہیں اس میں بے مزہ اور اوچھے جذبات کی ترجمانی نہیں ہے۔ اسے پڑھیے مشکل سے آپ اپنے آنسو روک سکیں گے۔

باپ کے مرنے کے بعد پریم چند کو طالب علمی کے زمانہ میں کام کی جستجو ہوئی۔ ان نایاب لمحات میں جب وہ مجھے اپنا راز دار بنا لیتے تھے۔ انھوں نے ایک دفعہ نہایت سکوت افزا لہجہ میں۔ جس میں ایک

خفیف سی لرزش بھی تھی، مجھ سے بتایا کہ کس طرح وہ چھ روپیہ مہینہ میں اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے تین میل پیدل پڑھانے جایا کرتے تھے۔ یہ میری یادداشت کا نمایاں مگر دردناک واقعہ ہے۔ کم سے کم ایک بار ان کے اتفاقیہ مگر سنجیدہ بیان میں تختی و نرمی دونوں ایک ساتھ مل گئی۔ مگر یہ کتنا معصوم اور فطری واقعہ تھا! پریم چند کا شمار بہت تندرست لڑکوں میں نہ تھا۔ اس لیے محنت کر کے اور پیٹ کاٹ کر انھوں نے ہائی اسکول کا امتحان دوسرے درجہ ہی میں پاس کیا۔

زیادہ دن نہ گذرے کہ وہ سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ اب پریم چند آسانی سے اپنا اپنی سوتیلی ماں اور سوتیلے بھائی کا بار اٹھا سکتے تھے۔ ان کی شادی بھی ہو چکی تھی لیکن وہ نہایت ناموزوں اور ناخوشگوار ثابت ہوئی۔ بیوی سے الگ رہ کر کئی سال تک تن تنہا دن گذارتے رہے مگر اس کے مرنے تک (جسے تقریباً پندرہ سال ہوئے) مستقل طور پر کچھ روپیہ خرچ کے لیے بھیجتے رہے۔ اسی درمیان میں ایک بیوہ خاتون، شیورانی دیوی سے شادی کر لی، یہ باہمت اور وفاپرست رفیق حیات ان کے تین بچوں، ایک لڑکی اور دو لڑکوں کی ماں بنی اور خوشی کی بات ہے کہ آج وہ اور ان کے تینوں بچے موجود ہیں۔ مرحوم کے ہزار ہا قدردانوں اور محبت کرنے والوں کی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں۔ پہلی بیوی کی موجودگی میں ایک بیوہ عورت سے دوسری شادی اپنی دلی کیفیات کا پورا جائزہ لینے کے بعد خاموشی سے کی گئی تھی۔ یہ شادی کسی خاص جذبہ کا نتیجہ نہ تھی اور نہ ہم اسے عاشقانہ شادی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ رشتہ ان کے لیے ایک دلیرانہ قدم تھا گو اس میں اس میں کسی قسم کا جوش و خروش شامل نہ تھا۔

سب ڈپٹی انسپکٹری مدارس ہی کے زمانے میں ان کے افسانہ نگاری کی ابتدا ہوئی، انھوں نے چار پانچ افسانے اردو میں لکھے جو تیس سال ہوئے ایک مختصر سی کتاب کی شکل میں "سوزِ وطن" کے نام سے زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوئے۔ پریم چند اور ان کے متبعین نے اردو ہندی زبان میں افسانہ نویسی کو اس بلند مقام پر پہونچا دیا ہے جہاں آج ہم اسے دیکھتے ہیں۔ عصر حاضر کی بہترین تصانیف کی چمک کی روشنی اس کتاب کی ہلکی اور دھیمی روشنی کو سایہ میں ڈال دے گی مگر وہ تاریخ افسانہ نگاری میں ایک رفیع نشاں ہے۔ وطن پرستی کا شریف جذبہ ان صفحات میں سانس لے رہا ہے، ان کہانیوں میں کوئی بات قابل اعتراض نہیں ہے۔ وہ نہایت اطمینان سے لڑکے اور لڑکیوں کی درسی کتابوں میں داخل کی جا سکتی ہیں۔ لیکن تیس برس پہلے کی دنیا اور تھی! باخبر اور خائف عمال حکومت نے مصنف سے باز پرس کی۔ میری ان کی ملاقات کو زیادہ دن نہ گذرے تھے، جب انھوں نے اپنے بے تکلف اور صاف طرز میں مجھ سے بیان کیا کہ انسپکٹر مدارس نے انھیں کس طرح اپنی تصنیف کی پانچ سو جلدوں میں آگ لگا دینے پر مجبور کیا۔

ان کی تصانیف کا سلسلہ جاری ہوگیا اور اگر میں ان حالات کا ذکر کروں جن کے ماتحت ان کی زیادہ تر کتابیں لکھی گئیں تو یہ مضمون اپنے حدود سے بڑھ جائے گا۔ کچھ ناول متوسط حجم کے ان کے قلم سے نکلے اور انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوئے۔ انھیں دنوں میں ان کے مختصر افسانوں کا سلسلہ بھی شروع ہوا جو ان کے انتقال تک دوسو کی غیر معمولی تعداد تک پہنچ گئے۔

اس مجموعہ کی اشاعت ہندوستانی افسانہ نویسی کی تاریخ میں ایک خاموش انقلاب تھا جس کے تنہا علمبردار پریم چند تھے اور جو صرف ان کی آواز پر ترقی کرتا چلا جارہا تھا۔ موجودہ طریقہ تعلیم نے اپنی شان و شکوہ اور چمک دمک کے باوجود ہمیں ایک غیر تعلیم یافتہ قوم بنا رکھا ہے۔ یہ شیریں خواب کہ ہندستان کا انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ یا اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ کبھی انگریزی زبان میں کوئی قابل قدر چیز لکھ سکے گا۔ یا انگریزی اور دوسری یوروپین زبانوں کی قدر دانی اور لذت کشی کبھی اس کا قومی مذاق بن سکے گی محض خواب اور خیال باطل ہے اس زعم ناحق نے ہم کو اپنی زبانوں میں بھی کوئی قابل قدر تصنیف پیدا کرنے یا اپنے ادب کی قدر دانی کی صلاحیت رکھنے کے قابل بھی نہ رکھا۔ غرض ان حالات میں پریم چند نے اپنا تخلیقی کام شروع کیا در حقیقت وہ دو دنیاؤں کے بیچ میں تھے۔ جن میں سے ایک تو سردہ ہوچکی تھی مگر دوسری کسی طرح پیدا ہونے کے لیے تیار نہ تھی۔ ایک عرصہ تک پریم چند کو وہ اخلاقی سرپرستی اور ہمدردی بھی نصیب نہ ہوئی جو ہمارے سربرآوردہ انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانی کبھی کبھی دیسی زبانوں کے خادمان ادب سے برتتے ہیں۔ وہ اس قابل نہ سمجھے گئے کہ ہمارے اعلیٰ طبقہ کے معززین انھیں اپنے ڈرائنگ روم میں ملاقات کی دعوت دیتے۔ غالباً انھوں نے ان کا نام کہیں سن لیا ہوگا یا زیادہ سے زیادہ ''زمانہ'' کی فہرست مضامین میں ان کے نام پر ان کی نظر پڑ گئی ہوگی بہرحال یہاں اس معاملہ کو طول دینا فضول ہے۔

پریم چند برابر لکھتے رہے اور اہل نظر کے ایک مختصر سے حلقہ میں ان کی تصانیف کی قوت تاثیر اور خوبیاں مقبول ہونے لگیں۔ لیکن اس سے انھیں کوئی مالی نفع حاصل نہ ہوا البتہ دس سال کے عرصہ میں ''زمانہ'' کے شائع ہونے والے افسانوں کی بدولت انھیں اردو افسانہ نگاروں میں مسلم الثبوت استاد کا درجہ حاصل ہوگیا۔ جس پہلی ملاقات کے ذکر سے یہ مضمون شروع ہوا ہے وہ اسی زمانہ میں ہوئی، اب وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں گورنمنٹ نارمل اسکول گورکھپور میں سکنڈ ماسٹر کی حیثیت سے آئے تھے۔ اس اثناء میں ان کی شہرت اس ملک کے تعلیم یافتہ اور علم دوست طبقہ کے علاوہ باہر بھی اچھی طرح قائم ہوچکی تھی۔ اور اس میں ہر روز اضافہ ہی ہورہا تھا۔ اب انھوں نے ہندی میں بھی لکھنا شروع کردیا تھا۔ اور قدر

۱ تین سو سے اوپر (مانک ٹالا)

دانان ہندی کے وسیع دائرہ نے ان کا بڑی تپاک سے خیر مقدم کیا اور انھیں فن افسانہ نویسی کے ماہر سمجھنے لگے۔ ہندی رسالوں اور کتب فروشوں نے ان کے مضامین اور کتابوں کا معقول معاوضہ دینا شروع کیا۔ اردو میں انھیں جو کچھ ملتا تھا وہ نہ ملنے کے برابر تھا۔ اب ان کی شہرت ہندوستان کے دوسرے حصوں تک بھی پہنچی اور ان کی کہانیاں بنگالی، گجراتی مرہٹی، تامل اور دوسری جنوبی زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہونے لگیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جاپان میں بعض ہندوستانی اہل قلم نے ان کی کہانیوں کا جاپانی زبان میں بھی ترجمہ کر کے انھیں وہاں شائع کرایا ہے۔ کچھ دن ہوئے یہ بھی سننے میں آیا کہ مسٹر ی۔ ایف اینڈ ریوز پریم چند کی بعض کہانیوں کے انگریزی ترجمہ کی نظر ثانی کر رہے ہیں۔ جو انگلستان میں شائع ہونے والے تھے۔ بعض احباب نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ ان کے بعض تصانیف کے ترجمے یورپ کی دوسری زبانوں میں بھی ہوئے ہیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈیو ہرسٹ (PROF. DEW HURST) نے ایک مرتبہ پریم چند کو لکھا تھا کہ ان کی تصانیف بہت بلند پایہ اور ہندوستانی ادب کے صف اول میں جگہ پانے کی مستحق ہیں۔ تجربہ کار عالم و نقاد ادب مولانا شبلی نے بھی ایک بار یہ رائے ظاہر کی تھی کہ سات کروڑ مسلمانوں میں کوئی شخص پریم چند کی سی لطیف اور سنواری ہوئی نثر نہیں لکھتا۔ پنجاب کے ہر طبقہ کی عورتوں میں، چاہے وہ کسی راجہ کے محل میں ہوں یا ساہوکاروں کے یہاں، اعلیٰ حکام کے یہاں ہوں یا تجارت پیشہ جماعت کے گھروں میں، پریم چند کی تصانیف پڑھنے کا ایک خاص اشتیاق ہو گیا ہے۔ اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ کم از کم ہماری عورتوں کے (جو ابھی تک موجودہ طریقہ تعلیم سے زیادہ مستفیض نہیں ہوئی ہیں) دماغی تجسس کی دھار کند نہیں ہوئی ہے۔ بہر حال امر واقعہ یہ ہے کہ جہاں کہیں ہندی، اردو پڑھی جا سکتی ہے، خدمت گار، خانساماں، معمولی پڑھی لکھی عورتیں، بچے، گاؤں کے مدرس، زمیندار اور کاشت کار جب کبھی ان کے ہاتھ پریم چند کا کوئی افسانہ یا قصہ لگ جاتا ہے تو وہ سب ہمہ تن متوجہ ہو کر اس میں غرق ہو جاتے ہیں۔

پریم چند اب مستقل طور پر ناول نویسی کی طرف متوجہ ہو گئے اور قریب قریب ہر سال ایک گراں قدر ناول دنیا کے سامنے پیش کرنے لگے۔ ان کی تا وقت موت تک کم و بیش ان کے دس ناول شائع ہو چکے ہیں۔ میں ان کی تصانیف کے متعلق ذرا آگے چل کر دو ایک باتیں بتاؤں گا۔ جب میں پہلی دفعہ ان سے ملا تو وہ ایک مدرس کی حیثیت سے پرائیویٹ طور پر، انٹرمیڈیٹ کا امتحان دوسرے درجہ میں پاس کر چکے تھے اور 1919ء میں جب وہ اپنے حوصلہ خیز ناول "پریم آشرم" (جو اردو میں "گوشۂ عافیت" کے نام سے شائع ہوا ہے) کے لکھنے میں مشغول تھے تو مدرسی اور سپرنٹنڈنٹ بورڈنگ ہاؤس کی خدمتیں انجام

دیتے تھے۔ انھوں نے اسی رواداری میں بلا زیادہ محنت کیے ہوئے دوسرے درجہ میں بی۔ اے کی ڈگری بھی لے لی حالانکہ انھوں نے تمام عمر طالب علم کی حیثیت سے کسی کالج میں پاؤں تک نہیں رکھا۔

تھوڑے دنوں بعد پریم چند نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا، آج وہ یقیناً اپنے محکمہ میں کافی ترقی کر چکے ہوتے اور ان کا شمار صوبہ کے تعلیمی افسروں میں ہوتا مگر 1919ء کے ترک موالات میں جب ان کی عمر تیس سال سے کچھ زیادہ ہو چکی تھی، میرے یو پی سول سروس کی ملازمت ترک کرنے کے چند ہفتوں بعد وہ بھی سرکاری ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے۔ اس وقت ان کے پاس کچھ روپیہ بھی جمع ہو گیا تھا۔ کیونکہ ان کی زندگی نہایت سادہ اور باکفایت تھی، وہ اپنے ابتدائی زندگی میں تختی کے دور سے گزر چکے تھے۔ اور تمام عمر بغیر محسوس کیے ہوئے ایسی فقیرانہ زندگی بسر کرتے رہے جس میں نہ خشکی تھی نہ ایذا طلبی۔ نہ خود پرستانہ پاکبازی تھی اور نہ زاہد خشک کا تعصب۔ یہاں بھی ان کی معصومیت اور عہد طفلی کی سی سادگی میں دھوکا نہ ہو سکتا تھا اور اسی خصوصیت نے ایک مقناطیسی کشش کی طرح نہایت خاموش اور بااعتماد طریقہ پر مجھے ان سے بہت قریب پہونچا دیا تھا۔ دراصل ان کے ملنے والوں میں کوئی شخص اس کشش سے بچ نہ سکتا تھا۔ ان کی شخصیت میں نرم رو ہواؤں کی تازگی، دوشیزگی اور اچھوتا پن تھا۔ وہ ہمیشہ انسانیت سے نزدیک اور ظاہرداری سے دور رہتے تھے۔

انھیں سولہ برس اور زندہ رہنا تھا۔ بنارس میں انھوں نے سرسوتی پریس قائم کیا اور اپنے گاؤں میں ایک پکا مکان بھی بنوایا، یہیں وہ اپنی زندگی کے باقی دن گذار دینا چاہتے تھے مگر یہ ممکن نہ ہوا اور وہ وہاں مشکل سے تھوڑے دنوں رہ سکے۔ مگر یہ ان کے مختصر اور اتفاقی قیام کے زمانہ میں یہ جگہ تمام ہندوستان سے ان کے قدردانوں اور شاگردوں کی آمد و رفت کی بدولت ایک طرح کا مقدس مقام بن جاتی تھی۔ اس جملے کو اگر وہ خود سنتے تو تعجب اور خوش ہو کر پریشان ہو جاتے۔ ہندوستان میں مضمون نگاری اور صحافت کے ذریعہ کوئی مستقل آمدنی ہونا یا دیانتداری سے اپنی زندگی کے لیے کچھ پیدا کر لینا ناممکن ہے۔ یہاں لوگوں کو کتابیں پڑھنے کا تھوڑا بہت شوق ہے لیکن کتاب کون خریدتا ہے؟

ترک موالات کے زمانے میں متعدد قومی اسکول قائم ہو گئے تھے۔ چنانچہ پریم چند کو بھی کچھ عرصہ کے لیے کاشی ودیاپیٹھ میں پرنسپل کی خدمت انجام دینی پڑی، چار پانچ سال تک وہ ہندی کے رسالہ مادھوری کے مدیر اعلیٰ بھی رہے اور ایک سال سے بھی کم مدت کے لیے بمبئی کی ایک ہندوستانی فلم ساز کمپنی کے لیے ڈرامے لکھتے رہے جس سے انھیں ہزار روپیہ ماہوار کے قریب ملتا رہا۔ یہ باتیں غیر مسلسل اور بے

فروری 1921ء (مانک لال)

ترتیب طور پر واقع ہوئیں۔ جب ملازمت کا سلسلہ نہ رہا تو وہ اپنا ذاتی پریس چلاتے رہے جس سے ان کے کئی ناول اور مختصر افسانوں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے مگر پریس میں انھیں بالآخر عظیم نقصان اٹھانا پڑا۔ ایک ہندی ہفتہ وار اخبار کے علاوہ انھوں نے "ہنس" نامی رسالہ بھی نکالا جو اب تک استقلال کے ساتھ شریمتی شیورانی دیوی کی ادارت میں نکل رہا ہے۔ گذشتہ اکتوبر میں دو مہینہ کی سخت اور جاں گداز علالت کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ میں نے دسہرہ کی تعطیل میں ان کے آخری دیدار کا ارادہ کیا تھا لیکن ان کی موت کی خبر چھٹیاں شروع ہونے سے پہلے ہی مل گئی!

ملک کے بہت سے سربرآوردہ لوگوں نے جن میں ان کے ادبی رفیق کار اور شاگرد بھی تھے۔ ان کے گھر جا کر ان کے علالت کے زمانے میں انھیں دیکھا جہاں ان کی بیوی قابل قدر ہمت و محبت کے ساتھ ان کی تیمارداری میں مشغول تھیں۔ ان سبھوں نے پریم چند کو بیماری میں بھی ویسا ہی سادہ دل، معصوم اور خوش مزاج پایا، ان کے مردانہ چہرے پر آخر تک ایک فن کار کی حقیقی جھلک نمایاں تھی۔ لیکن ان کی صحت اس طرح اکھڑ چکی تھی کہ زندگی کی کوئی امید باقی نہ رہی تھی۔ پھر بھی وہ بظاہر اپنی بیماری کی اہمیت سے بے خبر رہنا چاہتے تھے۔ ان کے دماغ میں اب بھی خیالات کی فراوانی تھی انھوں نے نئی تصنیفوں کی کارآمد اسکیموں کا تذکرہ کیا، ان کی گفتگو اسی طرح فطری، پرجوش اور رواں تھی اور اس میں برابر بذلہ سنجی، مزاح کی بے ساختگی، تفکر اور لطافت کے اثرات منعکس ہو رہے تھے۔ صرف وہ نہ بھولنے والے بے اختیار قہقہے جو کبھی کبھی چیزوں کا مضحکہ انگیز رخ دیکھ کر بلند ہوتے تھے اب پہلے سے کم اور کمزور ہو گئے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ تھکا ہوا جسم موت کے پرسکون آرام گاہ کی طرف جا رہا ہے، اور اب وہ ان بے پروا طفلانہ قہقہوں کے قابل نہ رہا تھا۔ جو ان کے ملنے والوں کے نزدیک ان کی شخصیت کا جز و ہو گئے تھے بہر حال وہ کام کرتے ہوئے جئے اور کام کرتے ہوئے مرے اور جب انجام آیا تو اسی سکون اور نرمی کے ساتھ آیا جو ان کی اکثر کہانیوں کے آخری حصوں میں نمایاں ہے۔

آج سے تقریباً تیس سال پہلے جب پنڈت رتن ناتھ سرشار کا انتقال ہوا تو جہاں تک مجھے یاد ہے، سر تیج بہادر سپرو نے اپنے گراں قدر اور پر اثر تعزیتی مضمون کے ابتدائی جملوں میں (جو "ہندوستان ریویو" میں شائع ہوا تھا) اس فخر روزگار ادیب کے متعلق لکھا تھا کہ سرشار کا جادو نگار قلم اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔ واقعی یہ بالکل درست تھا۔ واقعی یہ بالکل درست تھا۔ فسانہ آزاد کی طویل داستان میں واقعات مکالمہ، ظرافت اور مزاح کا جو سلسلہ تقریباً چار ہزار صفحات پر پھیلا ہوا ہے، کوئی سحر آفرینی نہ در ہے لیکن اس میں غیر حقیقی طلسم بندی بھی ہے۔ لکھتے ہیں کہ سرشار نے خوجی کا کیریکٹر سروانٹیز

(CERANTES) کی ڈان کوئکزوٹ (DON QUIXOTE) کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ لیکن کوئکزوٹ اپنی مضحکہ خیز افراط و تفریط کے باوجود حقیقی اور شجاعت کی غیر فانی روح کی نمایندگی کرتا ہے۔ سرشار کی تصنیف اپنے مصنف کی ناقابل انکار کمال فن کے باوجود ایسی چیز پیش کرتی ہے جو ظاہری وجود کے اعتبار سے کوئی مستقل حقیقت نہیں ہے، بلکہ عالم خواب کی ایک نمایاں قلمی عکاسی تھی۔ فسانہ آزاد لکھنؤ کے زوال پذیر اور جلد مٹنے والے شیعہ امرا و روسا کے مشاغل زندگی کا دلکش مرقع ہے۔ سرشار کی پُرسکون ذہانت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے زور قلم سے اس سایہ کی طرح غیر حقیقی دنیا کو لافانی بنا دیا ہر ملک اور ہر زمانہ کی رئیسانہ زندگی میں ایک طرح کے غیر حقیقی طلسم کی کشش ضرور ہوتی ہے۔ سرشار نے اسی تکلف و تصنع کی زندگی کے نظر فریب نقوش کو فسانہ آزاد کے صفحات میں اپنے ساحرانہ قلم سے کچھ اس طرح منقش کر دیا ہے کہ ناظرین کے لیے اس کا ہر صفحہ ایک جادو کے محل کی کھڑکیوں کی طرح معلوم ہوتا ہے جو عالم خواب میں کھلتی اور دعوت نظارہ دیتی ہیں۔

''جادو نگار قلم'' کا خطاب پریم چند کے لیے کچھ زیادہ موزوں نہ ہوگا درحقیقت ان کے ہر صفحہ میں ہندوستانی تہذیب کے نشاۃ ثانیہ کے پہلے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ ان کی کتابوں میں اجتماعی زندگی کے تمام لافانی مستقل و مستحکم تاثرات میں از سر نو روح پڑ گئی۔ ہندوستان کے قدیم تاریخی تمدن اور اس کی طوفان بیداری کی یہ پہلی دھیمی کروٹیں تھیں جو ان کے قلم سے کہانیوں کی شکل میں ظاہر ہوئیں۔

اس طرح کی کوئی چیز بنکم چندر چٹرجی، ربیندر ناتھ ٹیگور، سرت چند چٹوپادھیا اور دوسرے بنگالی اہل قلم نے بھی دنیا کے سامنے پیش نہیں کی ان سب کی ناول اور کہانیاں اپنی تمام گہرائی اور قوت کے باوجود زیادہ تر جذباتی، داخلی اور رومانی ہیں اور اکثر اپنی ضرورت سے زیادہ باخبری کی وجہ سے نثر کے افسانوں کا صحیح نمونہ نہیں ہو سکتے۔ اسی وجہ سے میرے نزدیک پریم چند کی تصانیف ہندوستانی افسانہ نگاری میں ایک انقلاب عظیم کی بانی ہیں کیونکہ ان میں ادبی خصوصیات کے پہلو بہ پہلو ہمہ گیری اور وسعت، توازن اور حقیقت، جوش اور متانت بھی کچھ موجود ہے۔ وہ جذبات کو پیش کرتے وقت بال کی کھال نہیں نکالتے لیکن ان کی نثر میں زندگی کی تڑپ موجود ہے میں پھر ایک دفعہ اپنے خیال کو تیس برس پیچھے لیے جاتا ہوں جب میں نے ان کی ایک کہانی پڑھی تھی، اس وقت میری عمر مشکل سے دس بارہ سال ہوگی۔ اس وقت میں دنیا میں بچوں کے لئے جو ادب موجود ہے اس کا خیال کرتا ہوں۔ حکیم ایسپ کی کہانیاں (AESOP'S FABLES) اس سے پہلے کی کتاب ہتوپدیش، الف لیلیٰ، گرم اور اینڈرسن کے دور پری کے قصے (FAIRY TALES OF GRIMM AND ANDERSON) جی۔ اے

ہنٹی (G.G.HENTY) کی تصانیف اور دوسری بہت سی کتابیں میرے پیش نظر ہیں۔ اگر چہ ان میں سے کئی گراں قدر تصانیف ہیں۔ لیکن یہ سوچ کر میں دھک سے رہ جاتا ہوں کہ ادب کی لطیف روح اور رنگینی، حقیقت کی جھلک اور نازک احساسات کا اظہار اور وہ بسی ہوئی تاثیر جو پریم چند کے یہاں ملتی ہے، ان سب میں مفقود ہے۔ ادبیات کی یہ لطافت اور انفعال، حقیقت اور خارجیت کا امتزاج، ہمیشہ نظم و نثر کی ان تصانیف میں دیکھنے کی توقع کی جاتی ہے جو اعلیٰ تربیت یافتہ لوگوں کے لیے لکھی جاتی ہیں یہ صفات شاذ و نادر ہی بچوں کی کتابوں میں دیکھنے میں آتی ہیں۔ مگر پریم چند کی کم و بیش پچاس کہانیاں ایسی ہیں جنھیں بچے بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں اور ان کی لطافت انھیں متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ان کے حساس دل کو غور و فکر کی طرف مائل کرتی ہیں۔ اور بچوں کے نیم شعور دماغ میں عجیب جذبات کی تحریک کرتی اور گذرے ہوئے واقعات کی یاد دلاتی ہیں۔ دنیا کے ادب میں اس طرح کی کوئی دوسری چیز موجود نہیں ہے۔ ان کے افسانوں کی اچھی خاصی تعداد میں ایک طرح کی جاذبیت، بے نظیر سادگی، روانی اور خیالات کے سچے نقوش ملتے ہیں۔ ہزار ہا جگہوں پر ان کے قلم کا ہلکا سا لمس اس قدر پُر اثر ہوتا ہے کہ وہ اصلی ادب اور ہندوستان کے عالم گیر کشش رکھنے والے تمدن کا نقشِ دوام بن جاتا ہے۔ اسی میں اُس خاموش اور گہرے اثر کا راز پوشیدہ ہے، جو ان کی تصانیف، ہر پڑھنے والے اور ہر ہندوستانی پر ڈالتی ہیں (خواہ وہ کسی عمر کا ہو اور ذہنی ارتقاء کی چاہے جس منزل پر پہنچ چکا ہو) ان کی تصانیف میں سرزمین ہند کی امرت میں بسی ہوئی روح ہے جس سے ہندوستانی زندگی کی نشو نما ہوئی ہے اور جس سے خود ان کی تصانیف پھولی پھلیں بڑھیں اور لہلہائیں۔

ان کے مختصر افسانے یکساں طور پر کامیاب نہیں ہیں، بہت سے عجلت اور روا روی میں لکھے گئے ہیں۔ کئی ایک ایسے بھی ہیں جن میں مصنف کو کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن ان کا کارنامہ بہت عظیم الشان ہے۔ انھوں نے ہندوستانی زبان کو مختصر افسانہ نگاری کے مخصوص فن سے آشنا کرایا اور اس بے نظیر بیانیہ طرز تحریر کا نمونہ پیش کیا جو فرانسیسی نثر کے محاسن ظاہری اور ضرورت سے زیادہ چچا تلا پن، اور جرمن نثر کی آورد اور الجھے ہوئے طرز بیان سے پاک ہے ان کی نثر نرم، رواں، سلیس، وقیع اور مستحکم ہے، ان کا طرز تحریر ہندوستانی معاشرت کا آئینہ دار ہے۔ ان کے مذاحیہ اور المیہ اشاروں میں بھی وہی سلامت روی اور اثر ہے جو ان کی تحریر کی جان ہے۔ انھوں نے ہندوستانی زبان کو پہلی دفعہ ایسے حکیمانہ اقوال اور نکات سے مالا مال کر دیا جن کا مجموعہ خود ایک وقیع کتاب بن جائے گا۔

ان کی عظمت ان کے ناولوں کے بعض ٹکڑوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ غالبًا ناول کی پیچیدگی اور فنی

دشواریاں، مختلف حصوں کا مرکزی اتحاد اور دروبست جو کامیاب ناول کے لیے ضروری ہے ان کا مرکز کمال نہ تھا لیکن اس کے باوجود بھی وہ اردو اور ہندی کے سب سے بڑے ناول نگار تھے اور ان کا شمار ہندوستان کی دوسری زبانوں کے دو چار بہترین ناول نویسوں میں تھا۔ مختلف ضخامت کے ناولوں کے بعض ٹکڑے جن کی تعداد بہت ہے ان کے ماہر فن ہونے کا بہترین ثبوت ہیں۔ اور انھیں میں وہ اپنی بہترین کہانیوں سے بھی زیادہ بلند ہو جاتے ہیں یہ ٹکڑے الہامی انداز میں لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور غیر فانی عظمت کے علمبردار ہیں۔ ان میں سے ہر ایک گراں قدر ماہر فن کے ادھورے کارنامے معلوم ہوتے ہیں یہیں پریم چند آسمان کے تارے توڑ لاتے ہیں! رنگ بھومی یا ''چوگان ہستی'' کے ابتدائی صفحات بے تکلفی، زندہ دلی، سادگی، روانی، اور ایسی فضائیں پیدا کرنے میں جو معنویت سی تھر تھرا رہی ہے اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اس ناول اور ان کے دوسرے ناولوں میں تھوڑی تھوڑی دور پر ایسے صفحات ملتے ہیں جو صرف ایک بڑی ہستی کے قلم سے نکل سکتے ہیں۔ وہ اپنے اکثر ناول کافی غور و فکر کے بعد بڑے زور میں شروع کرتے تھے۔ مگر بعض اوقات ان کا چمکتا ہوا تخیل کچھ دور پر ماند پڑ جاتا ہے مگر تھوڑے سے وقفہ کے بعد پھر شروع ہو جاتا تھا۔

پریم چند کے ساتھ میرے ذاتی تعلقات میں ایک چیز خصوصیت سے قابل ذکر ہے جسے میں صرف ایک ''عجیب مشکل'' کے نام سے پکار سکتا ہوں۔ اپنے ملک کے تمام ان لوگوں کی طرح جنھیں ہندوستان کے موجودہ ادب سے کچھ بھی دلچسپی ہے، میرا ذاتی رجحان بھی خالصاً شعر و شاعری تک محدود تھا اور ابتدا ہی سے مجھے امید تھی کہ پریم چند بھی اردو شاعری کی بہترین چیزوں کے اسی طرح مشتاق اور گرویدہ ہوں گے۔ اگرچہ وہ تغزل سے بسے ہوئے اشعار کی کشش سے بالکل غیر متاثر نہ رہتے تھے تاہم انھیں سن کر وہ بے اختیار بھی نہ ہو جاتے تھے۔ مجھے اس بات سے ہمیشہ ایک حسرت انگیز الجھن سی پیدا ہو جاتی تھی۔ کیونکہ ان کی ملاقات کے ابتدائی دور میں دوسرے نوجوانوں کی طرح میرا بھی یہی یقین تھا کہ اردو ادب کی عظیم ترین چیز غزل ہی ہے جمالیاتی نثر خصوصاً ناولوں اور افسانوں کی نثر میرے نزدیک بہت ہی بے اصل شے تھی۔ بہر حال میرے لیے پریم چند کا شاعری سے مستقل طور پر غیر متاثر رہنا ایک معمہ تھا۔ میں انھیں ادبی تنقید اور جمالیات کی نزاکتوں کا بھی کچھ زیادہ مشتاق نہ پاتا تھا۔ اس موضوع میں وہ ابتداء ہی سے میرا شغف دیکھ کر مجھے وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے جس سے مجھے ایک طرح کی دلی مسرت ہوتی تھی۔

وہ باقاعدہ مطالعہ کے بھی عادی نہ تھے۔ لیکن یہ تو صرف چند ہی بڑے مصنفین کا وطیرہ رہا ہے

غرض پریم چند کسی خاص اصول کے ماتحت کبھی کتابیں نہیں پڑھا کرتے تھے۔ اور انھیں زیادہ تر انھیں کتابوں اور ناولوں سے دلچسپی ہوتی تھی جو رسم و رواج و روایات، تاریخی واقعات اور زندگی کے دوسرے نقوش سادہ اور مانوس طریقہ پر پیش کرتی تھیں۔ اس میں بھی وہ اپنے طالب تحقیق اور ذوق ادب کا ثبوت دیتے تھے۔ خواہ وہ پرانی باتوں، ناخوشگوار واقعات، گذشتہ روایات اور ماضی کی لڑائیوں کا بیان ہو (آلہا، رانی سارندھا اور رودھی رانی پڑھئے) یا صرف روزمرہ کی چیزوں، مثلاً فطری غم، تکلیف یا نقصان کا ذکر ہو، جو دنیا میں پہلے بھی ہوئے اور آیندہ بھی بارہا ہوتے رہیں گے۔ یہ سب پریم چند کے لیے ایک مانوس تجربہ اور حیرت خیز عالم بن جاتے تھے۔ لیکن اس پر بھی میں دل ہی دل میں حیرت کیا کرتا تھا کہ شاعری سے ان کی روح میں گرمی کیوں نہیں پیدا ہوتی؟ اس معمہ کا ایک حل سا میری سمجھ میں اس وقت آیا جب میں ان کے انتقال کے بعد اپنے ایک دوست اور ہندوستان کے ایک قابل قدر فرزند کے غم ہو جانے پر غور کر رہا تھا۔ اس وقت یکایک میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ نثر نگاری کے ماہرین کامل شاذ و نادر ہی شاعری کے پر جوش قدرداں ہوئے ہیں، بیکن (BACON) جانسن (JOHNSON) ہیزلٹ (HAZLITT) کارلائل (CARLYLE) اور رسکن (RUSKIN) کو دیکھئے وہ لوگ کبھی تغزل اور رس سے بھری ہوئی شاعری کے قبضہ میں نہیں رہے اور دنیا کے نہ صرف بڑے بڑے ناول نگار بلکہ ڈرامہ نویس اور بیانیہ شاعر کبھی محض غزل اور جذباتی شاعری کے زیر اثر نہیں رہے۔ کیا ورڈس ورتھ (WORDSWORTH) جو ایک بہت بڑا جذباتی شاعر تھا، شیلی (SHELLEY) کی شاعری سے اور شیلی اس کی شاعری سے بدمزہ ہو جاتا تھا؟ جو کچھ ہو جذباتی شاعر شاذ ہی کبھی ایک طرح کے فاسدانہ خود بینی سے محفوظ رہ سکتا ہے، اور پریم چند جذبات پرست اور خود پسند انسانوں میں نہ تھے۔ قریب قریب ان کی ہر تصنیف میں ایک صحت بخش وسعت اور خارجیت ہے جس کی بدولت وہ اپنے موجودہ پلاٹ اور کیریکٹروں سے نکل کر تاریخ ہند کے پانچ ہزار سال پرانے تمدن تک پہنچ جاتے ہیں۔

ان کے افسانے اپنے ظاہری حدود سے بہت بڑے ہوتے ہیں، ان میں ایک تاریخی تہذیب کا احول اور رنگ ہے۔ ان کی کتابیں ہمیں ان زندہ دوروں سے روشناس کراتی ہیں جو تاریخ کی ابتدا سے شروع ہوئے اور جن میں اب بھی شباب کی تازگی موجود ہے۔ جب کبھی ہم ان کی کوئی کہانی پڑھتے ہیں تو ہم کو یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہندوستان کے متعلق ہی نہیں بلکہ خود ہی ہندوستان ہے نہ ان میں صرف رومانی اور غیر تحقیقی نصب العین کا بیان ہوتا ہے اور نہ ہندوستانی تہذیب کی غیر نقادانہ توصیف، اس تمدن کے متعلق وہ بعض اوقات بہت تلخ باتیں کہہ ڈالتے ہیں۔ ان کی تصانیف اب ایک نئے دور کی طرف گامزن ہو رہی

تھیں۔ ان کی آخری کہانیوں میں زیادہ گہرائی اور تیکھا پن نظر آرہا ہے۔ ان کا فن نئی قوت حاصل کر رہا تھا کہ مرگ بے ہنگام نے اسے ختم کر دیا۔ ان کی طرز تحریر سے ہندوستانی ادب کو بڑا فائدہ ہوا ہے ان کی موت سے ملک کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ جب کبھی کسی آنے والے زمانے میں ان کا لائق جانشین آئے گا تو اس کی پیشانی پر اس شخص کے سر سے بے داغ اور تازہ سہرا آئے گا، جس نے کبھی کوئی ہیٹی بات نہیں کہی۔!

الوداع! منشی پریم چند! الوداع!!

فرشتہ خصلت پریم چند

مکرمی حامد اللہ صاحب افسر میرٹھی بی۔اے۔ ایڈیٹر زمانہ کے نام ایک نجی خط میں لکھتے ہیں:۔

''میں کہتا ہوں خدا نے کسی فرشتہ کا نام پریم چند رکھ دیا تھا۔ ان کی محبت ان کی بے ریائی۔ ان کا بھولا پن۔ ان کی صاف گوئی کن کن چیزوں کو یاد کروں۔ فسانہ نویس ممکن ہی ان سے لاکھ درجہ اچھے پیدا ہو جائیں ہندی میں بھی اور اردو میں بھی۔ مگر ایسا انسان ہم کہاں سے لائیں گے۔ ایسے انسان تو صدیوں کے الٹ پھیر میں بھی پیدا نہیں ہوتے۔

حامد اللہ افسر

منشی پریم چند مرحوم

از منشی جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی بی۔اے ایل ایل بی،

تھوڑے ہی عرصہ میں دنیائے ادب سے تین مقتدر ہستیاں ہمیشہ کے لیے روپوش ہوگئیں۔ جناب آغا محمد شاہ صاحب حشر کی وفات سے اردو ہندی ناٹکوں و نیز ہندوستانی اسٹیج و اسکرین پر اوس پڑ گئی۔ علامہ برق دہلوی کی رحلت کا سانحہ فراموش نہ ہونے پایا تھا کہ اردو ہندی ادب کی جان منشی پریم چند صاحب داعی اجل کو لبیک کہہ گئے جس طرح آغا صاحب مرحوم ڈرامہ نگاری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے اسی طرح ناول و افسانہ میں منشی جی کا ملک میں جواب نہ تھا۔

عجب اتفاق ہے کہ لاہور میں نیشنل مووی ٹون کے اسٹوڈیو میں جناب حشر سے آخری ملاقات کے بعد راقم واپسی میں دہلی میں برق صاحب مرحوم کا نیاز حاصل کر کے بریلی واپس آیا، اور اس کے بعد پھر کبھی یہ صورتیں دیکھنے کو نہ ملیں۔ اسی دوران میں منشی صاحب مرحوم سے بھی شرف ملاقات نصیب ہوا۔ آپ کانگرس کے ایام میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کی صدارت کے لیے لکھنؤ تشریف لائے تھے۔ افسوس جس طرح مذکورہ دونوں ملاقاتیں آخری ثابت ہوئیں۔ ٹھیک وہی حشر اس تیسری صحبت کا بھی ہوا۔

لکھنؤ میں جن حضرات نے منشی جی کو دیکھا ہوگا ان میں سے کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ وہ اتنی جلدی داغ مفارقت دے جائیں گے۔ اس وقت ان کی صحت بظاہر خاصی نظر آتی تھی۔ مگر جب وہ بریلی آئے تھے تو صورت حال کچھ اور ہی تھی۔ اب وہ ایک نحیف و نزار اور ایک مختصر سے انسان نظر آتے تھے۔ لیکن ایسی کوئی وجہ نظر نہ آتی تھی جس سے یہ سمجھ لیا جاتا کہ اتنا بڑا افسانہ نگار عنقریب ہی خود افسانہ بن کر رہ جائے گا۔

مرحوم کی زندگی ہر اعتبار سے نہایت قیمتی اور مصروفیت کی زندگی تھی۔ وہ قومی زندگی کے تقریباً شعبہ میں نمایاں حصہ لے کر رہنمائی کا فرض ادا کرتے رہتے تھے۔

ادبی حیثیت سے ہم منشی پریم چند کی زندگی کو چار مختلف شعبوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(1) پریم چند بحیثیت ادیب وافسانہ نگار (2) پریم چند بحیثیت ناول نویس (3) پریم چند بحیثیت ڈرامہ نگار (4) اور پریم چند بحیثیت اخبار نویس۔

منشی جی کی ابتدائی زندگی عام کایستھ نوجوانوں کی طرح سرکاری ملازمت سے شروع ہوتی ہے جس کا بوا معاشی ضروریات نے جبراً ان کے گردن پر لاد دیا تھا۔ چنانچہ وہ کچھ عرصہ تک اسکول ماسٹر کی حیثیت سے ملک وقوم کی خاموش خدمت کرتے رہے۔ لیکن مہاتما جی کی قومی تحریک نے ان کے قلب کو کچھ ایسا گرمایا کہ ملازمت کے قید وبند سے آزاد ہوکر مادر وطن کی سچی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ اور آخری دم تک اسی دھن میں لگے رہے۔ ترک ملازمت کے بعد منشی جی کٹر ستیا گرہی بن گئے۔ اور اپنی چند روزہ زندگی سے صفحۂ ہستی پر یہ حقیقت منقوش کر گئے کہ علم وادب کی حقیقت خدمت کے لیے جس روحانی آزادی اور بے باکی کی ضرورت ہے وہ حرص وطمع اور مادی منفعت کی سنہری زنجیروں میں جکڑی نہیں جاسکتی۔

منشی جی کی علمی قابلیت مسلمہ تھی۔ ان کے تبحر وہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ صفحہ کے صفحے قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے تھے اور جس موضوع پر قلم اٹھاتے تھے اسے وہیں ختم کردیتے تھے۔ اور اس میں کہیں ایزاد واضافہ کی گنجایش باقی نہ رہتی تھی۔ اخلاق کا یہ عالم تھا کہ سخت سے سخت اختلاف رائے رکھتے ہوئے بھی وہ کبھی کسی کا دل دکھانا پسند نہ کرتے تھے۔ اور نصیحت کی تلخ سے تلخ گولیوں کو شیریں کلامی کا قند اور ظرافت کی چاشنی چڑھا کر پیش کرتے تھے۔ صاحب وضع۔ حلیم الطبع اور سنجیدہ مزاج بزرگ تھے۔ صلح کل اور آزاد منش تھے۔ ادبی ومذہبی رواداری ان کی خو تھی۔ اور اس درجہ بے لوث واقع ہوئے تھے کہ کبھی اپنے دامن کو من تراحاجی بگویم تو مراحاجی بگو کے دھبوں سے ملوث نہ ہونے دیتے تھے۔ غرض خوبیوں کا خوبصورت مجسمہ اور نیکیوں کا معصوم پتلا تھے۔

منشی جی کی اخلاقی بلندیوں کا اندازہ ان کے معاصرین کی پست مذاقی کی اس ایک مثال سے بھی بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ منشی جی کے مختصر افسانوں اور ناولوں سے اردو اور ہندی زبانوں کی دنیائے ادب میں عالمگیر ذہنی انقلاب رونما ہو چکا ہے۔ اور ان کی غیر معمولی کامیابی دیکھ کر انھوں نے ان کی تقلید کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ایسے کامیاب افسانہ نویسوں کی کمی نہیں ہے جو منشی جی کے رنگ میں ڈوب کر ابھرے اور زر مقصود ان کے ہاتھ لگا۔ مگر بعض ایسے فرعون بے سامان بھی ہیں جو بزعم خود اپنے کو منشی جی کا مد مقابل سمجھتے ہیں۔ مگر بلا تکلف مرحوم کے چمنستان فکر سے گل وبوٹے چننے کے لیے سرقہ کے اندھے کنوئیں میں غوطہ زن رہتے ہیں۔ لیکن چوری کا علم ویقین ہوتے ہوئے بھی منشی صاحب نے کبھی کسی سے مواخذہ

نہیں کیا۔

منشی پریم چند صاحب کے ایک مشہور افسانہ کی ابتدا اس طرح پر ہوتی ہے:۔"لال مرچ دیکھنے میں کس قدر خوبصورت معلوم ہوتی ہے لیکن..........وغیرہ" بعینہ یہی الفاظ بلاکسی ردوبدل کے ہمیں ایک دوسرے مصنف کے افسانہ کے دیباچہ کی زینت بنے نظر آتے ہیں۔ اس طرح کی صرف ایک نہیں بلکہ سیکڑوں مثالیں موجود ہیں۔ لیکن ان کے پیش کرنے کا یہ موقع نہیں۔

آدمی کا کریکٹر اور اس کی بزرگی اس کی مصروفیات سے بھی مترشح ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے منشی جی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالنے سے ان کی اور ان کے کام کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

منشی جی بہ حیثیت افسانہ نگار: ان کی ادبی زندگی کی ابتدا اردو کے افسانہ نگار کی حیثیت سے ہوئی تھی اس میدان میں انھیں اس قدر کامیابی ہوئی کہ بلاشبہ انھیں اس صنف ادب کا استاد ماننا پڑے گا۔ ہندی میں بھی ان کی کہانیاں دیگر مصنفین کے لیے مشعل ہدایت بنی ہوئی ہیں۔ اردو میں تو افسانہ نگاری کی ابتدا ہی منشی جی کی مختصر کہانیوں سے ہوتی ہے۔ لیکن ہندی میں ان سے پہلے بھی مختصر افسانے لکھے جاتے تھے۔ بات یہ تھی کہ ہندی پر بنگلہ زبان کا بہت کچھ اثر ہے اور اس کا دامن بنگالی ادبیات کے تراجم سے لبالب ہو رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بنگلہ زبان کے افسانے تمام ہندوستانی زبانوں میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ چنانچہ انھیں افسانوں کی دیکھا دیکھی ہندی میں بہت سی مشکور و نامشکور کوششیں ہوئیں اور یہی بنگالی کہانیاں منشی جی کی افسانہ نویسی کی بھی محرک ہوئیں۔ ہندی میں منشی جی کے ہمعصر پنڈت بشمبھر ناتھ کوشک اور جے شنکر پرشاد ہیں۔ بعض لوگ پنڈت مہاویر پرشاد دویدی سابق ایڈیٹر رسالہ سرسوتی الہ آباد کو ہندی کا اولین نثر نگار بیان کرتے ہیں۔ بہرحال اس وقت منشی جی کے سامنے کسی دوسرے کا چراغ نہ جل سکا۔ اور ہندی میں بھی اس صنف ادب میں ان کی کہانیوں سے چار چاند لگ گئے۔ منشی جی کے افسانوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمارے سامنے ہماری روزمرہ زندگی کا جیتا جاگتا نمونہ اور اس کا کوئی نہ کوئی روشن پہلو پیش کر کے ہمارے دلوں پر لافانی نقوش مرتسم کر دیتے ہیں۔ ان کا ہر افسانہ ڈرامیٹک اور اس درجہ جامع ہوتا ہے کہ کوزہ میں دریا کو بند کر دینے کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔ ان کا مخصوص طرز بیان ہے کہ جو بیک وقت سادگی و رنگینی سے ہمدوش اور تصنع سے خالی و عاری رہتا ہے۔ ان کی ہر کہانی واقعات کی خشک تشریح کے بجائے جذبات کی دل دوز ترجمانی کرتی ہے۔ اردو کا ایک شاندار افسانہ جو منشی جی کے قلم سے نکل کر مقبول عام ہوا۔ "خوف رسوائی" ہے جو ادیب الہ آباد میں شائع ہوا۔ من حیث المجموع ان کی کہانیاں ٹالسٹائے، ٹیگور، گورکی، لیول، چیخوف، موپاسان، پربھات کمار،

جلدھر سین، سیتا اور ہری سادھن مکری کے افسانوں کی ٹکر کی ہیں۔ اور ہم انھیں بڑے فخر کے ساتھ بین الاقوامی افسانوی ادب کے پہلو بہ پہلو رکھ سکتے ہیں۔

منشی جی بہ حیثیت ناول نگار: اردو میں پنڈت رتن ناتھ سرشار اور ہندی میں للو لال جی سے جس افسانوی ادب کی ابتدا ہوئی اسے منشی پریم چند جی نے معراج کمال کو پہنچا دیا۔ دراصل اردو ہندی ہر دو، زبانوں میں ایسے طبع زاد طویل افسانوں کا منشی جی سے قبل فقدان تھا جو چارو، شرت، ٹیگور، ہیوگو اور ہارڈی وغیرہ کے سامنے رکھے جا سکیں اور جنھیں صحیح معنوں میں ناول کہا جا سکے اور انھیں کوئی اصطلاحی عیب موجود نہ ہو۔ منشی پریم چند نے اپنی خداداد قابلیت سے اس کمی کو ایک درجن کے قریب ناول لکھ کر پورا کر دیا۔ ہندی میں ان کا پہلا ناول پریما اور اردو میں پرتاب چندر ہے یہ دھنپت رائے کے نام سے (جو منشی جی کا اصلی نام ہے) شائع ہوئے ہیں۔ اس کے بعد تقریباً ایک درجن ناول منشی جی کے قلم سے نکلے اور سب کے سب مقبول ہوئے۔ ان میں بازارِ حسن یا سیوا سدن (ہندی) اور رنگ بھومی یا چوگانِ ہستی[1] (اردو) خاص طور پر مشہور ہیں۔ لیکن بعض خصوصیات کی بنا پر ہم بازارِ حسن کو منشی جی کی مستقل تصنیف اور شاہکار کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ قطعاً مجلسی زندگی کا آئینہ دار اور وقتی ہنگاموں کی الجھنوں سے معرا ہے۔ اس ناول کو کئی زبانوں میں ترجمہ ہونے کا فخر حاصل ہوا ہے۔ علاوہ بریں بازارِ حسن ایک خاص وجہ سے بھی نہایت اہم وقیع چیز ہے۔ اور وہ اس لیے کہ اس کی تصنیف کے بعد منشی جی اردو سے بددل ہو کر ہندی کی ملازمت پر لوٹ ہو گئے۔

ہندوستانی افسانوی ادب پر مغربی زبانوں کا بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ جس طرح شرت بابو بنگلہ کے چوٹی کے ناول نگار ہیں اسی طرح منشی پریم چند ہندی اردو کے بہترین ناول نویس تھے۔ لیکن شرت چندر کا پایہ منشی جی سے قدرے بلند ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شرت بابو بنگلہ اور ہندوستان ہی کے نہیں بلکہ مشرق کے لاثانی مصنف ہیں اور بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے ناولوں کا تقریباً تمام مغربی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور یہی بات ان کی فنی کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ باعتبارِ فن شرت بابو اور منشی پریم چند دونوں ہی نے مغربی صناعوں کے چمنستانِ تخیل کی خوشہ چینی کی ہے۔ شرت بابو کا ضخیم ترین ناول ''چرتر'' ہے جو بلاشبہ ہاردی کے جوڈ دی ''ابسکیور'' اور ٹیس کے کہاوی اختلاط کا حسین چربہ

RETURN OF THE NATIVE 3 YEATE 2 JODE THE OBSCURE 1

[1] راقم الحروف نے ''ہستی'' کا ہندی زبان میں ترجمہ کر کے شائع کر دیا ہے۔ شائقین اسے 8 روپے منیجر آکاش بانی آفس بریلی سے طلب فرما سکتے ہیں۔ اس کتاب کا ہندی نام ہکلی ہے۔

لیکن اس کوشش میں شرت بابو کا دامن جس قدر ملوث ہے منشی پریم چند کا قلم اسی قدر پاک وصاف ہے۔
بازار حسن کی طرح منشی جی کی رنگ بھومی وینٹی فیر (Vanity Fair) کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے اوران کی کایا کلپ پر ہارڈی کی ریٹرن آو دی نیٹو کا سایہ پڑ گیا ہے۔ تاہم یہ ایسے بیش بہا نوادر ہیں کہ اردو ہندی ادبیات میں ہمیشہ کوہ نور کی طرح روشن درخشاں رہیں گے۔

انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تنقید کرنا اور اس کے روشن پہلو کو ابھارنا ناول نویس کا اہم فرض ہے۔ اس کے مجلسی، اخلاقی، سیاسی، معاشرتی، قومی انفرادی، اجتماعی اور علمی وتعلیمی مسائل ونکات کو واقفیت کے قالب میں ڈھال کر حل وواضح کر جانا اس فن کی معراج کمال ہے۔ اور یہ تمام باتیں منشی پریم چند کی ہر تصنیف میں موجود ہیں 'بڑے بابو' منشی جی کا ایک بہترین مختصر افسانہ ہے اور وہ اس لحاظ سے کہ جس موضوع کو انھوں نے اس کہانی میں پیش کیا ہے اگر اور کوئی ہوتا تو فسانہ آزاد سے بھی زیادہ ضخیم ناول لکھ کر اسے ختم کر پاتا۔ لیکن منشی جی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اسے چند صفحات ہی میں منقوش کر دیا ہے۔ یہ کام وہ محض جذبات کو بیاں کر کے کر گئے ہیں۔ اور وہ بھی کس انداز تحرّ کے ساتھ کہ جو درد مند دلوں کو گدگدا کر آنسو بہانے کے لیے کافی ہے۔ یہی بہتمم بالشان اختصار اور یہی رنگینی بیان ان کے تمام ناولوں میں موجود ہے۔ اور بذات خود منشی جی کے ماہر نفسیات وذہنیات ہونے کی بین دلیل ہے۔

کردار نگاری، واقعات کی جدت، تخلیق وترتیب کے محاسن، مکالموں کی ندرت اور فطرت بشری ونظری کی مصوری، غرض ایسی کون سی بات ہے جس کی منشی پریم چند کے یہاں بہتات نہ ہو۔ آغا حشر مرحوم منشی جی کے بڑے مداح تھے۔ اوران کی ہر تصنیف کو بقول خود "طفل مکتب کی طرح گھونٹے لگا لگا کر پڑھا کرتے تھے۔" مرحوم کی رائے تھی کہ "منشی جی کا ہر افسانہ زندہ اسٹیج معلوم ہوتا ہے اوراس کا ہر کردار منھ سے بولے اٹھتا ہے۔ اس کی عبارت ایسی پیاری نئی اور نادر تراکیب سے مملو ہوتی ہے کہ قلم چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔"

حضرت تماشائی بریلوی اردو کے مشہور فسانہ نویس ہیں۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ مدیر شعاع نے ان سے اپنے رسالہ کے خاص نمبر کے لیے ایک افسانہ کی فرمائش کی۔ تماشائی ان دنوں علی گڑھ کالج میں معلم تھے اور گرمی کی چھٹیوں میں گھر آئے ہوئے تھے۔ یہ بات چیت بریلی کے کتب خانہ میں ہوئی تھی۔ تماشائی صاحب نے اس فرمائش کا یہ جواب دیا کہ منشی پریم چند کے افسانوں کا کوئی مجموعہ مجھے پڑھنے کے لیے دے دیجیے۔ اسے پڑھ کر ہی مجھے افسانہ لکھنے کی سوجھے گی۔ تماشائی صاحب کا ارشاد بالکل بجا ہے۔ واقعی منشی جی کے افسانوں میں ایسا ہی زور ہے کہ انھیں پڑھ کر خود کچھ لکھنے کی تحریک ہوتی ہے۔ راقم

واقعی منشی جی کے افسانوں میں ایسا ہی زور ہے کہ انھیں پڑھ کر خود کچھ لکھنے کی تحریک ہوتی ہے۔ راقم الحروف نے بھی ہندی زبان میں چند افسانے لکھنے کی جسارت کی ہے ان میں سے بہترین افسانوں کے لکھے جانے کا باعث بھی منشی پریم چند کے افسانوں کا مطالعہ ہے۔

منشی جی بہ حیثیت ڈرامہ نگار: منشی جی صاحب مرحوم کی ہمہ گیری کا تقاضہ تھا کہ انھوں نے اس صنف میں بھی داد کمال دی ہے۔ چنانچہ انھوں نے کربلا لکھ کر اپنے ذوق فن کا ثبوت دیا ہے۔ کربلا ادبی حیثیت سے ایک کامیاب چیز ہے۔ اس کے بعد منشی جی نے اس میدان میں جو دوسرا قدم اٹھایا وہ اسکرین کے لیے دو ڈرامے تھے۔ اجنتا مووی ٹون نے انھیں پردہ سیمیں پر چمکایا ہے۔ ان دونوں ڈراموں کا نام "مزدور" اور "شیر دل عورت" ہے۔ مزدور پر گورنمنٹ کے کالے قانون کا کلھاڑا چل چکا ہے۔ لیکن "شیر دل عورت" ابھی زندہ ہے مگر منشی جی اپنی تصانیف کی مسخ شدہ صورت دیکھ کر اس مشغلہ سے کچھ ایسے مایوس ہوئے کہ انھوں نے پھر کبھی فلم کے لیے کچھ لکھنے سے توبہ کر لی۔ اور اس طرح ان کی ڈرامہ نگاری کے نہایت مختصر دور کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

منشی جی بہ حیثیت اخبار نویس: ایک فرض شناس اور ایماندار اخبار نویس کے فرائض نہایت اہم ہیں۔ اور ان سے عہدہ برآ ہونا بہت مشکل کام ہے۔ یہ مشکلات اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہیں جبکہ ایسا اخبار نویس ہندوستان جیسے ماتحت ملک کا باشندہ ہو۔ اخبار نویس کے فرائض کی تعریف کرنا بہت مشکل ہے۔ بعض حضرات اپنی ہر جا و بیجا حرکت کو بھی اپنا فرض کہہ سکتے ہیں۔ لیکن دراصل فرض وہ ہے جو اخلاقیات کے نقطۂ نظر سے مستحسن ہو۔ اور قوم کی فلاح و بہبود کے بھی منافی نہ ہو۔ اس طرح اخبار نویس ایک سچا مصلح ایک سرفروش سپاہی، ایک مہربان استاد، اور ایک بے خوف و ہمدرد رہنما ہوتا ہے۔

منشی جی کی اخبار نویسی غالباً رسالہ زمانہ سے شروع ہوئی، اس کے بعد وہ نولکشور پریس میں ماہوری نامی مشہور ہندی رسالہ کے ایڈیٹر ہو گئے۔ اور وہاں سے قطع تعلق ہو جانے کے بعد انھوں نے بنارس سے ہندی کے دو پرچے نکالنا شروع کیے۔ ان میں سے ایک ماہوار رسالہ ہنس تھا اور دوسرا ہفتہ وار جاگرن یہ دونوں پرچے نکلے اور گذشتہ ایام میں تو ہنس ہندی کا بہترین رسالہ بن گیا۔

اخبار نویس کی حیثیت سے منشی جی نے ہماری قومی و مجلسی زندگی کے ہر شعبہ میں جس بے باکی کے ساتھ حصہ لیا وہ قابل ستائش ہے۔ ملک کی سیاسی، مالی، معاشرتی، اور ہر اس تحریک میں جس سے غلامی کی بیڑیاں کٹنے میں امداد مل سکنے کی توقع کی جا سکتی تھی منشی جی نے بلا کسی خوف و خطر کے اپنا ہاتھ ڈالا۔ اور وقتی مسائل و موضوعات پر نوٹ لکھتے وقت انھوں نے کبھی اس بات کی پروانہ کی کہ اس کا کیا انجام ہوگا۔

اس طرح وہ ہماری زندگی کے ہر پہلو پر کم و بیش اثر انداز ہوئے۔ آخری ایام میں وہ عوام کی تحریر و تقریر کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں ہوئے۔ لیکن قضا نے ان کے اس کام کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچنے دیا۔

اخبار نویسی بڑے سے بڑے مصنف کو ترجمہ کی پناہ لینے کے لیے مجبور کر دیتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ منشی جی پر بھی اس کا یہ جادو چلے بغیر نہ رہا اور انھوں نے مختلف مضامین کے علاوہ بعض کتب کا بھی نہایت کامیاب ترجمہ کیا۔ لیکن ان کی اس قسم کی خدمات سے اردو کے بجائے ہندی زیادہ مستفید ہوئی۔ چنانچہ ان کی بدولت ہندی کو ''سکھ داس'' ''مہاتما سعدی'' اور آزاد کتھا وغیرہ کے درشن نصیب ہوئے ہیں۔

ہنس و جاگرن کی قلمی معاونت کے سلسلہ میں منشی جی سے جو خط و کتابت ہوئی ہے اس سے ان کی زندہ دلی اور بالغ نظری کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ مرحوم کا آخری مکتوب وہ تھا جس میں انھوں نے اپنی ایک ماہ سے زائد علالت کا ذکر کیا تھا۔ اس کے بعد مزاج پرسی و عیادت کے لیے جو عریضہ انھیں لکھا گیا اس کا جواب دینے کی مشیت ایزدی نے انھیں فرصت ہی نہ دی۔

اردو زبان کے بدنصیب ہندو مصنفین کو جس عالم گیر بے اعتنائی کا شکار ہونا پڑتا ہے اس کا حال کوئی مرحوم سے پوچھتا تو سمجھتا۔ افسوس منشی پریم چند کی زندگی میں ان کے علم و کمال کی ویسی قدر نہ ہوئی جیسی کہ ہونا چاہئے تھی غالباً اسی مایوسی سے بددل ہو کر منشی جی ہندی کی شیرینی پر ریجھ گئے تھے اور ایک طرح سے اسی کے ہو بھی رہے۔ کہا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد اہل کمال کی قدر ہوا کرتی ہے۔ اردو سے تو اس کی بھی امید نہیں کی جا سکتی۔

بہر حال منشی جی صاحب موصوف بیش بہا نوادر اور ایک ضخیم ذخیرہ اپنا یادگار چھوڑ کر جنت نشین ہو چکے ہیں۔ یہ سارا ذخیرہ ان کی عمر بھر کی کمائی اور ملک کی بہترین میراث ہے۔ اب یہ ملک اور قوم کا کام ہے کہ اس کی حفاظت کرے یا اسے زمانہ کی لاابالیوں کے ہاتھوں ضائع ہو جانے دے۔

پریم چند کی خصوصیت

ملک کے نامور ادیب مسٹر سچدانند سنہا سابق ممبر مال صوبہ بہار و حال وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی و ایڈیٹر ہندوستان، ایڈیٹر زمانہ کے نام اپنے انگریزی خط مورخہ 9 / اکتوبر 1936ء میں تحریر فرماتے ہیں کہ۔

''ابھی ابھی اخبارات سے محب مکرم پریم چند جی کے وفات کی خبر معلوم ہو کر از حد صدمہ ہوا۔ آپ کے پچھلے خط سے مجھے خیال ہوا تھا کہ اب وہ اچھے ہو رہے ہیں۔ اس لیے میں اس

افسوس ناک وملال انگیز خبر سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ شمالی ہند کے ادبی دنیا کے لیے پریم چند کی وفات لفظ کے وسیع ترین معنی میں ایک سانحۂ عظیم ہے۔ مرحوم کو ہندوستانی زبان کی دونوں صورتوں (اردو ہندی) میں یکساں مشق ومزاولت تھی اور اردو ہندی دونوں میں انھیں یکساں کامیابی حاصل ہوئی۔ یہاں تک کہ ہندی کے حامی انھیں ہندی زبان کا ایک بہترین مصنف سمجھتے ہیں اور اردو داں اصحاب انھیں اردو کے بہترین مصنفین میں شمار کرتے ہیں۔ یہ خصوصیت شمالی ہند کے شاید ہی کسی اہل قلم کو نصیب ہوئی ہو اور اس پر جس قدر فخر کیا جائے کم ہے۔ میں ممنون ہوں گا اگر آپ اس حادثۂ عظیم میں مرحوم کے غم نصیب اعزا کے ساتھ میرے دلی ہمدردی کا اظہار کردیں۔

مسٹر مدوت ایک دوسرے خط مورخہ 24/اکتوبر 1936ء میں لکھتے ہیں کہ گو مجھ سے اور پریم چند سے ایک ہی مرتبہ[1] الہ آباد میں جنوری گذشتہ میں ملاقات ہوئی تھی۔ جب آپ بھی وہاں میرے ساتھ تھے۔ تاہم مجھے پریم چند کے وفات کا بڑا رنج ہوا ہے۔ میں ہندوستان ریویو میں ان کے ادبی کارناموں پر ایک مضمون لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ اخبارات میں جو کچھ ان کے متعلق لکھا گیا ہے میں نے اسے غور سے پڑھا ہے۔ بدقسمتی سے ہندوؤں نے عام طور پر ان کی بابت ہندی مصنف کے حیثیت سے لکھا ہے۔ اور مسلمانوں نے اردو مصنف کے حیثیت سے رائے زنی کی ہے۔ میں ان کی ادبی خدمت کے دونوں پہلوؤں سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ آج کل پٹنہ یونیورسٹی کی وجہ سے بہت عدیم الفرصت ہوں۔

---

1. غالباً اس ملاقات کی آپ کو یاد نہیں رہی جس کا ذکر نکری لال کرشن صاحب نے اپنی مضمون میں کیا ہے۔ (ا۔ ز)

پریم چند کی قومی خدمت

ابوعمر زکریا بھاگلپوری، ایڈیٹر "مومن گزٹ" کانپور

ہندوستان میں اردو ہندی کا تنازع چل رہا ہے، اور عمداً ایک زبان کو دو بنایا جا رہا ہے ہندی کے معترف سنسکرت سے مدد لے کر اور اردو کے مداح عربی اور فارسی کی اعانت سے زبان کی مشاطگی اس طرح کر رہے کہ جس سے ہندو اور مسلمانوں کی دو زبانیں نظر آ رہی ہیں۔ یہ اجنبیت ہندوستانیوں کے اتحاد و محبت میں فرق ڈال رہی ہے۔ منشی پریم چند آنجہانی کی ہستی وہ نادر اور مغتنم ہستی تھی جس نے اس اجنبیت کی ڈراؤنی صورت کو دیکھ کر فوراً مستقبل کو بھانپ لیا۔ آپ نے اردو کی مسلسل خدمت شروع کر دی، اور اتنی من موہنی سادگی برتی کہ ہندو حضرات بھی لوٹ ہو گئے۔ ادھر ہندی کا قلم بھی سنبھالا اور ہندی کو برج بھاشا میں رنگ دیا۔ ہمارے پریم جی دونوں زبانوں کے درمیان ایک "پریم کے پل" تھے جو دوئی کی خلیج کو وحدت کے پل سے پاٹ رہے تھے، دونوں زبانوں میں پھر یگانگت پیدا ہو رہی تھی اور چولی دامن کا ساتھ ہو رہا تھا، مگر ملک کی بدقسمتی سے پیک اجل نے اس مفید کام میں فرق ڈال دیا۔

پریم چند جی صرف ماہر زبان ہی نہ تھے، آپ فاضل ادب تھے، زبان کو گوناگوں الفاظ و بوقلموں بندش و اسالیب سے مزین کر رہے تھے۔ آپ اپنے قابل قدر ترجموں سے علوم و فنون کے گراں بہا موتیوں سے خزانہ کو بھر رہے تھے۔ مصلح قوم و ملک تھے، اپنے قلم گوہر رقم سے قوم و ملک کی اصلاح کر رہے تھے اخلاقیات کی تعلیم سے قوم کی کمزوریاں دور کر رہے تھے۔

آپ کا زندہ دل لٹریچر کی چلبلی سطروں میں زندہ دلی پیدا کر رہا تھا۔ آپ کی سحر نگاری مقبول خلائق داستانوں میں چمک رہی ہے، آپ کے امر جذبات افسانوں میں گرمی پیدا کر رہے ہیں، افسوس آپ افسانہ نگار تھے مگر اب خود افسانہ ہو گئے ہیں۔ مگر جب تک آپ کی "تصنیفات" زندہ ہیں اور جب تک خاکدان عنصری عالم امکان میں جلوہ گر ہے آپ کی تصنیفات ہر میز کی زینت اور ہر دل کی مونس و رفیق بنیں گی۔ آپ کا نام آسمان ادب پر آفتاب کی طرح درخشاں رہے گا اور آپ کا تذکرہ سخنوروں کی محفلوں میں گونجتا رہے گا۔

منشی پریم چند کی ادبی خدمات

از حضرت جگر بریلوی بی۔اے

موجودہ زمانہ میں ہندوستان کی سرزمین ادبی نشوونما کے لیے "زمین شور" نظر آتی ہے اور یہاں ادب وشعر کا فروغ پانا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اول تو ہندوستان کی ناداری و افلاس کے باعث صدیوں سے اہل ہند کے دل ودماغ ضعیف و ماؤف ہوگئے ہیں اور دل سے احساس لطافت اور دماغ سے بلند پروازی کے جوہر پرواز کر گئے ہیں۔ اس پر ستم یہ کہ کشمکش حیات کسی فرد بشر کو اتنی اجازت نہیں دیتی کہ وہ خالص ادبی شاغل میں زندگی کا کوئی معتد بہ حصہ بھی صرف کر سکے۔ ان تمام دشواریوں کے ساتھ ساتھ مغربی تعلیم وتہذیب کے سطحی اثرات بھی ذوق ادب کے راہ میں سنگ راہ بن گئے ہیں۔

ایسے زمانہ میں منشی پریم چند کا پیدا ہو جانا تعجبات سے نہیں تھا۔ ہندوستان کی خاک میں ابھی کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ کوہ ہمالیہ کی فلک بوس چوٹیاں دنیا بھر کے پہاڑوں کو پست کیے ہوئے ہیں اور دنیائے آب وگل کے قیام تک پست کیے رہیں گی۔ اس خاک سے جو ذرّے اٹھتے رہتے ہیں ان میں سے اکثر ان بلندیوں پر پہونچے ہیں جہاں پہونچتے ہوئے فرشتوں کے پر جلتے ہیں۔ کالیداس، بھوبھوتی، ویاس، تلسی داس وغیرہ وہ عظیم الشان ہستیاں گزری ہیں جن کے کارناموں سے جہاں ادب کا وقار قایم ہے۔ آج بھی مادر ہند کا ایک سرمایہ ناز سپوت رابندرناتھ ٹیگور اپنے لاہوتی نغموں سے عالم شعروادب پر چھایا ہوا ہے اور ہندوستان جنت نشان کی روحانی لطافتوں سے دلوں کو سرور وکیف بخش رہا ہے۔ مگر ٹیگور ایسے دودماں میں پیدا ہوئے تھے جو جواں بخت ہے اور دولت وثروت جس کا منھ چومتی ہے۔ ناز ونعمت کے گہوارے میں جب انھوں نے آنکھ کھولی تو ہر در و دیوار کو رنگین وحسین پایا جس کے باعث ان کے جمالیاتی ذوق نے وہ ترقی کی جس نے نگارخانہ ادب کا حسن دوبالا کردیا۔ لیکن منشی پریم چند اس معاملہ میں خوش نصیب نہیں تھے۔ ان کی قسمت کا نوشتہ ٹیگور سے بالکل برعکس تھا۔ وہ ایک دیہات میں پیدا ہوئے تھے۔ مہر مادری سے بچپن ہی محروم ہوگئے، لڑکپن آتے آتے ظل پدری بھی سر سے اٹھ گیا اور سوتیلی ماں،

بھائی اور دیگر متعلقین کا بار کفالت گردن پر آپڑا۔

پانچ روپیہ ماہوار کی ٹیوشن کی۔ آدھے میں خود گزر کی اور آدھا اپنے متعلقین کی گزر بسر کے لیے دیتے رہے۔ یہ تھا وہ آزمایش کا زمانہ جس سے منشی پریم چند کے سن شعور کا آغاز ہوا۔ ایسی حوصلہ شکن اور صبر آزما مشکلات میں بڑے بڑے جوان مردوں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں۔ ایک نوعمر ہندوستانی طالب علم سے جس کا کوئی ہمدرد، دستگیر اور رہنما نہیں ایسی سخت کشمکش حیات کے مقابلہ ہی کی امید نہیں کی جاسکتی ادبی شوق کا پیدا ہونا اور قایم رہنا تو امکانات بعید ہیں۔ لیکن　ع

ہر کسے را بہر کارے ساختند

قدرت کو منشی پریم چند کے ہاتھوں ادبی دنیا میں ایک مہم سر کرانا تھی اس لیے جو جوہر ان کی طبیعت میں ودیعت تھے وہ نشو ونما سے کیونکہ محروم رہ سکتے تھے۔ تائید غیبی تھی کہ انھوں نے نہایت صبر و سکون کے ساتھ اس آزمایش کا مقابلہ کیا اور اپنی ہمت اور بلند حوصلگی سے زندگی کے دشوار گزار مرحلے طے کر ڈالے۔ ذوق ادب کو بھی فروغ دے کر اس عظیم الشان مرتبہ پر پہنچا دیا جو معراج کمال کی آخری حد ہے۔ اور وہ بلند نامی و ناموری حاصل کی جو اردو دنیا کے کسی مصنف کو نصیب نہیں ہوئی۔ اپنے ملک کے گوشے گوشے میں تو آپ مشہور و معروف تھے ہی بیرون ملک میں بھی بہت سی قوموں میں آپ کی تصنیفات ترجمہ ہو کر مقبول ہوئیں اور خراج تحسین و آفریں حاصل کر کے رہیں۔ آپ نے اپنے ادبی مشغلہ کے لیے ابتدا میں اس زبان کو منتخب کیا جو کم سے کم ممالک متحدہ کی مادری زبان سمجھی جاتی ہے اور جس کو بہ نسبت ہندی کے اردو کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ لیکن یہ حقیقت بھی اس زبان سے کس قدر دل برداشتہ کر دینے والی حقیقت ہے کہ اس کا سہارا لے کر آپ اپنا رزق بھی پیدا نہ کر سکے۔ متعلقین کو کیا امداد دے سکتے تھے۔ آپ کو بہت جلد اس کس پرسی کا احساس ہو گیا اور آپ نے اپنے ادبی مشاغل کا رخ ہندی زبان کی طرف پھیر دیا۔ ہندی کے قدر دانوں نے سر آنکھوں پر جگہ دی اور آپ رفتہ رفتہ اطمینان و آسودگی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ ساتھ ہی ساتھ ملازمت کے اس قید و بند سے بھی آپ کو رستگاری حاصل ہو گئی، جس کے اثرات دل کو آلودہ، دماغ کو بیکار اور روح کو تاریک کر دیتے ہیں، اور جو خواب و خیال سے بھی آزادی کی قوت سلب کر لیتے ہیں۔

اگرچہ ہندی آپ کے لیے ایک برکت ثابت ہوئی لیکن اردو کی محبت نے بھی آپ کو اپنی طرف سے بیگانہ نہیں ہونے دیا آپ ان تمام حوصلہ شکن اور مایوس کن دشواریوں کے باوجود اردو کے حقوق فراموش نہ کر سکے اور دل و جان سے اس کی خدمت بھی تادم مرگ انجام دیتے رہے۔ بلکہ جس سخت کشمکش

ہیں اردو زبان کو اس کے نادان دوستوں نے ڈال کر ہندی کا رقیب بنا دیا ہے اس سے آپ کا دل بہت متاثر تھا اور اردو کے موافقین ومخالفین کی افراط وتفریط سے جو خطرات اس زبان کے لیے پیدا ہو گئے تھے ان کے مٹانے کے لیے اپنی زبان کو ہندوستانی (وہ زبان جو ہندو مسلمان دونوں قوموں کی صحیح معنی میں ترجمان ہو) بنا دینے کے لیے جو مساعی جمیلہ آپ نے کیں وہ اس قابل ہیں کہ دلدادگان اردو ان کو شمع ہدایت بنالیں ورنہ اردو ہندی کی رقابت کبھی نہ مٹ سکے گی اور نہ اردو ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان بن جانے کی منزل کی طرف ترقی کر سکے گی۔

یہ بحث بہت وسیع ہے یہاں جملہ معترضہ کے طور پر اس کا ذکر آ گیا ورنہ میں عرض تو یہ کر رہا تھا کہ منشی پریم چند آخری وقت تک اردو زبان کی بھی خدمت انجام دیتے رہے اور آپ کے ادبی کارنامے اس زبان کے شیدائیوں سے بھی خاموش داد لیتے رہے، رفتہ رفتہ آپ نے اردو کے خزانہ کو بھی ایسی بیش بہا اور نادر متاع سے مالا مال کر دیا جو آپ اپنی نظیر ہے۔

اردو میں افسانہ نگاری کی ابتدا ''فسانہ آزاد'' سے ہوئی۔ اس عجیب وغریب افسانہ کا چار دانگ عالم میں ڈنکا بج گیا۔ اس گرانقدر تصنیف کے ایک ایک فقرے ایک ایک لفظ میں جادو کا سا اثر ہے۔ چند سطریں پڑھ لینے کے بعد کیسا ہی ثقہ اور خشک مغز کیسا ہی غبی اور غص آدمی کوئی کیوں نہ ہو ایک متحرک پتلا بن کر افسانہ کی کیفیتوں کا جزو بن جاتا ہے اور بے اختیار کبھی مسکراتا ہے، کبھی قہقہہ لگاتا ہے، کبھی مرعوب وخائف ہو جاتا ہے کبھی رونے لگتا ہے، غرض وہ زبردست جادوگر جس کا نام رتن ناتھ سرشار ہے جو ناچ اسے نچاتا چاہتا ہے ناچتا چلا جاتا ہے۔ سرشار کے بعد یہ سحر کارانہ رنگ ناپید ہو گیا۔ ایک مدت گزر جانے پر اردو کی قسمت جاگی اور منشی پریم چند کے قالب میں روح ادب نے جنم لیا۔ جس کو آپ کے وسیع مشاہدہ، بلند معیار اخلاق اور وسعت نظر نے ایسے ایسے حقیقی دل فریب، اور پاکیزہ مرقعوں میں پیش کیا ہے جس کی مثال اردو ادب میں نہیں ملتی، آپ کے افسانوں میں مافوق الفطرت موکل یا انسان نظر نہیں آتے بلکہ یہی عام انسان ہیں جن سے ہماری دنیا آباد ہے، لیکن آپ نے ان عام انسانوں کی نفسیاتی خصوصیات کا اس قدر صحیح اور مکمل نقشہ کھینچا ہے۔ کہ یہ انسان مخصوص کردار بن گئے ہیں۔ افسانوں میں جو واقعات ہیں وہ بھی نوع انسان کے فطری مقتضیات سے بالاتر یا کسی خصوصیت میں مختلف نہیں۔ وہی معاملات ہیں جو روزمرہ کی زندگی میں پیش آتے رہتے ہیں اور دیکھنے والوں کو عام طور پر کچھ متاثر نہیں کرتے اور اگر کرتے بھی ہیں تو صرف اتنا کہ لبوں پر کبھی ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی یا تعجب سے ذرا آنکھوں کے پلک اوپر کو چڑھ گئے اور تھوڑی نیچے کو کھینچ گئی یا کوئی افسوس یا تحسین کا کلمہ زبان پر آ گیا۔ لیکن ایک شاعر یا افسانہ نگار انھیں چھوٹی

چھوٹی باتوں کو اس انداز سے نمایاں کرتا ہے کہ وہ غیر فطری بھی نہیں ہونے پاتیں اور پڑھنے والے کے دل پر ایک مقناطیسی اثر بھی ڈال دیتی ہیں۔ منشی پریم چند کے افسانوں کی بھی یہی خصوصیت ہے۔ پھر افرادِ افسانہ کے حرکات و سکنات، خصائل و شمائل، جذبات و کیفیات، اعمال و افعال میں اتنی ہی گوناں گونی ہے جتنی نوعِ انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اس خصوصیت کے اعتبار سے اس قلبِ انسانی کے ہمسر کامل اور جذبات کے پکے ماہر کو اگر ہم ہندوستان کا شکسپیر کہیں تو بالکل مبالغہ نہ ہوگا۔ اگر اس فطرتِ انسان کی چلبولی و بوقلمونی کے اندازِ بیان پر نظر کی جائے تو ہر ہر لفظ پر پڑھنے والے کے قلب کی حالت اس کیفیت و مسرت کے ساتھ بدلتی چلی جاتی ہے۔ جس طرح برسات کے موسم میں افق پر جلوہ فرما سورج کی کرنیں ابر کے ٹکڑوں میں مسلسل رنگینی کے عالم پیدا کرتی اور مٹاتی رہتی ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شاعری اور افسانہ نگاری کی حدیں مل جاتی ہیں، اور مصنف کی قدرتِ خلاقی کو دیکھ کر اُسے خدایانِ ادب میں تسلیم کر لینا پڑتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس یگانۂ روزگار نباضِ فطرت اور معجز نگار انشا پرداز کی شاندار ادبی فتوحات پر مکمل تبصرہ کرنے کے لیے سب سے پہلے اس کے تمام مجموعۂ تصنیفات کا وسعتِ نظر کے ساتھ گہرا مطالعہ کرنا لازمی ہے جس کے لیے بہت فرصت چاہیے پھر ان پر شرح و بسط کے ساتھ لکھنے کے لیے بھی ایک دفتر درکار ہے۔ مجھے اس اہم خدمت کے انجام دینے کے لیے نہ وقت نصیب ہے نہ یکسوئی۔

منشی پریم چند انگریزی میں عالمانہ دستگاہ رکھنے کے بدولت فکرِ معاش کی پریشانیوں سے امن میں رہ سکتے تھے۔ ہندی کی طرف ان کا متوجہ ہو جانا ان کے لیے اور نیز قوم کے لیے ایک فالِ مبارک ثابت ہوا۔ شہرت و عظمت نے سر آنکھوں پر جگہ دی اور ایک دن وہ آیا کہ دنیائے ادب نے انہیں اقلیم افسانہ نگاری کا تاجدار تسلیم کر لیا۔ اگر خدا نہ کرتا وہ انگریزی زبان سے نابلد ہوتے اور ہندی میں بھی قدرتِ کاملہ نہ بہم پہنچا سکتے تو ان کا کیا انجام ہوتا اور ان کے خداداد جوہروں کی کیا گت ہوتی اس کے تصور سے دل لرزتا ہے۔

یہ بھی ہزار ہزار شکر کا مقام ہے کہ یہ باکمال حضرات جو درخشاں تارے آسمان سے توڑ کر لائے، وہ کچھ عرصہ کے لیے فنا ہو جانے سے محفوظ ہیں یعنی ان کے ادبی کارنامے کتابی صورتوں میں منتقل ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن جب تک ان کارناموں کو ارتقائے ادبِ اردو کی زنجیر کا ایک مستقل جزو نہیں بنایا جائے گا یہ تمام کارنامے اور خدمات رائیگاں ہیں۔ رواں، برق اور منشی پریم چند موجودہ دور سے متعلق ہیں۔ ان کے کارناموں سے ابھی کان آشنا ہیں۔ ان سے پیشتر دور کے مشاہیر کی ایک دھندلی سی یاد ان

لوگوں کے دلوں میں باقی ہے جن کی آنکھوں کو ان کی شمع فکر کی تابانیوں نے خیرہ کر دیا تھا۔ یہ بزرگ کون تھے؟ یہ بزرگ حضرات نظر لکھنوی، سرور جہان آبادی اور برق سیتاپوری (منشی جوالا پرشاد صاحب مثنوی بہار) تھے۔ ان سے پیشتر دور کی طرف اگر نگاہیں دوڑائی جائیں تو بہت دور جا کر سرشار و نسیم نظر آتے ہیں جن کے بعد یعنی ان سے پہلے دوروں میں اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا ہے جہاں سے نگاہ تجسس مایوس ہو کر چار ناچار پلٹ آتی ہے۔ عقل، قرائن اور موجودہ مثالیں تو یہ چاہتے ہیں کہ ایسی ایسی جلیل المرتبت ہستیاں ابتدائے زبان اردو سے ہر دور میں ملنا چاہئے مگر نہیں ملتیں۔ یہ ایک دل خراش حقیقت ہے لیکن حقیقت ہے، اس کو کیا کیا جائے۔ کیوں نہیں ملتیں اس کے جواب میں جب کبھی لکھے جائیں گے۔ دفتر کے دفتر لکھے جائیں گے۔ یہاں صرف مقصود گذارش یہ ہے کہ اس کسمپرسی اور ناقدر شناسی کے حالت سے جن دلدادگان ادب کا دل پانی پانی ہوتا ہے اور کلیجہ دکھتا ہے اور جو اس دھبے کو اردو کے لیے باعث ننگ سمجھتے ہیں۔ وہ اب کوئی ایسا کام کر دکھائیں جس سے منشی پریم چند ہی کا نام ہمیشہ کے لیے زندہ نہ رہے، بلکہ ان متوسطین و متقدمین مشاہیر ادب کو بھی جو فراموش کر کے گمنام کر دیے گئے ہیں، حیات تازہ و ابدی میسر ہو۔ ورنہ جس طرح وہ فنا ہو کر بے نام و نشاں ہو گئے یہ بھی ہو جائیں گے اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔

تھی بزم ادب جن کے اثر سے پُر نور　　　　بے نام و نشاں ہیں آہ وہ اہل شعور
زندہ رہنا اگر ہمیں ہے منظور　　　　کچھ ان کی بقا کا آج ساماں کر لیں

یہ عجیب بات ہے کہ نیکی میں جتنی نفرت ہوتی ہے بدی میں اتنی ہی رغبت۔ عالم عالم کو دیکھ کر، سادھو سادھو کو دیکھ کر، شاعر شاعر کو دیکھ کر جلتا ہے ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا مگر جواری جواری کو دیکھ کر شرابی شرابی کو دیکھ کر چور چور کو دیکھ کر ہمدردی جتاتا ہے۔ مدد کرتا ہے۔ ایک پنڈت جی اگر اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر گر پڑیں تو دوسرے پنڈت جی انھیں اٹھانے کے بجائے دو ٹھوکر اور لگائیں گے کہ وہ پھر اٹھ ہی نہ سکیں۔ مگر ایک چور پر آفت آتے دیکھ کر دوسرا چور اس کی آڑ کر لیتا ہے۔ بدی سے سب نفرت کرتے ہیں اس لیے بدوں میں باہمی محبت ہوتی ہے۔ نیکی کی ساری دنیا تعریف کرتی ہے اس لیے نیکوں میں مخالفت ہوتی ہے۔ چور کو مار کر چور کیا پائے گا؟ نفرت۔ عالم کی توہین کر کے عالم کیا پائے گا؟ نیک نامی۔

(فردوس خیال)　　　　　پریم چند

پریم چند اور ہندوستانی زبان

پروفیسر رام پرشاد کھوسلا۔ ایم اے۔ آئی ای ایس

منشی پریم چند کی بے وقت موت سے جو نقصان ہندوستان کی ادبی دنیا کو پہنچا ہے وہ ہر تعلیم یافتہ شخص پر ظاہر ہے۔ اردو اور ہندی کے صف اولیں کے مصنفوں میں ایک جگہ ہمیشہ کے لیے خالی ہو گئی ہے ان کی دلچسپ داستانوں سے کون واقف نہیں۔ انھوں نے مشرقی تمدن کے مختلف پہلوؤں پر ایک نئی روشنی ڈالی ہے اور اس کا مقابلہ مغربی تہذیب کے ساتھ کیا ہے اور دونوں کے نتائج اپنے دلچسپ افسانوں میں ظاہر کیے ہیں۔ انھوں نے کتاب زندگی کا خوب مطالعہ کیا اور زندگی کے بھید کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیئے۔ ان کی داستانیں زندگی کی گوناگوں دلچسپیوں سے بھری ہوئی ہیں۔

منشی پریم چند ایک اعلیٰ درجے کے ناولسٹ تھے اور مشرقی تہذیب کے ہر پہلو سے پوری واقفیت رکھتے تھے ان کے خیالات کی وسعت اور ان کے جذبات کی گہرائی قابل تعریف ہے۔ انھوں نے ہمارے تمدن کی ایک صحیح تصویر کھینچ کر ہمارے سامنے رکھ دی ہے۔ ہندوستانی ناول کی تاریخ میں ان کا نام لوگ ہمیشہ ادب اور عزت کے ساتھ لیں گے اور ان کا بار احسان تاابد ہمارے سر پر رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بے وقت موت پر ملک کے ہر حصے میں اظہار افسوس ہوا۔ جابجا ماتمی جلسے منعقد ہوئے اور ہر طبقے کے لوگوں کو دلی صدمہ ہوا اور ان کی یادگار قائم رکھنے کے لیے مختلف اقسام کی تجاویز پیش ہو رہی ہیں۔

منشی پریم چند جس طرح اردو کے شیدائی تھے اسی طرح ہندی پر بھی جان دیتے تھے۔ وہ مشکل الفاظ کے استعمال کی مرض میں مبتلا نہ تھے۔ ان کی زبان عام فہم ہے اسی وجہ سے ان کی تصانیف مقبول خاص و عام ہیں۔ ان کا نقطۂ نگاہ بہت وسیع تھا اور انھوں نے اپنے آپ کو کبھی تنگ نظری کا شکار نہیں ہونے دیا۔ ان کو اردو اور ہندی دونوں زبانوں سے اعلیٰ درجے کی واقفیت تھی اور انھوں نے دونوں کی خدمت بھی پوری تندہی سے کی۔ اس طرح گویا انھوں نے دونوں زبانوں کو ایک بنا دیا اور صرف رسم خط کا فرق رہ گیا۔

نہ وہ اردو کے ان مصنفوں میں تھے جنہوں نے فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت سے اپنی زبان کو نہایت مشکل بنا دیا ہے۔ اور نہ وہ ہندی کے ان لیکھکوں میں تھے جن کی بھاشا سنسکرت کے شبدوں کی بہتات کے سبب اس قدر کٹھن ہو گئی ہے کہ پڑھنے والا قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا ہے۔ ان کی زبان کسی خاص فرقے سے تعلق نہ رکھتی تھی بلکہ سارے شمالی ہندوستان کی زبان تھی۔ آج کل سب سے بڑی ضرورت ملک کی یہی ہے کہ زبان عام فہم ہو۔ خواہ وہ اردو رسم خط میں لکھی جائے خواہ دیوناگری حروف میں۔ بہر حال رسم خط کے سوال سے قطع نظر منشی پریم چند مرحوم کی زبان ہندوستانی زبان کہلانے کی مستحق ہے۔ اور یہی زبان ہندوستان کی قومی زبان ہو سکتی ہے۔ اگر اردو اور ہندی کے مصنف منشی پریم چند کی تقلید کریں تو زبان کے دل خراش سوال کا جو آج کل ملک کے سامنے پیش ہے ایک حد تک خود بخود حل ہو جائے گا۔

بہ حیثیت مصنف پریم چند کا مرتبہ

بنگال کے نامور فسانہ نگار شرت چندر چٹوپادھیائے کی رائے ہے:۔

"رابندر ناتھ ٹیگور کی تو بات ہی اور ہے لیکن مختصر کہانیوں میں پریم چند کا مرتبہ بہت بلند ہے۔"

سری مہیندر لکھتے ہیں کہ:۔

"ہندی میں گوسوامی تلسی داس کے بعد اگر کوئی مصنف عوام میں ہر دل عزیز ہوا ہے تو وہ صرف منشی پریم چند جی تھے۔"

مرہٹی زبان کے نامور مصنف پنڈت آنند راؤ جوشی جنہوں نے پریم چند کی کئی کتابوں کا مرہٹی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:۔

"پریم چند" ہندوستان کے اعلیٰ رہنمائے فن تھے۔ ان کے شاہکار دوسری زبانوں میں اسی شوق دلچسپی اور احترام سے پڑھے جاتے تھے جیسے اردو اور ہندی میں۔"

رائے بہادر شیام سندر داس سیکریٹری ناگری پرچارنی سبھا۔ بنارس رقم طراز ہیں کہ:۔

"منشی پریم چند نے ہندی زبان اور لٹریچر کا مرتبہ بلند کیا ہے۔ آپ نے اسے معراج کی منزل تک پہنچایا ہے۔ آپ کی کتابوں کا ترجمہ ہندوستانی زبانوں ہی میں نہیں بلکہ جاپانی زبانوں میں بھی ہوا ہے۔

منشی پریم چند مصورِ جذبات

(از شیوکماری دیوی دخترِ حضرت جگر بریلوی)

قدرت نے منشی پریم چند کو شاعر کا دماغ اور مصور کا قلم عطا کیا تھا جس نے ایسے ایسے گلہائے مضامین کھلائے کہ دنیا دنگ رہ گئی۔ حضرت سرشار کے بعد اگر افسانہ نویسی کو کسی نے معراج بخشی تو وہ آپ ہی کی ذات گرامی تھی جس کے قلم معجز نگار نے روزانہ کے معمولی واقعات کو جو ہماری زندگی میں کثرت سے رونما ہوتے ہیں افسانہ کا جامہ پہنا کر ایسا دلچسپ بنا دیا کہ بار بار پڑھنے پر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی اور سچ تو یہ ہے کہ آپ افسانہ نگار نہیں بلکہ واقعہ نگار یعنی آپ نے افسانہ کو واقعہ بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے افسانوں کو قبول عام کی سند حاصل ہوئی مرحوم نے جو سرمایۂ تصنیفات چھوڑا ہے اس میں کئی سو افسانے اور ناول ہیں، اگر ان کے ہر پہلو کو غور سے دیکھا جائے تو یہ ہر اعتبار سے افسانہ نویسی کے معیار پر پورے اتریں گے۔ اس معیار کو دو پہلوؤں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک صوری اور دوسرا معنوی۔ صوری معیار میں زبان، محاورہ، اور طرز بیان شامل ہیں اور معنوی میں جذبات نگاری، واقعہ نگاری، منظر نگاری اور کردار نگاری ہیں، جذبات نگاری اور کردار نگاری میں تو مرحوم کو کمال حاصل تھا۔ آج کل افسانہ نویسوں کی کمی نہیں، کوئی رسالہ یا اخبار ایسا نہیں جس میں افسانے نہ نکلتے ہوں۔ مگر بہت کم افسانے ایسے ہوتے ہیں جو معیاری کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ جہاں کہیں کسی افسانے میں جذبات نگاری کا موقعہ آیا مرحوم کی فکر رسا ان میں جذب ہو گئی۔ اور ان کی ایسی صحیح پُر اثر کیفیتیں پیش کر دیں کہ پڑھنے والا بھی ہمہ تن ان کا جزو بن گیا اور لطف یہ کہ سیکڑوں طرح کے جذبات ایک ہی قلم سے صورت پذیر ہوئے ہیں مگر سب اپنی اپنی کیفیت میں علیحدہ اور حقیقی ہیں۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر کردار کے دل میں مصنف بیٹھا ہوا ہے اور اس کا قلم جذبات کی زبان بن کر بولتا چلا جاتا ہے۔

جذبات و واقعات کی صحیح ترجمانی اور ان کی ایسی تصویریں کھینچنا جن سے حالت وقت کا منظر

آنکھوں کے سامنے پھر جائے حقیقی شاعری ہے۔ خواہ وہ نظم ہو یا نثر۔ کیونکہ شاعر اور افسانہ نگار ایک ہی چمن کے دو باغبان ہیں، صرف ان کی طرز چمن بندی میں اختلاف ہے۔ ایک گلاب کی قلم لگاتا ہے دوسرا چنبیلی کی یعنی شاعر جذبات یا واقعات کو وزن اور قافیہ کی قیود میں ادا کرتا ہے جس سے دلکشی کے ساتھ ساتھ طبیعت میں ایک وجدانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ افسانہ نگار نثر کا سادہ لباس پہناتا ہے۔ دوسرا اختلاف یہ ہے کہ شاعر زیادہ تر اپنے ہی جذبات وواقعات کا مترجم ہوتا ہے، افسانہ نگار تمام دنیا کے دل کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کے قلم سے ہر طبقہ، ہر حیثیت اور ہر طبیعت کے افراد خلق ہوتے ہیں۔

منشی پریم چند کے افسانے انشا پردازی اور افسانہ نگاری دونوں کی جان ہیں۔ اگر ایک افسانہ پڑھ کر طبیعت میں شگفتگی اور سرور پیدا ہو جاتا ہے اور دل میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے تو دوسرا افسانہ پڑھ کر بے اختیار آنسو نکل پڑتے ہیں اگر چہ پڑھنے والا جانتا ہے کہ یہ محض افسانے ہیں، مگر کچھ اس انداز سے لکھے گئے ہیں کہ پڑھتے پڑھتے آدمی ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن جاتا ہے۔ کبھی ہنستا ہے۔ کبھی روتا، کبھی برہم ہوتا اور کبھی مایوس ہوتا ہے۔ غرض مصنف کا قلم جو ناچ اسے نچاتا ہے ناچتا چلا جاتا ہے۔ گویا خود بھی ان کرداروں میں سے ایک بن جاتا ہے۔ مرحوم کا ایک افسانہ ''کفارہ'' میں اپنی ماں کو سنا رہی تھی، میرا چھوٹا بھائی بھی وہیں بیٹھا تھا۔ یکا یک سسکیوں کی آواز آئی دیکھا تو میرا چھوٹا بھائی زار و قطار رو رہا ہے، ماں اور بہن کی آنکھوں میں بھی آنسو چھلک رہے تھے مگر وہ ضبط کیے تھیں۔ میں نے بھائی سے سبب پوچھا تو کوئی جواب نہ دیا۔ اور جواب بھی کیا تھا یہ افسانہ سن کر جو اثر ان کے ننھے سے دل پر ہوا اس کا اظہار بجز آنسوؤں کے کس طرح ہو سکتا تھا۔ کیونکہ جب دل پر کوئی شدید کیفیت طاری ہوتی ہے تو زبان اس کی ترجمانی سے قاصر رہتی ہے اور آنکھ زبان کا کام انجام دیتی ہے۔

یوں تو منشی پریم چند کا نام ابد تک قائم رہے گا اور لوگ آپ کے افسانے پڑھ پڑھ کے سر دھنیں گے، مگر اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس یگانہ روزگار ہستی کی یادگار قائم رکھنے کی اہل وطن کیا کوشش کرتے ہیں۔ مرحوم کی یہ عظیم الشان خدمات مستحق تو اس صلہ کی ہیں کہ آپ کی ایک نہایت مستحکم و مستقل یادگار ہی نہ قائم کی جائے بلکہ آپ کے نام پر ایسی انجمنیں اور ادارے قائم کیے جائیں جن سے علم و ادب کی حقیقی خوبیوں کے سرچشمے رواں ہوں۔

منشی پریم چند کی مصوّری

از مسٹر "سلیم جعفر"

فسانہ نگار اور مصور میں کوئی حقیقی فرق نہیں ہے۔ دونوں واقعات کو لیتے اور انھیں دکھا کر ایک خاص اثر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ان میں کوئی فرق ہے تو وہ مسالہ کا ہے۔ مصوّر خطوط سے کام لے کر انھیں اُجاگر اور موثر بنانے کے لیے رنگ بھرتا ہے۔ فسانہ نویس کے خطوط اس کے کردار ہیں اور اس کا رنگ وہ الفاظ ہوتے ہیں جس میں وہ اپنے کرداروں کو پیش کرتا ہے۔

مصوّر طرح طرح کی لکیریں کھینچ کر وہ تمام چیزیں نظر کے سامنے لاتا ہے جو ذہن میں کسی واقعہ کا تصور پیدا کر سکتی ہیں۔ فسانہ نگار اپنے کرداروں کو پیش کر کے ان کی زبان سے وہ الفاظ ادا کرتا ہے جن سے اشیاء و واقعات کا تصور پیدا ہو۔ جس طرح مصوّر کا فرض ہے کہ وہ طرح طرح کے رنگوں سے کام لے اور ان میں تناسب قائم رکھے اسی طرح فسانہ نگار بھی جب تک قسم قسم کے کردار پیش کر کے ان میں مناسبت قائم نہ رکھے اس کی تصویر بھدی اور بے اثر ہوگی۔ مصوّر کو تصویر کی فضا بھی دکھانی پڑتی ہے۔ فسانہ نگار کو بھی اس سے چارہ نہیں۔ وہ بھی لفظوں کی مدد سے ایک فضا پیدا کرتا ہے جس کے اندر رہ کر اس کے کردار عمل کرتے ہیں۔ اس لیے کسی افسانہ نگار کے کام کا صحیح صحیح اندازہ لگانے کے لیے ضرور ہے کہ پہلے یہ سمجھ لیا جائے کہ اس کے فسانہ کا موضوع کیا ہے۔ یعنی کسی اثر کے پیدا کرنے کے لیے اس نے کس واقعہ کو چنا ہے اور پھر اس واقعہ سے متعلق جس جس طرح کے اور جن جن کرداروں کی ضرورت ہے اس نے انھیں پیش کیا یا نہیں، "جن الفاظ میں انھیں پیش کرنا تھا یا جو باتیں اسے لکھنی چاہئے تھی اس نے وہی لکھے اور اس کے کرداروں کے منھ سے وہی باتیں نکلیں یا کہیں لغزش ہوگئی، اور فضا مناسب حال ہے یا غیر متعلق۔" منشی پریم چند صاحب مرحوم کے افسانوں کو اس کسوٹی پر کسنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک چابک دست مصوّر اور ماہر فن تھے۔

ہندوستانیوں کا عام خیال ہے کہ سوتیلی ماں بچوں کو اچھی طرح نہیں رکھتی اور بچوں کے باپ اکثر اس بارے میں اپنی دوسری بیوی سے بدگمان رہتے ہیں۔ لیکن بدگمانی بہرحال بدگمانی ہے اس لیے اکثر اس کی کچھ اصلیت نہیں ہوا کرتی۔ پریم چند ملک میں یہ خیال پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ واقعات کی تفسیر بدگمانی کے رنگ میں نہ کرنی چاہئے بلکہ حقیقت کو تلاش کرنا ضروری ہے چنانچہ اپنے مشہور قصہ ''سوتیلی ماں'' میں انھوں نے چار کردار مقرر کیے ہیں۔ (1) ایک وہ شخص جس کی بیوی مرچکی ہے اور اس نے دوسری شادی کر لی ہے۔ (2) پہلی بیوی سے اس کا لڑکا۔ (3) دوسری بیوی یا اس لڑکے کی سوتیلی ماں۔ (4) ایک دوست۔

غور کیجئے کہ یہ انے گئے کردار کس قدر ضروری ہیں۔ آپ ان میں سے ایک کو بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ چوتھا بظاہر بیکار نظر آتا ہے لیکن یہ اس لیے ضروری ہے کہ بیوی کی طرف سے شوہر کو جو بدگمانی ہے اس کے صحیح یا غلط ہونے کا پتہ صرف بچہ کے ذریعے سے لگ سکتا ہے اور بچہ چونکہ طبعاً اپنی سوتیلی ماں کے سامنے اس کی شکایت نہیں کرسکتا اس لیے اس کو ایسا موقع ملنا چاہئے جہاں وہ کھلم کھلا اپنے خیالات ظاہر کر سکے۔ یہ موقع تنہائی میں بھی مل سکتا ہے لیکن اس صورت میں ضروری ہے کہ وہ لڑکے سے خود پوچھے کہ اس کی سوتیلی ماں اس سے کس طرح پیش آتی ہے۔ لیکن اس سوتیلی ماں کا بچہ کے ساتھ ایسا برتاؤ ہے کہ بچہ سے وہ اس قسم کا سوال ہی نہیں کرسکتا۔ اس کے دل میں صرف چور ہے اور اس بدگمانی کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بچہ سے سوال کرنے سے افسانہ کی نزاکت میں فرق پڑتا ہے۔ اگر اس نے کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جس نے اسے بیوی کے بُرے برتاؤ کا یقین دلایا ہے تو بچے سے پوچھنا ہی فضول ہے۔ اس کا تدارک کرنا چاہئے۔ اس نے اپنی آنکھ سے کچھ نہیں دیکھا بچہ نے کچھ نہیں کہا۔ وہ اس کی باتوں اور حرکتوں سے بیوی کے برتاؤ کا حال معلوم کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے اس سے اچھا موقع کون سا ہوسکتا ہے کہ بچہ سے دوست کے ہاں ایک ایسی حرکت سرزد ہوجائے جس سے اس کی بدگمانی یقین کا درجہ حاصل کر لے۔ اس لیے یہ کردار نہایت ضروری ہے اور مصنف نے اسے ایسے تین کرداروں میں شامل کر کے اپنے ماہر فن ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

پہلا کردار اس خیال کا مرکز ہے کہ اکثر لوگ بیوی کے مرجانے پر محض اس وجہ سے مجبوراً شادی کر لیتے ہیں کہ مرحومہ کی اولاد کو آرام ملے۔ چنانچہ اس نے شادی کر لی لیکن وہ اپنے دل سے اس خیال کو نہ نکال سکا کہ سوتیلی ماں اس کے بچہ کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرسکتی کیونکہ عام خیال یہ بھی ہے کہ اولاد ماں کا کلیجہ چھو کر پیٹ سے نکلتی ہے۔ سوتیلی ماں وہ ہستی تو کسی طرح ہوسکتی نہیں جس کا کلیجہ چھو کر وہ لکا ہے پھر

اس سے سچی محبت اور مادرانہ برتاؤ کی کیسے امید ہو سکتی ہے۔ جسے ماں کی ممتا کہتے ہیں۔ بہرحال شادی کرنے کے بعد وہ بچہ کی طرف سے بےفکر نہیں ہے اور نہ اپنی بیوی کی طرف سے اطمینان ہے، اس لیے ایک واقعہ پیش آتے ہی اس کی بدگمانی میں جان پڑ جاتی ہے جو سوتیلی ماں کے اچھے برتاؤ کی وجہ سے دبی ہوئی تھی اور وہ فوراً اس کے برتاؤ کو بدگمانی کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ یہ بدگمانی اس وقت جاکر دور ہوتی ہے جب بچہ خود اپنی ماں کے اچھے برتاؤ کا ثبوت دیتا ہے۔

دوسرا کردار خود بچہ ہے۔ ماں کے مرجانے سے وہ باوجود سوتیلی ماں کے اچھے برتاؤ کے دل گیر رہتا ہے۔ یہ پہلے اور تیسرے کردار میں واسطہ کا کام دیتا ہے۔ اس کردار کے بغیر افسانہ کا تیار ہونا ہی ممکن نہیں۔ کیونکہ پہلے اور تیسرے کردار کو کام کرنے کا موقع تبھی مل سکتا ہے۔ جب یہ دوسرا کردار موجود ہو۔ وہ دونوں کردار گویا عامل ہیں اور یہ معمول۔

فسانہ بہ لحاظ خدوخال کامل ہے۔ اگر اس میں کوئی پانچواں کردار داخل کر دیا جاتا تو اس کی رفتار سست پڑ جاتی اور لطف زائل ہو جاتا۔

ان چاروں کرداروں کے عمل میں تناسب بھی نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ یہ "افسانہ شعور تناسب"¹ کی بھی ایک قابل قدر مثال ہے۔ یہ اس قسم کے افسانوں میں نہیں ہے جن کی جان مکالمے ہوا کرتے ہیں۔ بلکہ یہ اس نوع کا ہے جسے میں "حکایتی" افسانہ سے تعبیر کرتا ہوں جس میں کوئی شخص اپنے یا کسی اور کے تجربات و واردات کسی کو سناتا ہے۔ ایسے افسانوں میں مکالمہ کی بہت کم گنجائش ہوا کرتی ہے اور ہر کردار منظر پر صرف اُتنی ہی دیر رہتا ہے جب تک اس کی اشد ضرورت ہے۔ چنانچہ افسانہ زیر بحث میں بھی کردار نمبر ا صرف ایک دفعہ نمبر 2 و 3 دو دفعہ منظر پر تھوڑی تھوڑی دیر آ کر غائب ہو جاتے ہیں اور سارا افسانہ کردار نمبر ایک کے خیالات و تاثرات سے بھرا پڑا ہے کیونکہ درحقیقت مرکز اضافہ یا ہیرو وہی ہے۔

نفسیاتی پہلو سے بھی افسانہ میں کوئی کمی نہیں ہے چنانچہ سرشت انسانی کے ایک کمزور پہلو کو اس طرح دکھاتے ہیں۔

> "میں مکان کی طرف چلا تو سوچنے لگا کہ کیوں کر اپنے غصہ کا اظہار کروں۔ کیوں نہ منھ ڈھانپ کر لیٹ رہوں؟ امبا پوچھے تو ترش ہو کر کہہ دوں۔ سر میں درد ہے۔ مجھے دق مت کرو۔ کھانا کھانے کو اٹھائے تو کرخت لہجہ میں جواب دوں۔

SENSE OF PROPORTION !

اسے ضرور سمجھ جائے گی کہ کوئی بات میری طبیعت کے خلاف ہوئی ہے۔ خوشامد کرنے لگے گی۔ اس وقت طنز وطعن سے اس کا کلیجہ چھلنی کر دوں گا۔ ایسا رلاؤں کہ وہ بھی یاد کرے۔

پھر خیال آیا اس کا ہنس مکھ چہرہ دیکھ کر مجھے اپنے دل پر قابو بھی رہے گا۔ اس کی ایک میٹھی بات میرے غیظ وغضب کا سارا ہوائی قلعہ ڈھا دے گی۔

اس کمزوری پر میری طبیعت جھنجھلائی۔ یہ میری کیا حالت ہے۔ کیا اتنی جلدی ہوا کا رخ بدل گیا؟ مجھے دعویٰ تھا کہ میں بہلاوے کی باتوں اور سخن ہائے دل آویز کے سیلاب میں بھی اٹل رہ سکتا ہوں۔ اب یہ کیفیت ہے کہ ان ہلکے جھوکوں کے بھی متحمل ہونے کی تاب نہیں! اس ملامت نے میرے دل کو مضبوط کیا۔ تاہم ایک ایک قدم پر غصے کی باگ زور ڈھیلی ہو جاتی تھی۔ آخر میں نے طبیعت پر زور ڈال کر ایک فرضی و نقلی غصہ کی کیفیت پیدا کی اور ارادہ کیا کہ چلتے ہی چلتے برس پڑوں گا۔ ایسا نہ ہو تاخیر کی ہوائیں اس ابر خشک کو اڑا لے جائیں۔"

افسانے کی کامیابی میں لطیف بیان کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ اس میں بھی کوئی کمی نہیں۔ ملاحظہ ہو:-

"بیوی کی وفات کے تین ہی ماہ بعد دوسری شادی کرنا مرنے والے کے ساتھ ایسی بے وفائی اور اس کی روح پر ایسا ستم ناروا ہے کہ اس کی تاویل عذر گناہ بدتر از گناہ ہے۔ میں نہ کہوں گا کہ یہ مرحومہ کی آخری وصیت تھی۔ اور نہ شاید میرا یہ عذر ہی قابل پذیرائی سمجھا جائے کہ ہمارے کم سن بچے کے لیے ماں ایک لازمی کیفیت تھی۔ پر اس معاملہ میں میرا ضمیر بالکل صاف ہے اور مجھے یقین ہے کہ برزخ میں میرا یہ فعل زیادہ سرزنش کے قابل نہ سمجھا جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ میں نے شادی کی۔"

غرض منشی صاحب مرحوم اپنے فن میں کامل و یکتا تھے اور یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر گریہم بیلی نے گو اپنے تصنیف تاریخ ادب اردو میں اس کا التزام کیا تھا کہ جو مصنف بقید حیات ہیں ان کا ذکر نہ کریں گے پھر بھی وہ اردو کا افسانہ سناتے سناتے مرحوم کا ذکر کر ہی گئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

"ناولوں کی بھرمار ہوتی جا رہی ہے لیکن ابھی تک کوئی ایسا بڑا ناول نگار پیدا نہیں ہوا جو کریکٹر کے ارتقاء کی تصویر کھینچ سکے اور پلاٹ تیار کر سکے۔ فسانہ نگاری ترک کر کے طویل ناول شروع کرنے سے پہلے پریم چند ...... نے اس باب میں قریب قریب ایک بلند درجہ حاصل کر لیا۔ ان کے افسانے بہت قابل تعریف ہوتے تھے۔"

منشی پریم چند کی تمنائیں

3/ جون 1930ء کو منشی پریم چند نے پنڈت بنارسی داس صاحب چترویدی ایڈیٹر وشال بھارت کلکتہ کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ:

''میری تمنائیں بہت محدود ہیں۔ اس وقت سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ ہم اپنی جنگ آزادی میں کامیاب ہوں۔ میں دولت اور شہرت کا خواہشمند نہیں ہوں۔ کھانے بھی کو مل جاتا ہے۔ موٹر اور بنگلے کی مجھے ہوس نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار بلند پایہ تصانیف چھوڑ جاؤں لیکن ان کا مقصد بھی حصول آزادی ہی ہو۔ اپنے دونوں لڑکوں کے لیے بھی میں کوئی منصوبہ نہیں رکھتا۔ صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ ایماندار مخلص اور مستقل مزاج ہوں، عیش پسند اور دولت پرست اور خوشامدی اولاد سے مجھے نفرت ہے۔ میں بے حرکت زندگی کو بھی ناپسند کرتا ہوں۔ ادب اور وطن کی خدمت کا مجھے ہمیشہ دھیان ہے۔ یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دال روٹی اور معمولی کپڑے میسر ہو جائیں۔''

''سونے روپے کے لدا ہوا آدمی کسی بھی حیثیت سے بڑا نہیں ہو سکتا ہے۔ دولت مند کو دیکھتے ہی آرٹ اور علم کے متعلق اس کے بلند بانگ بڑبولوں کو میں دوسرے کان سے نکال دیتا ہوں۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس شخص نے اس سماجی نظام کی تائید کی ہے جو امیروں کے ہاتھوں غریبوں کی خون آشامی پر قائم ہے۔ ایسا کوئی بڑا نام مجھے متاثر نہیں کر سکتا جو دولت کا پجاری ہو۔ ممکن ہے کہ میری ناکام زندگی نے میرے جذبات کو اتنا تلخ بنا دیا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بینک میں کوئی موٹی رقم جمع کرنے کے بعد شاید میں بھی ان جیسا ہو جاتا اور لالچ کا مقابلہ نہ کر سکتا۔ لیکن مجھے فخر ہے کہ فطرت اور قسمت نے میری مدد کی اور مجھے غریبوں کا شریک غم بنا دیا۔ اس سے مجھے روحانی تسکین ملتی ہے۔''

(ایک خط کا اقتباس) — پریم چند

پریم چند کی یاد

از پنڈت بنارسی داس چترویدی ایڈیٹر وشال بھارت کلکتہ

مجھے سب سے پہلے 1924ء میں پریم چند جی سے ملنے کا لکھنؤ میں اتفاق ہوا جب میں لیبر فیڈریشن میں شریک ہونے وہاں گیا تھا، اس وقت وہ "رنگ بھوم" نامی ناول لکھ رہے تھے، مگر انھوں نے مجھے بہت کافی وقت دیا اور ہم لوگ دیر تک مختلف ادبی مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔ جو بات مجھے ان کی سب سے زیادہ پسند آئی وہ یہ تھی کہ ان کا مزاج تکلف اور تصنع سے قطعی پاک تھا۔ حالانکہ ان کی شہرت تمام ملک میں قائم ہو چکی تھی۔ لیکن کسی بات سے بھی یہ ثابت نہ ہوتا تھا کہ وہ خود کو کوئی بڑی چیز سمجھتے ہیں۔ دراصل انھیں اپنے ملنے والوں سے تکلف برطرف کرنے کا ایک خاص ملکہ تھا۔ تھوڑی ہی دیر کی بات چیت میں ان کے ملنے والے ان کی دوستی و رفاقت کا دم بھرنے لگتے تھے۔

اس کے بعد مجھے 1932ء میں ان سے بنارس میں ملنے کا اتفاق ہوا اور دو دن تک انھیں کے مکان پر قیام رہا۔ اس لطف صحبت کو میں تمام زندگی نہ بھول سکوں گا۔

(2)

پریم چند بڑے خوش طبع، حاضر جواب و زندہ دل تھے، وہ آپ کے ساتھ گھنٹوں ہنس سکتے تھے۔ اور اپنی باتوں پر بھی ہنس پڑتے تھے۔ بنارس کی ملاقات کے بعد مجھے پریم چند سے صرف ایک مرتبہ اور ملنے کا اتفاق ہوا۔ حالانکہ خط و کتابت برابر جاری رہی۔ ایک مرتبہ باتوں ہی باتوں میں دن کے دو بج گئے اور کھانا کھانے کی نوبت نہ آئی۔ یہ دیکھ کر پریم چند کہنے لگے کہ اتنا غنیمت ہے کہ مسز پریم چند کے پاس کوئی گھڑی نہیں ہے۔ نہیں تو اس تاخیر کے لیے جھاڑ بتاتیں۔ میں نے اس ملاقات کا جو حال "وشال بھارت" میں لکھا تو اس میں یہ بھی لکھ دیا کہ پریم چند جی کی ہوشیاری دیکھئے کہ گھر بھر میں ایک ہی گھڑی رکھتے ہیں اور وہ بھی اپنے ہی پاس۔ اس کے بعد میں نے پریم چند جی سے پوچھا کہ اب وہ مسز پریم چند کو رسٹ واچ

کب تک لے دیں گے۔ اس کا انھوں نے یہ ظریفانہ جواب دیا کہ جب کوئی اولوالعزم اخبار نویس مسز موصوفہ کے مضامین کا کوئی قابل قدر معاوضہ دے گا تو وہ خود ہی گھڑی خرید لیں گی یا کیا عجب ہے کہ انھیں کوئی گھڑی کسی نیاز مندانہ تحفے میں مل جائے۔

پریم چند کو اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی۔ جب کبھی وہ بنارس سے کہیں باہر جاتے تو مسز پریم چند کو بھی ضرور اپنے ساتھ لے جاتے۔ میں نے ایک دفعہ انھیں مشہور جاپانی شاعر ناگوچی سے ملنے کے لیے کلکتہ مدعو کیا" تو اس کا یہ جواب ملا کہ اس وقت میرے دونوں لڑکے الٰہ آباد میں ہیں اور میں کلکتہ چلا آؤں تو میری بیوی بنارس میں بالکل اکیلی رہ جائیں گی۔ اور اگر ان کو بھی کلکتہ لاؤں تو مفت میں ایک اچھی خاصی رقم درکار ہوگی۔ اس لیے روپیہ کی زیر باری سے مکان ہی پر رہنا مناسب ہے۔"

اس کے بعد میں نے کئی دفعہ انھیں کلکتہ آنے کی دعوت دی مگر انھوں نے یہی جواب دیا کہ کوئی موقعہ ہو تو میں شوق سے کلکتہ آؤں گا۔ محض سیر و سیاحت کے لیے دوسروں کی امداد پر بھروسہ کرنا مضحکہ انگیز ہے۔ ہاں کوئی ضروری موقعہ ہوگا تو بیوی کی سمیت حاضر ہوں گا۔

(3)

ایک مرتبہ جب میں نے پریم چند کی خانہ نشینی کی عادت پر نکتہ چینی کی اور لکھا کہ انھیں کم سے کم اپنا شباب و زندہ دلی قائم رکھنے کے لیے سیر و سفر کرنا چاہئے تو اس کا انھوں نے یہ جواب دیا کہ:۔

"نوجوانی اور زندہ دلی کا تعلق مزاج سے ہے، بہت سے نوجوان ہیں جو مزاج کے اعتبار سے مجھ سے زیادہ بڈھے ہو گئے ہیں، اور بہت سے ایسے لوگ ہیں جو خیالات کے لحاظ سے مجھ سے بھی کہیں زیادہ نوجوان ہیں۔ لیکن ان کو یہی خیال ہے کہ اس اعتبار سے میری نوجوانی روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔ میں عقبیٰ کا معتقد نہیں اس لیے آخرت کا خیال جو انسان کی نوجوانی کے لیے سب سے زیادہ مہلک ہے مجھے کبھی ستاتا ہی نہیں ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ جوانی بھی دو طرح کی ہوتی ہے، ایک صحت بخش اور دوسری جنون انگیز صحت بخش جوانی کا خاصہ یہ ہے کہ انسان خطرناک غاروں سے بچتا ہوا ایک ترقی پذیر اور پُر امید راستہ اختیار کرے۔ جنون انگیز شباب میں آدمی اندھا رہتا ہے اور اپنی قابلیت کے متعلق مبالغہ آمیز خیالات رکھتا ہے اور اپنے ارمانوں کی تکمیل کے شاندار خواب دیکھا کرتا ہے۔ میں بھی کبھی کبھی خواب دیکھتا ہوں اور بعض اوقات ناعاقبت اندیشی بھی کر بیٹھتا ہوں مگر افراط و تفریط سے بچا رہتا ہوں اس لیے جنون کے بہتر حصہ ہی سے فائدہ اٹھاتا ہوں، اور اب یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ قناعت کی گھریلو زندگی دنیا کی بہترین نعمت ہے۔"

(4)

ایک دفعہ میں ایک خط میں یہ پوچھ بیٹھا کہ آپ کا کوئی خاص ارمان ہو تو بتایئے، اس کا جواب مجھے عرصہ تک یاد رہے گا۔ انھوں نے لکھا کہ:۔

''میرا کوئی اور ارمان نہیں بلکہ سب سے زبردست خواہش یہی ہے کہ ملک کو سواراج کی جدوجہد میں کامیابی حاصل ہو، دولت یا شہرت کی کوئی آرزو باقی نہیں ہے، کھانے بھر کو مل ہی جاتا ہے، موٹر اور بنگلہ کی ہوس نہیں، ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار بلند پایہ کتابیں چھوڑ جاؤں، بچوں کو بھی یہی چاہتا ہوں کہ ایماندار سچے اور ارادے کے پکے ہوں۔ تمول عیش پسند اور خوشامندی اولاد سے مجھے نفرت ہے۔''

(5)

اکثر معاملات میں میری اور ان کی رائیں مختلف تھیں، مثلاً پریم چند جی ٹالسٹائی کے بڑے مداح اور قدر دان تھے، جب میں ان کے سامنے دوسرے روسی مصنف ترخنیف کی تعریف کرنے لگا تو بلا کسی پس و پیش کے کہنے لگے کہ ٹالسٹائے کے سامنے ترخنیف کی کوئی حقیقت نہیں ہے، بہر حال اس پر میرا ان کا اختلاف رائے رہا۔

(6)

میں چاہتا تھا کہ پریم چند جی کو مسٹر اینڈر یوز سے ملاؤں لیکن میں اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکا۔ مسٹر ممدوح ان کے بعض قصوں کے انگریزی ترجمے کو ایڈٹ کر کے کتابی شکل میں چھپوانے پر رضامند ہو گئے تھے۔ لیکن پریم چند نے بالآخر یہی جواب دیا کہ:۔

''آپ میرے قصوں میں جو دلچسپی لے رہے ہیں اس کے لیے میں آپ کا تہ دل سے شکر گذار ہوں، لیکن جب تک مجھے کوئی قابل مترجم نہ ملے اس وقت تک پادری اینڈر یوز صاحب کو مفت میں تکلیف دینا مناسب نہیں ہے۔ درحقیقت ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے لیکن جب وقت آجائے گا تو معین و مددگار از خود پیدا ہو جائیں گے۔''

ہماری درس گاہیں

ہماری تعلیم گاہوں میں جتنی سختی سے فیس وصول کی جاتی ہے اتنی سختی سے شاید کاشت کاروں سے

مال گذاری بھی وصول نہیں کی جاتی۔ مہینے میں ایک دن وصولی کے لیے معین کر دیا جاتا ہے۔ اس دن فیس کا داخل کرنا لازمی ہے۔ یا تو فیس دیجیے یا نام کٹوایئے یا جب تک فیس داخل نہ ہو روز کچھ جرمانہ دیجیے کہیں کہیں ایسا بھی قاعدہ ہے کہ اگر اس تاریخ کو فیس وصول نہ ہوئی تو نام یقیناً کٹ جائے گا۔ ایسے جابرانہ قواعد کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ غریبوں کے لیے مدرسے کے دروازے بند کر دیے جائیں۔ قرض لو۔ گھر کے برتن بیچو چوری کرو مگر فیس ضرور دو۔ ورنہ دوگنی دینی پڑے گی۔ یا نام رجسٹر سے خارج ہو جائے گا۔ زمین اور جائداد کے مطالبوں میں تو کبھی کبھی کچھ رعایت کی جاتی ہے۔ ہماری تعلیم گاہوں میں نرمی ممنوع ہے۔ وہاں مستقل طور پر فوجی قانون برتا جاتا ہے۔ دیر میں آئے تو جرمانہ۔ کتابیں نہ خرید سکے تو جرمانہ۔ کوئی خطا ہو تو جرمانہ۔ تعلیم گاہ کیا ہے۔ جرمانہ گاہ ہے۔ عدالتوں میں پیسے کا راج ہے۔ ہمارے مدرسوں میں بھی پیسے کا راج ہے۔

(میدان عمل) پریم چند

منشی پریم چند اور فلم کمپنیاں

از مسٹر ضیاء الدین احمد برنی۔ بی۔اے بمبئی

منشی پریم چند سے میری پہلی ملاقات دفتر زمانہ کانپور میں 1916ء یا 1917ء میں ہوئی تھی جب میں تھیا سوفیکل ہائی اسکول کی ملازمت کے سلسلہ میں کانپور میں رہا کرتا تھا۔ اس کے بعد کانپور ہی میں دو ایک مرتبہ ملاقات ہوئی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ مرحوم اس زمانہ میں کسی اسکول سے وابستہ تھے۔ محض اپنے پرائیویٹ مطالعہ کے زور پر بی۔اے کا امتحان پاس کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت بھی انھیں اتنی شہرت حاصل ہو چکی تھی جو کسی دوسرے مصنف کو مشکل سے نصیب ہوگی۔ اس ملاقات کی کچھ کچھ یاد دماغ میں محفوظ رہ گئی ہے بہر حال اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مرحوم سے میں نہایت خلوص سے ملا تھا اور اس میں برابر اضافہ ہی ہوتا گیا۔

منشی پریم چند جون یا جولائی 1934ء میں اجنتا سینے ٹون میں ملازم ہو کر بمبئی تشریف لائے مگر یہاں ان کے قیام کا زمانہ کچھ طویل نہ رہا۔ غالباً وسط 1935ء سے پہلے وہ بمبئی سے ہمیشہ کے لیے تشریف لے گئے۔ یہاں کی آب و ہوا اور یہاں کا ماحول انھیں بالکل راس نہیں آیا۔ اس کی شکایت انھوں نے ایک خط میں بھی کی ہے جو ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔

(2)

بمبئی کے زمانہ قیام میں مرحوم سے میرے خاصے اچھے مراسم قائم ہو گئے تھے انھیں تعلقات کی بنا پر میں کبھی کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ ان کی عادت تھی کہ شام کا وقت کسی نہ کسی تفریح گاہ میں گزارا کرتے تھے۔ چنانچہ جب کبھی وہ اپالو تشریف لے جاتے تو راستہ میں دفتر میں مجھ سے ملتے ہوئے جاتے۔ ایک مرتبہ انھوں نے ازراہ مہربانی اپنا ایک تازہ افسانہ سنایا جو ہلاکو کی زندگی سے متعلق تھا اور جو اس زمانہ میں کسی رسالہ میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت مسٹر سید محمد یعقوب بھی میرے ہمراہ تھے۔

بمبئی تشریف لانے سے قبل انھوں نے بمبئی کی ایک فلم کمپنی مہالکشمی سینےٹون کو اپنے ایک ناول کی فلم بنانے کی اجازت دے دی تھی۔ چنانچہ وہ ناول ''سیواسدن'' کے نام سے پردۂ سیمیں پر جلوہ گر ہوا۔ صحیح معاوضہ کی تو خبر نہیں لیکن سننے میں آیا تھا کہ مہالکشمی سینےٹون نے پندرہ سو یا دو ہزار روپے دیے ہیں۔

اجنتا سینےٹون سے وابستہ ہو جانے کے بعد انھوں نے دو ڈرامے اور لکھے۔ ایک کا نام ''مل'' تھا دوسرے کا ''نوجیون۔'' اول الذکر میں ہندوستان کے مزدوروں کی حالت زار کا نقشہ کھینچا گیا تھا۔ دوسرے میں پرانے زمانے کے راجپوت کے حالات پیش کیے گئے تھے۔ افسوس حکومت بمبئی نے ''مل'' کو قابل اعتراض ٹھہرا کر اس کی نمائش بند کر دی۔ پنجاب میں البتہ یہ فلم کچھ دنوں تک دکھائی گئی تھی۔ لیکن جب حکومت بمبئی نے اُسے بند کر دیا تو پنجاب گورنمنٹ نے بھی اس کی پیروی میں اس کی اشاعت علما بند کر دی۔ بار بار کی ترمیموں سے اصل افسانہ کا حلیہ بہت کچھ تبدیل ہو گیا تھا لیکن مسٹر بھوناٹی (مالک کمپنی) ڈیڑھ سال کی کوششوں کے بعد اسے بالآخر ''غریب مزدور'' کے نام سے دکھانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس فلم کی تیاری میں خود منشی صاحب نے بھی حصہ لیا تھا۔ اس میں انھوں نے یونین کے پریسیڈنٹ کا پارٹ ادا کیا ہے جو مزدوروں اور سرمایہ داروں کے مابین صلح کرانے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اس فلم کے کہانی کا ڈھانچہ کمپنی نے تیار کیا تھا۔ اور اس پر گوشت و پوست منشی صاحب نے منڈھ دیا تھا۔ دونوں فلموں کی زبان ان کے اور افسانوں کی طرح نہایت اچھی اور دل پر اثر کرنے والی تھی۔

چونکہ مرحوم کی صحت بمبئی میں اچھی نہ رہتی تھی اور اجنتا سینےٹون کمپنی بھی بند ہونے کے قریب تھی اس لیے مرحوم نے بمبئی میں مزید قیام کا ارادہ ترک کر دیا۔ مسٹر بھوناٹی کہتے ہیں کہ ان کی کمپنی صاحب موصوف کو سات سو روپے ماہانہ ادا کیا کرتی تھی۔

بمبئی ٹاکیز کے ڈائرکٹر مسٹر ہمنسو رائے جو ''لائٹ آف ایشیا'' اور کرما جیسی کامیاب فلمیں بنا چکے ہیں اس امر کے خواہش مند تھے کہ منشی صاحب کسی طرح ان کی کمپنی سے وابستہ ہو جائیں چنانچہ جب انھوں نے مجھ سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو میں نے منشی صاحب سے ان کی ملاقات کرا دی لیکن ملاقات کے وقت انھوں نے بمبئی کی خراب آب و ہوا کا عذر کیا اور فرمایا کہ میں اجنتا سینےٹون سے علیحدگی کے بعد بنارس جانا چاہتا ہوں۔ مجھے ان کی گفتگو سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرحوم فلمی کام سے بددل ہو چکے ہیں اس لیے کہ جب مسٹر ہمنسو رائے نے ان سے درخواست کی کہ وہ بنارس ہی سے ان کی کمپنی کے لیے افسانے لکھ کر بھیج دیا کریں تب بھی انھوں نے اپنے معذوری کا اظہار کیا اور اپنی جگہ پر مسٹر کیشب کی سفارش کر دی جو آج کل بمبئی ٹاکیز میں کام کر رہے ہیں۔

آخر میں اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ منشی صاحب کی جو ادا مجھے خاص طور پر پسند تھی، وہ ان کی انتہائی سادگی اور شرافت نفس تھی۔ کپڑے اتنے سادہ پہنتے تھے کہ اس سے زیادہ تصور ہی نہیں ہو سکتا، ان کی ذاتی ضروریات اس قدر کم تھیں کہ چھوٹے پیمانہ پر مہاتما گاندھی نظر آتے تھے۔ ہر شخص سے خندہ پیشانی سے پیش آنا ان کی سیرت میں داخل تھا۔ وہ تکلیفوں میں بھی ہمیشہ ہنس کھ رہا کرتے تھے۔ ان کی قلبی شرافت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی زبان اور قلم سے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا۔ مہربانی، منکسر مزاجی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ باوجود اس کے کہ وہ ہندوستان میں اور باہر بھی غیر معمولی عزت وہ توقیر کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، ان میں کبھی خودنمائی پیدا ہی نہیں ہوئی۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ وہ اس سے واقف ہی نہ تھے کہ خودنمائی کیا چیز ہوتی ہے۔ کبر و نخوت سے وہ کوسوں دور تھے۔ مذہبی رواداری اور بے تعصبی کا بھی وہ زندہ مجسمہ تھے۔ غرض ان میں وہ تمام صفات بدرجۂ اتم موجود تھیں جو لوگوں سے پہلی ہی ملاقات میں خراج احترام حاصل کر لیا کرتی ہیں۔

پریم چند کے بہترین افسانے

پریم چند کے بہترین افسانے ان کی نظر سے: پنڈت بناری داس چترویدی۔ ایڈیٹر ویشال بھارت کلکتہ نے منشی پریم چند سے ان کے بہترین افسانوں کے نام پوچھے تھے۔ منشی صاحب نے پنڈت جی کو جو جواب دیا اس کا اقتباس یہ ہے:۔

آپ کے اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے کہ میرے سب سے اچھے افسانے کون ہیں۔ اب تک دو سو سے زیادہ، افسانے لکھ چکا ہوں، ان میں سے کہاں تک انتخاب کروں یادداشت پر بھروسہ کر کے لکھتا ہوں:۔

(1) بڑے گھر کی بیٹی (2) رانی سارندھا (3) نمک کا داروغہ (4) سوت (5) زیور (6) کفارہ (7) تمنا (8) مندر اور مسجد (9) گھاس والی (10) حج اکبر (11) ستیا گرہ (12) بدنای (13) ستی (14) لیلیٰ (15) منتر۔

میں کسی مصنف کے طرز سے خاص طور پر متاثر نہیں ہوا پنڈت رتن ناتھ سرشار کا زیادہ اور ڈاکٹر ٹیگور کا اثر مجھ پر ضرور ہوا ہے۔" "اردو"

منشی پریم چند کے معترضین

از منشی راج بہادر لمگوڑہ ایم اے۔ ایل ایل بی

سب سے پہلے مجھے موصوف کی چھوٹی کہانیوں سے دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔ میرے خیال میں اس فن میں ہندوستان کیا، دوسرے ملکوں میں بھی موصوف سے شاید ہی کوئی سبقت لے گیا ہو، اردو، فارسی، اور انگریزی ادبیات، سے مجھے بھی تھوڑی بہت واقفیت ہے اور ان میں تو مجھے موصوف سے بڑھ کر چھوٹے قصوں کا لکھنے والا نظر نہیں آیا۔

دس بارہ سال ہوئے آپ کی بڑی ہوئی شہرت کو دیکھ کر اودھ اُپادھیائے جی نے اعتراض اٹھایا تھا کہ آپ کا رنگ بھومی (چوگان ہستی) نام کا ناول تھیکرے کے مشہور ناول وینٹی فیر (Vanity Fair) کی نقل ہے۔ میں نے ان دونوں کتابوں کا بغور مطالعہ کیا اور رسالہ سرسوتی الٰہ آباد میں اس مسئلہ پر ایک مضمون بھی لکھا۔ آخر حقیقت حال روشن ہوگئی۔ رنگ بھومی پر ایک گراں قدر ادبی انعام بھی دیا گیا۔ اس وقت منشی پریم چند کا ایک خط اعلیٰ حضرت سحر ہتگامی[1] میرے سامنے ہے جس کا ضروری اقتباس ہے۔

> ''مکرمی منشی راج بہادر صاحب کا خط بھی دیکھا تسکین ہوئی۔ آپ صاحبان کا خیال بالکل درست ہے۔ الہ آباد میں ایک برہمن پارٹی ہے۔ اودھ اُپادھیائے جی اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں اوٹ پٹانگ باتیں کہہ کر مجھے بدنام کر رہے ہیں۔ رنگ بھوم اور وینٹی فیر میں ذرہ بھر بھی مناسبت نہیں ہے۔ اور پریم آشرم (گوشہ عافیت) کو ریسرکشن (Resurrection) کے مماثل بتلانا تو حد درجہ بیہودگی ہے۔ میں نے آج تک ریسرکشن پڑھا بھی نہیں، حالانکہ اس کی تعریف بہت سن چکا ہوں ایسی مماثلت جیسے اُپادھیائے جی دکھلاتے ہیں قریب قریب سبھی کتابوں میں ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ وینٹی فیر میں ایک آدمی

---

1. سورنہ 18 / جنوری 1927ء

غلط سلط انگریزی بولتا ہے اسی سے رنگ بھومی میں ایک بنگالی بابو لائے گئے۔ اس شخص کو یہ بھی خبر نہیں کہ بنگالی بابو کیوں لائے گئے۔ ان کے وجود کا منشاء کیا ہے۔ املیا کو آپ صوفیہ سے ملاتے ہیں حالانکہ صوفیہ کا اصل مسز اینی بسنٹ ہیں۔"

میں یہ نہیں کہتا کہ ایک علم کے اصول دوسرے علم میں برتے ہی نہ جائیں دیکھئے ارتقاء کا مسئلہ سائنس نے دریافت کیا جو ہر جگہ استعمال ہوتا ہے۔ ہاں احتیاط لازم ہے۔ ریاضی میں مساوات کا اصول بہت قابل قدر ہے جس سے نامعلوم شے یعنی لا کی قیمت معلوم ہو جاتی۔ مگر مساوات اور نقل میں فرق ہے۔ اگر کوئی بات جیوں کی تیوں رکھ دی جائے تو نقل ہوئی جس میں نہ کوئی مزہ ہے نہ لطف جیسے 9=9 لکھا جائے تو بے معنی سا معلوم ہوگا لیکن اگر یہ کہا جائے کہ 5+4=11-2، تو مساوات بنتی ہے۔ اپادھیائے جی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ صوفیہ سے املیا + ربکا کے بہت سے جزو۔ جب منشی پریم چند خود لکھتے ہیں کہ انھوں نے صوفیہ کا خیال مسز بیسنٹ صاحبہ کی شخصیت سے لیا ہے تو کوئی شک باقی ہی نہیں رہتا لیکن ایسا نہ بھی ہوتا اور واقعی صوفیہ کو دیٹی فیئر ہی سے لیا جاتا اور املیا اور ربکا کے خصلتی اجزاء سے اس کی ترتیب دی جاتی تو بھی ہم اسے نقل کیسے کہہ سکتے تھے؟[1] یہ تو مساوات ہی ہوتی اور مساوات بلا جدت کے بن نہیں سکتی۔ علم ریاضی میں جوڑ باقی، ضرب، تقسیم، یہی چار بنیادی اصول ہیں اور ایک سے نو تک بنیادی عدد اور ایک صفر۔ ماہران ریاضی انھیں کے مختلف استعمال سے بیشمار سوالات مرتب کر چکے ہیں اور آئندہ بھی کریں گے۔ جنھیں کوئی بھی نقل نہیں کہے گا۔ کیا یہ جدت نہیں ہے کہ ایک ناولسٹ کئی جگہ سے مسالہ لے کر اپنے ناول کی ترتیب دے، ٹھیک اسی طرح پر جیسے پچی کار مختلف رنگ کے پتھروں کو گڑھ کر اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ نئے نئے بیل بوٹے بن جاتے ہیں۔ شکسپیئر نے پلوٹارک (Plutarch) کی کتابوں سے اپنے ناٹکوں کے پلاٹ لیے، مگر اسے کوئی نقال نہیں کہتا۔ گوسوامی تلسی داس جی نے خود ہی اعتراف کیا ہے کہ چاروں وید چھ شاستر اٹھارہ پران اور تمام گرنتھوں کا رس لے کر رامائن بنی ہے، مگر اسے کوئی نقل نہیں کہتا:۔ بقول ٹیگور "قلمی دنیا میں بھی ٹھیک اسی طرح ساکھ پر کام ہوتا ہے جیسا تجارتی دنیا میں، شرط یہ ہے کہ مصنف میں اصل کو معہ سود واپس کر دینے کی قابلیت ہو اور ساتھ ہی وہ اپنے لیے کچھ نفع بھی اٹھا سکے۔"

آج پریم چند جی نہیں ہیں مگر ان کا نام زندہ ہے اور زندہ رہے گا، کیونکہ وہ اپنے طرز کے استاد اور اپنے فن کے زبردست ماہر تھے۔

---

[1] آخر مصنف بھی اپنے مشاہدہ مطالعہ سے کام لیتا ہے۔

عورت کا سہاگ

سہاگن عورت کے لیے اس کا شوہر دنیا کی سب سے پیاری چیز ہوتی ہے۔ وہ اسی کے لیے جیتی ہے اور اسی کے لیے مرتی ہے۔ اس کا ہنسنا بولنا اسی کو خوش کرنے کے لیے اور اس کا بناؤ سنگھار اسی کے لبھانے کے لیے ہوتا ہے اس کا سہاگ اس کی مسرت اور زندگی ہے اور سہاگ کا اٹھ جانا اس کی زندگی اور جانداری کا خاتمہ ہے۔

(جلوۂ ایثار 140)

پریم چند کی باتیں

از ایڈیٹر زمانہ

میرے لیے پریم چند کے متعلق کوئی مدلل و مفصل مضمون لکھنا آسان کام نہیں ہے۔ ان کا خیال آتے ہی سالہا سال کی سیکڑوں پرانی باتیں یاد آنے لگتی ہیں۔ اور میں ان میں گم سا ہو جاتا ہوں۔

تیس سال کے قریب میرا ان کا دوستانہ نہیں بلکہ حقیقی طور پر برادرانہ تعلق رہا۔ ذہنی طور پر ہم دونوں ہر معاملے میں ہم خیال نہیں تو ایک دوسرے کے بڑے ہمدرد ضرور تھے اور وہ اکثر اصولی و ضروری باتوں میں وہ میری رائے کو بڑی وقعت دیتے تھے۔

عجیب بات ہے کہ گو وہ عمر میں مجھ سے کچھ بڑے تھے لیکن شروع سے آخر تک وہ مجھے بڑے بھائی کی طرح سمجھتے رہے۔ جن دنوں ہر وقت کی بے تکلفی اور ہنسی دل لگی رہتی تھی اس وقت بھی وہ میری باتوں کی بڑی قدر کرتے اور میرا بہت لحاظ رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ میرے عزیز، ان کے عزیز، اور میرے احباب ان کے احباب ہو گئے۔ مجھے بھی ان کے کسی معاملے میں دخل دینے میں کبھی پس و پیش نہیں ہوا۔ بہت سے امور میں تو جو میری رائے ہوتی اسی پر وہ کاربند ہوتے تھے۔

کئی سال تک ایک ساتھ رہنے کا اتفاق رہا، اور یہ میری زندگی کا بہترین زمانہ تھا۔ پریم چند، نوبت رائے نظر، درگا سہائے سرور اور کئی احباب و اعزا شام کے وقت دو تین گھنٹہ کے لیے یکجا ہو جاتے اور زندگی کا کوئی مرحلہ اور دین و دنیا کا کوئی مسئلہ ان یاران بے تکلف کے غور و فکر سے محفوظ نہ رہتا، واقعات عالم پر بحثیں ہوتیں، ہر معاملہ پر رد و کد ہوتی، ہر مسئلہ کی چھان بین کی جاتی، ایک دوسرے کی نکتہ چینی ہوتی۔ خوب مذاق ہوتا، قہقہے پر قہقہے اڑتے غرض اب ان صحبتوں کی یاد دل سے مٹانے سے بھی نہیں مٹ سکتی۔ افسوس اب یہ باتیں کہاں نصیب ہو سکتی ہیں۔ مگر ان کا لطف دل میں ہمیشہ باقی رہے گا۔

اے رفتگان محفل ما   رفتید و لے نہ از دل ما

آخری حصہ زندگی میں ہم لوگ ایک عرصے سے اپنے اپنے معروفیات میں کچھ ایسے مشغول

رہے کہ کہاں ہر وقت کا ساتھ اور کہاں برسوں میں دو چار دن کی یکجائی کی شکل ہوگئی۔ مگر اس اخلاص اور محبت کی کیا تعریف کی جائے کہ مہینوں برسوں میں جب کبھی ملنے کا موقعہ ہوتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ پرانا زمانہ از سرِ نو عود کر آیا۔ اگر کبھی کوئی غلط فہمی یا شکر رنجی بھی ہوتی تو دو ہی خط میں صفائی ہو جاتی اور پھر پُرانی محبت و بے تکلفی کا نقش ابھر آتا۔

اپریل 1935ء کی ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس میں دو دن تک لکھنؤ میں جو لطف رہا اس کا نقش دل پر ہمیشہ باقی رہے گا۔ تمام مجمع میں ہمیں دو آدمی ایسے تھے جن کو تیسرے شخص کی ضرورت نہ تھی۔ صدارتی تقریر کے بہت سے احباب مشتاق تھے لیکن انھوں نے ''زمانہ'' ہی کو اس کے اشاعت کی عزت دی۔ کانگریس کی نمائش کی بھی ساتھ ہی سیر ہوئی اور قدم قدم پر فقرہ بازیاں رہیں۔ کانپور کے ہندی شاعر ہردیش بھی ساتھ تھے۔

جولائی 1936ء میں بیمار ہو کر آخری مرتبہ لکھنؤ آئے تب بھی مجھی کو یاد کر کے بلایا اور جب میں پہنچا تو اس طرح دل کھول کر ملے جیسے کوئی مدتوں کا بچھڑا ہوا بھائی برسوں کی مفارقت کے بعد ملتا ہے۔ چند ہی روز میں کئی ڈاکٹروں سے مشورہ ہوا۔ رائے بہادر ڈاکٹر ہر گوبند سہائے نے بھی بڑے خلوص و توجہ سے طبی معائنہ کیا اور نہایت ہمدردی سے مرض کی نوعیت و اہمیت دل نشین کی۔ میرا دل تو اس وقت بیٹھ گیا، پریم چند بھی سمجھ گئے لیکن لڑکا ساتھ تھا اور اس کے خیال سے نا امیدی ظاہر نہ کی چند ہی روز کے اندر دو تین دفعہ لکھنؤ دیکھنے گیا۔ جب علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوا تو وہ پھر بنارس واپس گئے، اور اس مرتبہ ایسے گئے کہ وہیں کے ہو رہے!

موت سے پندرہ دن پہلے تار دے کر مجھے بنارس بلایا، تمام راستہ عجب امید و بیم کی حالت میں کٹا، صبح کو آخری ملاقات کا سماں عمر بھر نہ بھولے گا۔ وہی پریم چند جو اپنی سرخ و سپید صورت کے لحاظ سے ہزاروں میں ایک تھے، ایسے زار و نزار ہو گئے تھے کہ مشکل سے پہچان پڑتے تھے۔ دھنسی ہوئی آنکھیں، بیٹھے ہوئے گال، کانٹے کی طرح سوکھے ہوئے ہاتھ پاؤں دیکھ کر آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ان کے مسلسل قہقہے بات کرنے کی بھی مہلت نہ دیتے تھے، مگر اب آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا۔ نہ اٹھنے کی طاقت تھی اور نہ بیٹھنے کی سکت۔ لیٹے ہی لیٹے ہاتھ پکڑ لیا اور گلے سے چپٹا لیا۔ جیسے کوئی ڈرا ہوا بچہ بلک بلک کر سینہ سے چمٹنے کی کوشش کرے۔ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ بات کرنے میں بھی تھکن ہوتی تھی، تاہم دم لے لے کر آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہی رہے۔ میں نے منع کرنا چاہا تو کہنے لگے کہ دوبارہ ملاقات کی امید نہیں ورنہ تمہارا کہنا نہ ٹالتا، یہاں اور جو کوئی آتا ہے یاس انگیز باتیں کر کے پریشان کر جاتا ہے۔ بیوی کی

طرف اشارہ کر کے کہا کہ اگر یہ ڈھارس نہ بندھائے رہتیں تو کب کا مر چکا ہوتا۔" واقعی مسز پریم چند جی نے ان دنوں بڑی ہمت سے کام لیا، اور دل شکن حالات میں کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے دلی صدمے کو ان پر ظاہر نہ ہونے دیا، اگر کبھی انھوں نے مایوسی کی بات بھی کی تو سمجھا بجھا کر تسلی دیدی، اسی لیے کہتے تھے کہ ان کے بغیر خدا معلوم میرا کیا حال ہوتا۔ واقعی اس روحانی اذیت میں مسز ممدوحہ نے جس صبر وتحمل وستقل مزاجی سے کام لیا اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ مگر ان کی قوت ارادی اور بلند ہمتی بھی کچھ کام نہ آئی۔ آنی اٹل تھی، ہو کر رہی۔

پریم چند کے عادات واخلاق کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ملک کے نامور انشا پرداز، بڑے بڑے اہل قلم اور واقف حال دوست احباب ان کی قابل قدر زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال چکے ہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مختلف مسائل زندگی پر ان کے خیالات اور جذبات، اصول، اور نظریے احباب کے روبرو پیش کروں۔ اور بعض ذاتی حالات وواقعات بھی جو اکثر اصحاب کے علم میں نہیں ہیں یا جو ان کے مضامین میں نظر انداز ہو گئے ہیں مختصراً بیان کر دیے جائیں۔

پریم چند جی کا اصلی نام اور ولدیت وسکونت وغیرہ تو سب کو معلوم ہے، یہ بھی سب لوگ جانتے ہیں وہ 1881ء میں پیدا ہوئے تھے، ان کی ابتدائی مشکلات زندگی کا حال بھی دیگر مضامین میں آ چکا ہے انٹرنس پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ سنٹرل ٹریننگ کالج الہ آباد میں داخل ہوئے اور 4-1903ء کے سشن میں تعلیم حاصل کر کے انھوں نے اپریل 1904ء میں جونیر انگلش ٹیچرس سرٹیفکٹ کا امتحان اول درجہ پاس کیا اس کے سرٹیفکیٹ مورخہ یکم جولائی 1905ء میں جس پر مسٹر جے سی کمیسٹر پرنسپل اور مسٹر بیکن انسپکٹر مدارس الہ آباد سرکل کے دستخط ہیں عبارت ذیل قابل ذکر ہے۔

Not Qualified to teach Mathematics, Conduct satisfacory and regular. He worded earnestly and well.

(یعنی ممتحن نے اس سرٹیفکیٹ میں یہ صاف لکھ دیا ہے کہ "ریاضی پڑھانے کی قابلیت نہیں ہے مگر چال چلن قابل اطمینان رہا اور وہ پابند اوقات بھی رہے اور اپنا کام جانفشانی اور خوبی سے کیا۔)

1904ء میں قدیم الہ آباد یونیورسٹی کا اسپیشل ورنیکلر امتحان بھی اردو ہندی دونوں میں پاس کیا۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان کئی بار دیا لیکن ہر دفعہ ریاضی میں ناکامیاب ہوئے۔ آخر جب یہ مضمون لازی نہیں رہا

---

1. جون 1908ء

اور اختیاری ہو گیا تو 1910 میں سکنڈ ڈویژن میں اس کو بھی پاس کر لیا۔ اس وقت وہ گورنمنٹ اسکول بستی میں اسسٹنٹ ٹیچر تھے۔ انٹرمیڈیٹ میں ان کے مضامین یہ تھے۔

انگریزی، منطق، فارسی اور زمانہ حال کی تاریخ

نو سال کے بعد 1919ء میں جب گورکھپور میں ٹیچر تھے تو الہ آباد یونیورسٹی کا امتحان بی۔اے بھی سکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ اس مرتبہ ان کے سبجکٹ یہ تھے۔ انگریزی فارسی اور تاریخ۔

1905ء سے 1908ء تک گورنمنٹ اسکول کانپور میں اسسٹنٹ ٹیچر رہے۔ اس اثناء میں عرصہ تک ایڈیٹر زمانہ کے ساتھ اور پھر ان کے قریب ہی ایک دوسرے مکان میں رہے۔ کانپور سے مہوبا ضلع ہمیر پور میں ڈسٹرکٹ بورڈ کے سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہو کر گئے، اور مہوبا میں چھ سال تک مسلسل رہے اور یہیں بعض مشہور افسانے لکھے۔ ''آلھا، رانی سارندھا، دکرمادت کا تیغہ، اور بندیلوں کی بہادری کے سب سے قصے جو اپنا جواب نہیں رکھتے اسی زمانہ کی تصنیف ہیں۔ مگر مہوبا میں وہ بیمار ہو گئے۔ چنانچہ 1914ء میں تبدیلی کی درخواست دی۔ خیال تو یہ تھا کہ کوئی اچھا مقام ملے گا، لیکن تبدیلی بستی میں ہوئی جہاں جولائی 1914ء سے ڈھائی سال تک برابر رہے، پہلے سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے پھر جب مسلسل دوروں کا بار برداشت نہ ہوسکا اور صحت خراب رہی تو مجبور ہو کر پھر مدرسی پر لوٹے اور جولائی 1915ء میں گورنمنٹ اسکول بستی کے اسسٹنٹ ٹیچر ہو گئے۔ یہاں سے اگست 1918ء میں نارمل اسکول گورکھپور کے اسسٹنٹ ماسٹر مقرر ہو کر بھیجے گئے گورکھپور میں وہ نسبتاً خوش رہے۔ چند ہی دنوں میں نارمل اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب بھی ان کے قدردان ہو گئے اور کئی علم دوست اصحاب کا ساتھ ہو گیا۔ رگھوپت سہائے صاحب فراق اور مہابیر پرشاد جی پوتدار سے یہیں ملاقات اور دوستی ہوئی، یہیں ان کا بڑا لڑکا (سری پت رائے) پیدا ہوا۔ یہیں وہ کانگریس کی تحریک عدم اشتراک عمل میں شامل ہوئے دو سال تک وہ نارمل اسکول بورڈنگ ہاؤس کے سپرنٹنڈنٹ بھی رہے جس کے لیے علاوہ تنخواہ انھیں پندرہ روپیہ ماہوار کا الاؤنس ملتا تھا۔ گورکھپور میں وہ مارچ 1922ء تک رہے۔ ایک مرتبہ درمیان میں وہ پھر زیادہ بیمار ہو گئے تھے جس کی وجہ سے انھیں کئی ماہ کی رخصت لینا پڑی، کئی جگہ علاج کے لیے گئے، اور کانپور بھی آئے تھے۔

آخر فروری 1921ء میں انھوں نے نان کوآپریشن کے سلسلہ میں سرکاری ملازمت سے استعفے دے دیا اور پوتدار جی کی امداد اعانت سے شرکت میں ایک چرخہ کی دوکان کھلوائی، مگر اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی تو مارچ 1922ء میں بنارس چلے گئے اور اسی ماہ وہ کانپور آئے۔ اور مہاشے کاشی ناتھ جی نیجر مارواڑی اسکول کی کوشش سے اس اسکول کے ٹیچر ہو گئے۔ اس دفعہ انھوں نے میسٹن روڈ میں مکان لیا

جہاں اگست 22ء میں ان کا دوسرا لڑکا امرت رائے پیدا ہوا۔ کاشی ناتھ جی بڑے محب وطن اور ہمدرد انسان ہیں مگر اسکول کے انتظام میں ان سے پریم چند کی اَن بن ہوگئی۔ اس طرح مارچ 1923ء میں وہ یہاں سے مستعفی ہوکر پھر بنارس چلے گئے اور اپنے مکان واقع موضع لمہی میں رہنے لگے جو بنارس سے 3½ میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہاں انھوں نے کئی ہزار روپیہ کی لاگت سے ایک پختہ مکان بنایا۔ اور یہیں آباد ہوکر لٹریری کام کرنے کا تہیہ کیا۔ لیکن ہندی کے نامور سرپرست سرسبجت شیو پرشاد جی گپت کی تحریک پر انھوں نے ہندی رسالہ ''مریادا'' کا ایڈیٹوریل چارج لے لیا۔ اس کے ایڈیٹر بابو سمپورن آنند جی کو نان کوآپریشن کے سلسلے میں جیل جانا پڑا تو گپت جی نے پریم چند جی کو یاد کیا۔ ڈیڑھ سال تک وہ اس خدمت کو انجام دیتے رہے اور جب شری سبجت سمپورن آنند جی جیل سے واپس آئے تو گپت جی نے پریم چند کو کاشی ودیا پیٹھ میں لیکچرر مقرر کردیا اس طرح سرکاری ملازمت سے استعفے کے بعد گپت جی نے پریم چند جی کی امداد واعانت کا برابر خیال رکھا۔ ''مریادا'' میں انھیں ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار ملتے تھے لیکن ودیا پیٹھ میں صرف سوا سو کی تنخواہ ملی۔ بہرحال ایک سال تک یہ خدمت بھی انجام دی۔ اس کے بعد انھوں نے بلا منت غیرے زندگی بسر کرنے کے خیال سے تین صاحبوں کی شرکت میں (جن میں سے ایک فراق صاحب اور دو ان کے قریبی عزیز تھے) سرسوتی پریس قائم کیا۔ اس میں خود انھوں نے ساڑھے چار ہزار روپیہ لگایا، لیکن جب کافی منافع نہ ہوا تو رفتہ رفتہ پریس کی ساری ذمہ داری انھیں پر آپڑی۔ اب وہ ایسی تجارتی کشمکش میں پڑ گئے جس کے لیے ان کی طبیعت موزوں نہ تھی۔ پیہم نقصانات نے انھیں پھر دوسروں کی ملازمت کا سہارا لینے پر مجبور کیا۔ اس اثناء میں اور اس سے پہلے بھی کئی بار ''زمانہ'' میں آنے کا ارادہ ہوا، مختلف اسکیمیں بنیں لیکن ایک طرف مالی بے بضاعتی دوسری طرف ان کی صریح ضروریات کی وجہ سے کوئی اسکیم مکمل نہ ہوسکی۔ تو 1925ء میں ہندی کے مشہور دارالاشاعت گنگا پُستک مالا آفس لکھنؤ میں غالباً سو روپیہ ماہوار پر انھوں نے لٹریری اسسٹنٹ کی آسامی قبول کرلی۔ یہاں دس ماہ تک کام کیا لیکن گزارہ نہ ہوا تو اپریل 1926ء میں پھر بنارس لوٹے اور جون 1928ء تک وہیں رہے۔ جولائی 1928ء میں منشی بشن نراین صاحب بھارگو مالک مطبع منشی نولکشور کی قدردانی نے انھیں پھر لکھنؤ کھینچ بلایا۔ منشی صاحب پریم چند جی کے ہندی افسانوں کے گرویدہ ہوچکے تھے۔ انھوں نے دو سو روپیہ ماہوار پر اپنے مشہور ہندی رسالہ ''مادھوری'' کی ایڈیٹری ان کے سپرد کردی۔ چنانچہ جولائی 1928ء سے نومبر 1931ء تک وہ نول کشور

ل گورکھپور سے 15 رفروری 21ء کا کارڈ ہے جس میں لکھتے ہیں کل سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوگیا، آج استعفے منظور ہوگیا۔

پریس میں رہ کر مطبع کی مختلف خدمات انجام دیتے رہنے۔ منشی بشن نرائن صاحب ایک نوجوان دالوالعزم علم دوست رئیس تھے اور گو انھوں نے درویشانہ طبیعت پائی تھی تاہم بعض رئیسانہ شوق بھی دامن گیر تھے۔ مزاج میں از حد مروت تھی، دل غنی اور دماغ جمع خرچ کی الجھنوں سے آزاد تھا۔ وہ ہر صیغہ کا انتظام نہایت اعلیٰ پیانہ پر کرنا چاہتے تھے مگر استقلال و جفاکشی سے کسی کی طرف رجوع نہ ہوتے تھے اور مطبع خسارہ سے چل رہا تھا۔ ''مادھوری'' کا ایڈیٹوریل اسٹاف بھی کافی سے زیادہ تھا۔ چنانچہ کارخانہ کو ترقی دینے کے خیال سے پریم چند کو تصنیف و تالیف کے صیغہ میں منتقل کیا گیا، جہاں انھوں نے کئی زیر طبع کتابوں کی نظر ثانی کرنے کے علاوہ ابتدائی درجوں کے لیے اردو ہندی ریڈریں بھی مرتب کیں۔ اسی سلسلے میں انھیں مکری مرزا عسکری صاحب اور حضرت آسی لکھنوی کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا۔ مگر منشی بشن نراین صاحب کی ناوقت وفات نے تمام منصوبے ختم کر دیئے۔ اور ریاست کورٹ آف وارڈس کے سپرد ہوگئی جس کے عہد حکومت میں اہل کمال کی قدر دانی کی کوئی گنجایش نہ رہی[1]۔ مسٹر سنر وڈپٹی کمشنر سے کہا سنا گیا لیکن یہاں اصحاب حل و عقد نے موقعہ غنیمت جان کر پہلے ہی سے فیصلہ کرالیا تھا۔ اس طرح نومبر 1931ء میں پریم چند جی کا مطبع نولکشور سے بھی قطع تعلق ہوگیا۔

مگر چونکہ لڑکے لکھنؤ ہی میں تعلیم پا رہے تھے اس لیے اپریل 1933ء تک آپ کو بھی لکھنؤ رہنا پڑا۔ اس کے بعد وہ پھر بنارس چلے آئے اور ایک سال یعنی مئی 1935ء تک اپنے مطبع مرسوتی پریس کا کام دیکھتے بھالتے رہے۔

اس اثناء میں وہ اردو سے بالکل مایوس سے ہوکر ہمہ تن ہندی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ تصنیف و تالیف کے علاوہ انھوں نے ہر ممکن طریقے سے پریس کو فروغ دینا چاہا۔ جنوری 1930ء میں انھوں نے ''ہنس'' نامی ایک ہندی ماہوار رسالہ جاری کیا۔ مگر چھ مہینہ بھی مشکل سے گذرنے نہ پائے تھے کہ جون 1930ء میں آرڈیننس کے ماتحت اس سے ایک ہزار کی ضمانت مانگی گئی، جس پر آپ نے پرچہ بند کر دیا۔ مگر چھ ماہ بعد جب یہ آرڈیننس منسوخ ہوگیا تو آپ نے جنوری 1931ء میں اسے دوبارہ جاری کر دیا مگر دو ہی تین نمبر نکلے ہوں گے کہ ''قاتل'' نامی ایک کہانی کی اشاعت کی علت میں پھر ضمانت مانگی گئی۔ مگر مسٹر پنالال صاحب کلکٹر بنارس کی سفارش پر گورنمنٹ نے اپنے حکم کو واپس لے لیا اور ''ہنس'' پھر بدستور نکلتا رہا۔ اکتوبر 1935ء میں ہندی ساہتیہ پریشد نے اسے اپنے اہتمام میں لے لیا اور جون 1936ء تک یہ رسالہ پریشد ہی کی ملکیت میں نکلتا رہا۔ لیکن جون 1936ء کے پرچے میں سیٹھ گوبند داس

[1] اس زمانہ میں بعض احباب کو اپنی ریشہ دائیوں کا بھی موقعہ ملا۔

کا ایک مضمون شائع ہوا جسے گورنمنٹ نے قابل اعتراض سمجھا اور ہنس سے پھر ضمانت مانگی۔ پریشد نے ضمانت دینے سے انکار کر کے پرچہ بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ منشی پریم چند کو یہ کارروائی ناگوار ہوئی۔ انھوں نے ''ہنس'' کو پریشد سے اپنی ملکیت میں واپس لے کر جاری رکھا۔ اور گو اس وقت سے اس پر برابر نقصان آرہا ہے لیکن مسز پریم چند صاحبہ اور ان کے صاحب زادے اسے پریم چند کی یادگار سمجھ کر اب بھی شائع کر رہے ہیں۔

اگست 1933ء میں انھوں نے ''جاگرن'' نامی ایک ہندی ہفتہ وار اخبار کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی جو سر سجت بنود شنکر جی دیاس کے اہتمام میں جاری ہوا تھا۔ پریم چند جی سمجھتے تھے کہ اس ہفتہ وار سے مطبع کو مدد ملے گی اور ان کی بھی گذر اوقات ہو جائے گی لیکن دو ہی سال کے اندر انھیں آٹھ دس ہزار کا گھاٹا ہوا جس سے مجبور ہو کر بالآخر انھیں اسے بند کرنا پڑا۔ اسی اثناء میں بعض کارکنوں نے بھی انھیں دھوکا دیا، غرض پریس پر قرض کا بار کثیر ہو گیا جس کی ادائیگی کے لیے ان کو اپنی خلاف طبیعت[1] بمبئی جا کر اجنتا سنی ٹون کی ملازمت کرنا پڑی۔ ساڑھے سات سو روپیہ ماہوار تنخواہ طے ہوئی اور باقاعدہ معاہدہ ہو گیا۔ لیکن بمبئی میں ان کی صحت اچھی نہیں رہی اور کام کے متعلق بھی سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ تو یہ سمجھ کر گئے تھے کہ اچھے اچھے ڈرامے تیار کر کے، ملک میں علمی و ادبی فلم جاری کریں گے۔ لیکن وہاں کچھ اور ہی صورت حال نظر آئی۔ مالکان اپنی مرضی کے مطابق عام پسند تماشے بنواتے ہیں اور بڑے سے بڑے مصنف کے تصنیف کردہ پلاٹ میں من مانی کاٹ چھانٹ کر دیتے ہیں اور مصنف کو دم مارنے کا موقع نہیں رہتا کچھ اور بھی باتیں ہوئیں جو شاید سنیما کمپنیوں کی خصوصیات میں داخل ہیں، لیکن جن سے آپ کو نفرت تھی، اس لیے آپ نے معاہدہ سے پہلے ہی اپنی گلوخلاصی کر لی اور مارچ 1935ء میں یہ سلسلہ منقطع کر کے بنارس واپس آگئے اور بقیہ زندگی یہیں ختم کر دی۔

پریم چند کو عرصے سے ضعف معدہ کی شکایت تھی۔ سرکاری ملازمت کے ابتدائی زمانہ میں بھی وہ مہوبا میں بہت بیمار ہو گئے تھے۔ اس کے بعد یہ شکایت کم و بیش برابر جاری رہی، وہ زیادہ احتیاط یا پرہیز کے عادی نہ تھے۔ اور نہ اپنی صحت کی زیادہ پروا یا کوئی خاص فکر کرتے تھے۔ بمبئی کی آب و ہوا انھیں بالکل موافق نہ آئی اور یہاں ان کا ہاضمہ اور بھی کمزور ہو گیا۔ آخر جون 1939ء میں یہ شکایت حد سے متجاوز ہو گئی اور بالآخر جلندھر ہو گیا جس سے باوجود علاج و معالجہ جانبر نہ ہو سکے۔ جب وہ لکھنؤ گئے تو مرض بہت ترقی کر چکا تھا اور ان کی طبیعت بھی علاج سے اکھڑ چکی تھی۔ ضعف بہت بڑھ چکا تھا۔ کوئی چیز ہضم نہ ہوتی

---

[1] جون 34ء

تھی۔ اور اٹھنا بیٹھنا محال ہو گیا تھا۔

بنارس پہنچ کر ہومیو پیتھک علاج ہوا۔ مگر مرض میں کوئی تخفیف نہ ہوئی بلکہ حالت خراب ہوتی گئی۔ آخر 7 ر اکتوبر کو صبح سے دست آنے شروع ہو گئے۔ شام تک کئی دست آئے اور نقاہت اور زیادہ ہو گئی۔ تمام رات بے چینی سے کٹی۔ صبح ہوئی، منہ دھونے کو منجن اور پانی مانگا، لیکن لڑکا منہ دھلانے آیا تو حالت غیر ہو چکی تھی اور وہ ہل بھی نہ سکتے تھے۔ گھبرا کر بیوی چلا اٹھیں کہ کیا آپ منہ بھی نہ دھوئیں گے، وہ مشکل سے کچھ اشارہ کر سکے، چند ہچکیاں لیں اور ہمیشہ کے لیے سو گئے، ڈاکٹر آیا، نبض دیکھی مگر روح جسم سے عالم بالا کو پرواز کر چکی تھی۔

اے رہ نورد عالم بالا چگونہ ما بے تو خستہ ایم تو بے ما چگونہ

مسز پریم چند صاحبہ

مسز پریم چند صاحبہ (شریمتی شیورانی دیوی) کی عمر اس وقت 47-48 سال کی ہے، ان کے والد نے جو کنوار ضلع فتح پور کے باشندے تھے ان کی شادی بہت ہی کم سنی میں کر دی تھی۔ مگر وہ بچپن ہی میں بیوہ ہو گئیں، اور باپ نے اخلاقی جرأت سے کام لے کر ان کی دوسری شادی پریم چند صاحب سے کر دی، جو اس بارے میں خود بھی مصیبت زدہ تھے اور دوسری شادی بیوہ سے کرنا چاہتے تھے۔ اس شادی کے وقت شریمتی شیورانی جی بہت ہی معمولی ہندی جانتی تھیں۔ مگر اپنے نامور شوہر کے فیض صحبت سے اب وہ ہندی کی ایک مشہور افسانہ نگار ہو گئی ہیں۔ انتظام خانہ داری میں بھی ان کو خاص ملکہ ہے، چنانچہ شادی کے بعد ہی انھوں نے گھرستی کا کل بار اپنے سر پر اٹھا لیا جس کی بدولت پریم چند جی تمام دنیوی جھگڑوں سے آزاد ہو کر تصنیف و تالیف کی طرف ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ اس دوران میں مسز ممدوحہ اپنی علمی لیاقت بڑھاتی رہیں۔ یہاں تک کہ مہوبا میں انھوں نے کئی قصے لکھ ڈالے لیکن پریم چند کو دکھانے کی ہمت نہ ہوئی اس لیے ان کو پھاڑ کر پھینکتی رہیں اور ان سے ان کا ذکر بھی نہ کیا۔

1931ء میں انھوں نے ''ساہس'' نامی ایک چھوٹا سا قصہ لکھا جس کو ان کے چھوٹے بھائی نے کسی طرح دیکھ لیا اور زبردستی ایڈیٹر صاحب ''چاند'' الہ آباد کے پاس بھیج دیا یہ قصہ ایڈیٹر کے پسند آیا اور رسالہ مذکور میں چھپ گیا، تو پریم چند صاحب کو بھی اس کا حال معلوم ہوا۔ اب کیا تھا، ان کا دل کھل گیا اور انھوں نے تیس چالیس قصے لکھ ڈالے۔ چنانچہ ان کی سولہ کہانیوں کا مجموعہ ''ناری ہردیے (عورت کا دل) کے نام سے سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہو چکا ہے۔ اور دوسرا مجموعہ ''سیندور کی رکھشا'' کے نام سے

زیر طبع ہے آپ کی چند کہانیاں اردو میں بھی ترجمہ ہو کر بعض رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔

آپ نے تصنیف و تالیف ہی میں پریم چند کی تقلید نہیں کی بلکہ ان کے پولیٹیکل جذبات میں بھی برابر کی شریک و ہمدرد رہیں، چنانچہ 1927ء میں لکھنؤ میں بائیکاٹ کے متعلق دھرنا رکھنے کے سلسلہ میں ڈیڑھ ماہ کے لیے جیل بھی ہو آئی ہیں پریم چند صاحب کی وفات کے بعد نومبر 1936ء میں آپ نے ہنس کی ایڈیٹر کی ذمہ داری بھی اپنے سر لی اور جون 1937ء تک یہ اہم خدمات انجام دیتی رہیں۔ اس وقت بھی جب شری پت رائے جی نے اس ذمہ داری کو اپنے سر لے لیا ہے آپ کو یہی دھن ہے کہ جس طرح سے ہو سکے آپ کے شوہر نامدار کا جاری کردہ رسالہ ترقی کے ساتھ قائم رہے۔

ایشور اس اولوالعزم خاتون کی ہمت بلند کرے اور اس کے نیک ارادوں میں برکت دے۔

پریم چند صاحب کی بعض تصانیف کا حال

جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا پریم چند جی کا سب سے پہلا ناول ''ہم خرما و ہم ثواب'' کے نام سے بابو مہادیو پرشاد ورما لکھنوی کے اہتمام سے شائع ہوا تھا۔ بابو صاحب اخبار ''ہندوستانی'' ''وایڈوکیٹ'' کے نامور ایڈیٹر مرحوم بابو گنگا پرشاد صاحب ورما کے عزیز اور سستے اردو ناولوں کے مشہور پبلشر تھے جنھیں وہ مختلف کتب فروشوں کے ہاتھ پیسے یا پون پیسے فی جز کے حساب سے فروخت کیا کرتے تھے۔ ''ہم خرما و ہم ثواب'' نواب رائے کے نام سے، بہت ہلکے کاغذ پر معمولی لکھائی چھپائی میں شائع ہوا تھا۔ مصنف کی پہلی تصنیف ہونے کی حیثیت سے اس میں نومشقی کی اکثر خامیاں موجود تھیں۔ اس کے بعد وہ نواب رائے کے نام سے مضامین لکھتے رہے۔ اور 1907ء میں ''سوز وطن'' کے نام سے ان کے پانچ قصوں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ زمانہ پریس سے شائع ہوا جو انھیں دنوں نیا نیا قائم ہوا تھا۔

ہندی میں ان کا سب سے پہلا ناول ''پرتگیا'' نامی ہے جو غالباً 1906ء میں لکھا گیا تھا اور جس کا اردو ترجمہ ''بیوہ'' کے نام سے ہوا ہے۔ اردو میں تصنیف و تالیف اور مضمون نگاری سے انھیں کوئی مالی منفعت نہیں ہوئی۔ مگر جب انھوں نے اپنا دوسرا ہندی ناول ''سیوا سدن'' لکھا تو کلکتہ پستک ایجنسی نے اس کے پہلے ایڈیشن کے لیے یکمشت ساڑھے چار سو روپے دیے۔ غالباً یہ 1914ء کی بات ہے، مگر پریم چند صاحب کو اپنی ادبی زندگی میں اتنی رقم اس سے پہلے کبھی نہیں ملی تھی۔ اس ناول سے ان کو یہ بھی فائدہ ہوا کہ ہندی داں جماعت میں ان کی ڈھاک بیٹھ گئی چنانچہ اسی پبلشنگ ایجنسی نے ان کے دوسرے ہندی

لے ۱۲ر نومبر 1930 کا کارڈ ہے کہ ۱۱ر نومبر کو مسز دھنپت رائے گرفتار ہو گئیں۔ اس وقت گھر پر موجود نہ تھا۔ واپس آ کر یہ واقعہ سنا''

ناول ''پریم آشرم'' کے لیے تین ہزار روپیہ بطور معاوضہ پیش کیے۔ اس ناول کے ہندی میں اب تک آٹھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کا ترجمہ اردو میں گوشۂ عافیت کے نام سے شائع ہوا ہے۔ جس کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت شاید ابھی تک نہیں آئی۔

تیسرا ناول ''نرملا'' چاند پریس الہ آباد نے 1923ء میں شائع کیا، اس کا ترجمہ بھی لاہور میں ہو چکا ہے۔ غالباً 1928ء میں آپ نے اپنا چوتھا ناول ''رنگ بھوی'' لکھا، جو گنگا پستک مالا آفس لکھنؤ کے اہتمام سے شائع ہوا اور جس کے صلہ میں گنگا پستک مالا کے مالکوں نے دو ہزار روپے نذر کیے۔ اب تک آپ جو کچھ لکھتے تھے اسے پہلے اردو رسم الخط ہی میں لکھتے تھے بعد کو ناگری حروف میں اس کی نقل ہو جاتی تھی لیکن ''رنگ بھوم'' ہندی ہی میں لکھا گیا۔ اس کے بعد اس کا ترجمہ منشی اقبال ورما صاحب سحر ہتگامی کی مدد سے اردو میں ہوا۔ رنگ بھوی نے آپ کی ادبی شہرت کو چار چاند لگا دیے۔ ہندوستانی اکیڈیمی صوبۂ متحدہ نے بھی اس ناول کو اس سال کی بہترین تصنیف قرار دے کر مصنف کو پانچ سو روپیہ کا انعام دیا۔

اس کے بعد پریم چند نے ''کایا کلپ'' نام سے ایک اور ہندی ناول لکھا۔ اور اسے سرسوتی پریس بنارس سے شائع کیا۔ اب تک اس کی چار ہزار سے زائد کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔ ناگری پرچارنی سبھا بنارس نے اس کے صلہ میں آپ کو دو سو روپیہ کا انعام دیا۔ اب تک اس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں چار ہزار کاپیاں بکنے کے بعد اب تیسرے ایڈیشن کی تیاری ہے۔

1931ء میں آپ نے اپنے ہی پریس سے ''غبن'' نامی ایک اور ہندی ناول شائع کیا۔ اس کا ترجمہ بھی لاہور میں چھپا ہے۔ ہندی کا پہلا ایڈیشن ختم ہو چکا ہے، اب دوسرا زیر طبع ہے۔

1932ء میں آپ نے کرم بھوی ناول لکھا اور اپنے ہی پریس سے شائع کیا، اس کی بھی دو ہزار جلدیں فروخت ہو چکی ہیں، اس کا اردو ترجمہ ''میدان عمل'' کے نام سے جامعہ ملیہ دہلی سے شائع ہوا ہے۔

1936ء میں آپ کا آخری ناول ''گئودان'' بھی سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوا۔ اس کی دو ہزار جلدیں بک چکی ہیں اور پہلا ایڈیشن قریب اختتام ہے، اس کا اردو ترجمہ بھی سحر صاحب کی امداد سے جلد ہی شائع ہو گا۔

مستقل ناولوں کے علاوہ آپ کی متفرق کہانیوں کے اردو ہندی میں بہت سے مجموعے شائع ہوئے ہیں سوز وطن کے بعد سب سے پہلے زمانہ پریس کے اہتمام سے پچیس قصوں کا مجموعہ ''پریم پچیسی'' کے نام سے نکلا۔ اس کے بعد بتیس قصوں کا مجموعہ ''پریم بتیسی'' کے نام سے لاہور سے شائع ہوا۔ ''فردوس خیال'' انڈین پریس الہ آباد سے نکلا۔ ''مان سرور'' کے نام سے پچاس کہانیوں کا مجموعہ سرسوتی پریس بنارس

سے نکلا اور بھی کئی دلچسپ مجموعے شائع ہوئے جن کی مفصل فہرست کسی دوسری جگہ درج کر دی گئی ہے۔
آپ کی کہانیاں سب سے پہلے ''زمانہ'' میں چھپیں، بعدۂ بہت سے ہندی اردو رسالوں نے آپ کے زور قلم سے فائدہ اٹھایا اور ملک کے سبھی بڑے بڑے پرچوں نے حتی الوسع آپ کی قدردانی کی۔ ''زمانہ'' کے ساتھ آپ کی مراعات ہمیشہ خاص رہیں۔ چنانچہ اس کی قلیل البضاعتی کا ہمیشہ لحاظ کرتے رہے۔ اور جو کچھ اس نے پیش کیا اس کو ہنسی خوشی قبول کر لیتے تھے واقعی اس کے ساتھ ان کا تعلق ہمیشہ مخلصانہ و برادرانہ رہا۔ ہندی میں ان کو دو روپیہ فی صفحہ سے لے کر چار پانچ روپیہ فی صفحہ تک ملا۔ اردو میں مسٹر محمد علی نے اپنے روزانہ اخبار ''ہمدرد'' کے لیے ان سے کئی افسانے تیس روپیہ فی افسانہ کے حساب سے لکھائے تھے۔ دو ایک اور پرچوں نے بھی یہی معاوضہ دیا مگر اردو قصوں کے لیے شاید اس سے زیادہ معاوضہ کبھی نہیں ملا۔

ناولوں کے علاوہ انھوں نے ہندی میں سرشار کے ''فسانۂ آزاد'' کے خاص خاص حصوں کا ہندی ترجمہ بھی ''آزاد کتھا'' کے نام سے کیا۔ یہ کتاب مطبع نولکشور میں چھپی ہے۔

''رام چرچا'' کے نام سے بچوں کے لیے رامائن کا تذکرہ نہایت سلیس زبان میں تصنیف کیا، کئی درسی کتابیں لکھیں، ''باکمالوں کے درشن'' کے نام سے کئی مضامین کا ایک مجموعہ الہ آباد کے مشہور پبلشر لالہ رام نراین لال نے شائع کیا جو کئی سال تک صوبہ کے مدرسوں میں رائج رہا۔ ابتدائی درجوں کے لیے ہندستانی زبان کی سلیس ریڈریں مرتب کیں جو مطبع نولکشور میں طبع ہوئیں۔ اس طرح وہ آخر دم تک ہندستانی ادب کی بہترین خدمت انجام دیتے رہے۔ ان کی بلند پایہ تصانیف ملک کے ہر طبقہ میں ان کا نام ابد تک روشن رکھیں گی۔

پریم چند کے خیالات

اوائل عمر کے واقعات و تجربات کی بنا پر پریم چند نے زندگی کے مسائل و ضروریات کے متعلق کچھ خاص نظریے قائم کر لیے تھے، مگر ان کی طبعی خوش اخلاقی اور فطری زندہ دلی نے ان کو خواہ مخواہ زاہد خشک یا ناصح مشفق بننے نہیں دیا۔ شاید اسی وجہ سے عرصے تک ان کے اکثر دوستوں کو ان کی اخلاقی عظمت کا پتہ نہ چلا۔ شروع میں ان کے اصول اتنے نمایاں نہ تھے۔ لیکن عمر کے ساتھ یہ نظریے ان کی تحریر و تقریر اور بیوپار برتاؤ میں دخل پانے لگے۔ پریم چند کے مزاج کی افتاد کچھ ایسی پڑی تھی کہ خوش حال بزرگوں کی تنگ دست اولاد کی رسمی تکلفات کی پابندی کی کوشش بیجا میں آئے دن جس پریشانی سے سامنا رہتا ہے، اس سے ان کو کوئی نہ ہمدردی تھی۔ چنانچہ انھوں نے بعض خطوط میں لکھا ہے کہ میں کوئی رئیس زادہ نہیں جو

مجھے اپنی جھوٹی تمکنت قائم رکھنے کی خواہ مخواہ فکر ہو۔

علمی اور ذہنی دونوں حیثیت سے ان کی طبیعت بہت ہی سلیس واقع ہوئی تھی۔ شادی بیاہ کی تقریبات پر اہل ملک جس دھوم دھام کے عادی ہیں، پرانی مرجاد اور بزرگوں کا نام قائم رکھنے کے غلط خیال سے اکثر لوگ جو اپنی اوقات سے زیادہ خرچ کرنا ضروری سمجھتے ہیں ان کا وہ ہمیشہ خوب مضحکہ اڑایا کرتے اور فقرے کسا کرتے تھے۔

خود بھی وہ دھوم دھام اور طمطراق سے ہمیشہ دور بھاگتے تھے، اور احباب کے یہاں تقریبات میں بھی کم ہی شریک ہوتے تھے۔

میرے یہاں ایک مرتبہ لڑکی کی شادی کے موقعہ پر دیگر احباب کے ساتھ چند انگریز حکام کی بھی دعوت ہوئی تھی مگر پریم چند نے اس کو پسند نہ کیا، اور ایک خط میں لکھا کہ آپ نے انگریز حکام کی دعوت ناحق کی، آخر اس سے کیا فائدہ سمجھا، جہاں تک میں سمجھتا ہوں، یہ خیال ان کے ذہن نشین ہو گیا تھا کہ جب انگریز ہم ہندوستانیوں سے بالکل الگ تھلگ رہتے ہیں تو ہم لوگوں کو بھی ان سے دور ہی رہنا چاہئے۔ قومی خودداری کے وہ بڑے حامی تھے۔ اور ادبی زندگی کے ابتدائی زمانہ میں سرکاری افسران نے ان کے ساتھ جو نامنصفانہ برتاؤ کیا اس کا اثر ان کے دل سے کبھی زائل نہیں ہوا۔ نان کوآپریشن کے زمانہ میں سرکاری تشددات نے انھیں اور بھی برگشتہ کر دیا۔ واقعی ''سوزِ وطن'' کے متعلق حکام کی کارروائی سراسر بیجا تھی کیونکہ اس کا کوئی قصہ ایسا نہ تھا جس پر ان کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کی جا سکتی۔

پریم چند شروع میں ''نواب رائے'' کے نام سے لکھا کرتے تھے، اور یہ نام انھوں بہت عزیز تھا، کیونکہ ان کے والد انھیں پیار سے ''نواب'' کے نام سے پکارا کرتے تھے، اور یہ نام ہندو مسلمانوں کے معاشرتی اتحاد کی یاد بھی تازہ رکھنے والا تھا۔ مگر جب ''سوزِ وطن'' کی بے ضابطہ ضبطی کے بعد ان کے افسران نے انھیں تصنیف و تالیف کی ممانعت کر دی تو ان کو اس نام کو خیرباد کہنا پڑا۔ ان تنگ خیال افسران کا بس چلتا تو آج ہندوستانی ادب میں پریم چند کا وجود ہی نہ ہوتا۔ مگر دریا کا بہاؤ کس نے روکا ہے اور ہوا کا رخ کون بدل سکا ہے؟ ''نواب رائے'' کی روح نے ''پریم چند'' کے قالب میں جنم لیا۔ یہ نام راقم الحروف ہی نے تجویز کیا تھا اور عرصہ تک مرحوم اس نام سے صرف ''زمانہ'' ہی میں لکھتے رہے۔ یہ پابندی خود ان کی محبت نے ان پر عائد کی تھی، ورنہ اس کا کوئی مطالبہ یا معاہدہ نہ تھا، لیکن جب تصنیف و تالیف ہی پر بسر اوقات منحصر ہو گئی تو یہ آن باقی نہ رہ سکی۔ ''زمانہ'' سے انھیں ہمیشہ دلی محبت رہی اور اس طرف سے بھی اس بات کا پورا لحاظ رکھا گیا کہ مروت و دوستی میں پریم چند صاحب خواہ مخواہ خسارہ میں نہ رہیں۔ ''زمانہ'' کی

مالی حالت قابلِ اطمینان ہوتی تو انھیں کسی دوسری جگہ کوئی معاملہ کرنے کی حاجت ہی نہ ہوتی۔ وہ بھی اس بات کو بخوبی جانتے تھے اور اسی لیے ہم لوگوں میں آخر تک وہی خلوص رہا۔

پریم چند اس کے قائل نہ تھے کہ گورنمنٹ ہر قسم کی زیادتی کرے اور وہ اس کے ساتھ انتہائی ایمانداری برتتے رہیں چنانچہ "سوزِ وطن" کی جس قدر کاپیاں ان کے پاس تھیں وہ انھوں نے حکام کے حوالہ کر دیں، مگر میرے پاس جو اسٹاک باقی رہ گیا تھا اس کی کسی نے خبر نہ لی اور یہ کتابیں ضائع ہونے سے بچ گئیں، اور آہستہ آہستہ فروخت ہوتی رہیں۔ پریم چند تصنیف و تالیف و مضمون نگاری کے متعلق اپنے افسروں کا حکم ناجائز سمجھتے تھے۔ اس لیے اس کی علانیہ خلاف ورزی نہ کر سکنے پر بھی وہ "پریم چند" کا نام اختیار کر کے پہلے سے بھی زیادہ سرگرمی سے لکھنے لگے۔ پریم چند کے نام کے متعلق یہاں ان کے ایک خط کا اقتباس بیجا نہ ہوگا جو انھیں دنوں انھوں نے راقم الحروف کو لکھا تھا:۔

"برادرم ایک کارڈ لکھ چکا ہوں، اب مفصل خط لکھ رہا ہوں، میں نے ذکر مادت کا تیغہ ایک قصہ لکھنا شروع کیا ہے، بارہ تیرہ صفحے ہو چکے ہیں شاید پانچ چھ صفحہ اور چلے، جلد ہی ختم کر کے بھیجوں گا۔

"پریم چند" اچھا نام ہے، مجھے بھی پسند ہے افسوس صرف یہ ہے کہ پانچ چھ سال میں نواب رائے کو فروغ دینے کی جو محنت کی گئی وہ سب اکارت ہوگئی۔ یہ حضرت قسمت کے ہمیشہ لنڈورے رہے اور شاید رہیں گے۔ یہ قصہ (ذکریادت کا تیغہ) میرے خیال میں کئی مہینے سے تھا، میں نے اپنے خیال میں ربندر ناتھ کے طرز کی کامیابی کے ساتھ پیروی کی ہے مگر بڑی نقل نہیں ہے، پلاٹ بالکل اوریجنل ہے، میں نے کئی قلم توڑ دیئے ہیں اور دس پانچ ورق بھی کالے کر ڈالے۔ معلوم نہیں آپ کو پسند آتا ہے یا نہیں۔ یہ قصہ ملا کر میرے پانچ قصوں کا مجموعہ نکالنے کا کافی مسالہ جمع ہو جائے گا...... اس مجموعے کا نام میں نے "برگِ سبز" سوچا ہے۔ شاید آنجناب کو پسند آئے۔ اس لیے کہ میں ناموں کے بارے میں آپ کی پسند کا قائل ہوں۔[1]"

اس کے بعد وہ ایجوکیشنل گزٹ الہ آباد میں مضامین لکھنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں، اور انھیں دوسرے نام سے بھیجنا تجویز کرتے ہیں، کیونکہ وہ لکھتے ہیں۔

---

1 1923ء میں بھی جب بنارس میں اپنا پریس قائم کیا تو اس کے نام کے متعلق راقم سے مشورہ کیا۔ ایک خط میں تحریر ہے کہ "ناموں" کے انتخاب میں آپ کو کمال ہے۔"

''میرے لیے کلکٹر کو ہر ایک مضمون دکھانے کی ایسی بخ لگی ہے کہ ایک مضمون مہینوں میں لوٹ کر آتا ہے۔.........ایجوکیشنل گزٹ میں پریم چند کا نام نہیں دینا چاہتا۔ معلوم نہیں یہ حضرت ہاتھ پیر سنبھالنے پر کیا لکھیں پڑھیں، انھیں قصہ گو ہی رہنے دیجیے، بیٹھے بیٹھے پریم اور بیر رس کے قصے لکھا کریں،
اس سے پہلے کل پہاڑ ضلع ہمیر پور سے ایک خط میں لکھا کہ:۔

''نواب رائے'' تو کچھ دنوں کے لیے اس جہان سے گئے، دوبارہ یاد دہانی ہوئی ہے کہ تم نے معاہدہ میں گو اخباری مضامین نہیں لکھے مگر اس کا منشا ہر قسم کی تحریر سے تھا۔ گویا میں خواہ کسی عنوان پر لکھوں، خواہ وہ ہاتھی دانت ہی پر کیوں نہ ہو مجھے پہلے سے جناب فیض مآب کلکٹر صاحب بہادر کی خدمت میں پیش کرنا پڑے گا۔ اور مجھے چھٹے چھ ماہے لکھتا نہیں، یہ میرا روز کا دھندھا ٹھہرا۔ ہر ماہ ایک مضمون صاحب بہادر کی خدمت میں پہنچے تو وہ یہ سمجھیں گے کہ میں اپنے فرائض سرکاری میں خیانت کرتا ہوں۔ اور کام سر پر تھوپا جائے گا۔ اس لیے نواب رائے مرحوم ہوئے، ان کے جانشین کوئی اور صاحب ہوں گے۔''

افسروں کی بیجا خوشامد ان سے نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک ڈپٹی انسپکٹر مدراس سے ان کی اسی بات پر بگڑ گئی کہ انھوں نے دورہ میں ان سے کئی چار پائیاں طلب کیں جس کا یہ کوئی انتظام نہ کر سکے۔ مگر پریم چند خود بھی اپنے ماتحتوں سے نہ کوئی فرمائش کرتے تھے اور نہ خاطر و مدارات کے روادار تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنے فرائض منصبی انجام دینے کے علاوہ افسری ماتحتی کے زیادہ قائل نہ تھے، اور تملق و خوشامد سے انھیں دلی نفرت تھی، دوسروں کے ساتھ شرافت کا برتاؤ ضروری سمجھتے تھے، اور سب کے درد دکھ میں شریک ہونے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ چنانچہ بعض گندم نما جو فروش دوستوں نے ان سے بیجا فائدہ بھی اٹھایا۔ بہرحال دیہاتی مدرسوں کو ڈپٹی و سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس کی جو خدمت و خوشامد کرنا پڑتی ہے وہ انھیں دل سے بہت ناپسند تھی، اور انھوں نے اپنے ماتحت مدرسوں سے کبھی کوئی خدمت لینا پسند نہ کیا۔

اس طرح وہ ابتدا سے آخر تک خواہ مخواہ کی سرپرستی اور ہر وقت کی نیاز مندی دونوں سے دور رہے، نجی بیوہار میں وہ مساوات اور بے تکلفی کے قائل تھے۔ ایک خط میں وہ بالکل صحیح لکھتے ہیں کہ میں ادنیٰ و اعلیٰ دونوں کی حماقتوں سے دور رہنا چاہتا ہوں۔

پریم چند آپس کی الجھن اور جھنجھٹ سے بھی دور رہتے تھے اور اپنی زندگی امن و سکون کے ساتھ بسر کرنا چاہتے تھے۔ وہ خود کسی کے ساتھ سختی کرنا پسند کرتے اور نہ کسی کی کوئی کڑی بات برداشت کر سکتے

۱؎ عجیب بات ہے کہ پریم چند خطوں میں سنہ و تاریخ لکھنے کے بہت کم عادی تھے۔ ا۔ ز

تھے، نجی معاملات میں وہ ہمیشہ اعتدال پر قائم رہنا چاہتے تھے۔ ان کی سب سے بڑی آزمائش دوسری شادی کے موقعہ پر ہوئی جہاں تک معلوم ہو سکا ہے ان کی پہلی بیوی بہت بدسلیقہ تھیں جس کی وجہ سے ان کی زندگی تلخ ہو گئی تھی۔ آئے دن کے جھگڑوں کے علاوہ کچھ اور واقعات بھی پیش آئے جن کے سبب سے مصالحت کا کوئی موقعہ باقی نہ رہا۔ جب مجھے انھوں نے مفصل حالات بتلائے تو میں بھی انھیں الزام نہ دے سکا۔ اتفاق سے اس بارے میں ان کا ایک خط محفوظ رہ گیا ہے۔ جس پر کوئی تاریخ نہیں ہے لیکن یقیناً یہ 1905ء کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

> ''برادرم، اپنی بپتی کس سے کہوں، ضبط کیے کیے کوفت ہو رہی ہے، جوں توں کر کے ایک عشرہ کاٹا تھا کہ خانگی تردداّت کا تانتا بندھا.......... بیوی صاحبہ نے ضد پکڑی کہ یہاں نہ رہوں گی، میکے جاؤں گی، میرے پاس روپیہ نہ تھا۔ ناچار کھیت کا منافع وصول کیا، ان کی رخصتی کی تیاری کی، وہ رو دھو کر چلی گئیں، میں نے پہنچانا بھی پسند نہ کیا۔ آج ان کو گئے ہوئے آٹھ روز ہو گئے نہ خط نہ پتر، میں ان سے پہلے ہی ناخوش تھا اب تو صورت سے بیزار ہوں، غالباً اب کی ان کی بدائی دائمی ثابت ہو، خدا کرے ایسا ہی ہو، میں بلا بیوی کے رہوں گا۔ ادھر ننہال سے اور والدہ کی طرف سے ضد ہے کہ بیاہ رچے اور ضرور رچے۔ جب کہتا ہوں مفلس ہوں......تو والدہ کہتی ہیں کہ تم اپنی رضامندی دے دو، تم سے ایک کوڑی نہ مانگی جائے گی...... بہرحال اب کی تو گلا چھڑا ہی لوں گا، آئندہ کی بات نارائن کے ہاتھ ہے۔ جیسی آپ کی صلاح ہوگی ویسا کروں گا۔ اس بارے میں ابھی پھر مشورہ کرنے کی ضرورت باقی ہے۔

اس کے بعد بھی وہ اپنے اوقات کے مطابق پہلی بیوی کو گذارہ کے طور پر کچھ ماہوار بھیجتے رہے۔ شادی کے متعلق بڑے غور و خوض اور بہت کچھ بحث و مباحثہ کے بعد انھوں نے طے کیا کہ دوسری شادی کی جائے تو کسی بیوہ ہی سے کی جائے۔

پریم چند کا اس وقت عالم شباب تھا اور وہ ایک ہنس مکھ، زندہ دل، خوشرو و تندرست اور کھاتے کماتے نوجوان تھے۔ سر یواستو فرقہ میں جس سے ان کا تعلق تھا قرارداد کی رسم عام ہے، اور ہزار دو ہزار روپیہ نقد تو ان کو آسانی سے مل سکتا تھا۔ اور یہ رقم اس وقت ان کے لیے ایک بڑی رقم تھی۔ ان کے اہل خاندان بیوہ بیاہ کے خلاف تھے مگر وہ اپنے فیصلے پر اٹل رہے، اور ضلع فتح پور میں موضع سلیم پور (کنوار) میں شریمتی شیورانی دیوی کے ساتھ ان کی دوسری شادی ہو گئی، یہ شادی مبارک ثابت ہوئی۔ اس وقت اس

شادی سے ایک لڑکی[1] اور دو لڑکے دھنو (سری پت رائے) اور بنو (امرت رائے) موجود ہیں۔ ایک اور لڑکا منو نامی ہوا تھا لیکن وہ جولائی 1920ء کو گورکھپور میں چیچک کی نذر ہو گیا۔ اس بچے کی افسوسناک موت کی خبر دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "تقدیر نے تو اپنی دانست میں مجھے سزا دی ہوگی، لیکن یہاں فکروں کا آدھا بوجھ سر سے دور ہو گیا، مجھے بھی مرنے دیجیے، اسی گوشہ میں۔"

یہ دل جلے الفاظ رنج و غم کی حالت میں لکھے گئے تھے، تاہم یہ سچ ہے کہ وہ کثرت اولاد سے گھبراتے تھے، اور ابتدا میں تو اولاد کے خیال ہی سے انھیں الجھن سی ہوتی تھی، گو بچے انھیں دل سے پسند تھے۔ میں نے ایک دفعہ ان سے پوچھا کہ "کسی نئی آمد کی امید ہے؟ تو جواب میں لکھا کہ "اس کی نہ کوئی صورت ہے اور نہ تمنا، آپ سے بطیب خاطر کہتا ہوں۔ ننھے بچوں سے انھیں کس قدر دلچسپی تھی اس کے لیے ان کا خط ملاحظہ فرمائیے جو 1914ء میں میرے چھوٹے بھائی مسٹر رام سرن کے پہلے بچے کی ولادت میں انھوں نے لکھا تھا۔

> "خوشی کی بات ہے، ایشورا اسے زندہ رکھے، میری نہ پوچھئے احباب پھلیں پھولیں، میری خوشی کے لئے اتنا ہی کافی ہے زیادہ کی ضرورت نہیں، انھیں کے بچوں کو پیار کر کے اپنی خوشی منا لوں گا۔"

آپ نے دیکھ لیا کہ پریم چند نے اپنے ننھے بچے کی موت کا کن فلسفیانہ انداز میں ذکر کیا۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ اس قسم کے حادثوں کو بڑے صبر و سکون سے برداشت کرتے تھے اور موت کو فلسفانہ نقطۂ خیال سے دیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ 23/اپریل 1933ء میں راقم الحروف کو بھی ایک خورد سال بچے کی موت کا غم اٹھانا پڑا تو پریم چند نے ایک تعزیتی خط لکھا، جس سے موت کے متعلق ان کا نظریہ بخوبی واضح ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

> "بھائی جان! تسلیم، کل صبح ایک خط لکھا، شام کو آپ کا کارڈ ملا۔ پڑھ کر نہایت صدمہ ہوا بیماریاں اور پریشانیاں تو زندگی کا خاصہ ہیں، لیکن بچے کی حسرتناک موت ایک دل شکن حادثہ ہے، اور اسے برداشت کرنے کا اگر کوئی طریقہ ہے تو یہی کہ دنیا کو ایک تماشا گاہ یا کھیل کا میدان سمجھ لیا جائے۔ کھیل کے میدان میں وہی شخص تعریف کا مستحق ہوتا ہے جو جیت سے پھولتا نہیں، ہار سے روتا نہیں، جیتے تب بھی کھیلتا ہے ہارے تب بھی کھیلتا ہے جیت کے بعد یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہاریں نہیں ہار کے بعد جیت کی آرزو ہوتی ہے۔ ہم سب کے

---

[1] اس لڑکی کا بیاہ ہو چکا ہے اور اب یہ بھی دو بچوں کی ماں ہے۔

سب کھلاڑی ہیں، مگر کھیلنا نہیں جانتے۔ ایک بازی جیتی، ایک گول جیتا تو ہپ ہپ ہرّے کے نعروں سے آسمان گونج اٹھا۔ ٹوپیاں آسمان میں اُچھلنے لگیں، بھول گئے کہ یہ جیت دائمی فتح کی گارنٹی نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ دوسری بازی میں ہار ہو۔ علیٰ ہذا۔ ہارے تو پست ہمتی پر کمر باندھ لی، روئے، کسی کو دھکے دیئے، فاؤل کھیلا اور ایسے پست ہو گئے گویا پھر جیت کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوگی۔ ایسے اوچھے تنگ ظرف آدمی کو کھیل کے وسیع میدان میں کھڑے ہونے کا بھی مجاز نہیں۔ اس کے لیے گوشہ تاریک ہے اور فکر شکم۔ بس یہی اس کی زندگی کی کائنات ہے۔ ہم کیوں خیال کریں کہ ہم سے تقدیر نے بے وفائی کی! خدا کا شکوہ کیوں کریں! کیوں اس خیال سے ملول ہوں دنیا ہماری نعمتوں سے بھری تھالی کو ہمارے سامنے سے کھینچ لیتی ہے، کیوں اس فکر سے متوحش ہوں کہ قزاق ہمارے اوپر چھاپہ مارنے کی تاک میں ہے۔ زندگی کو اس نقطہ نگاہ سے دیکھنا اپنے اطمینان قلب سے ہاتھ دھونا ہے۔ بات دونوں ایک ہی ہے، قزاق نے چھاپہ مارا تو کیا؟ ہار میں سارے گھر کی دولت کو کھو بیٹھے تو کیا؟ فرق صرف یہ ہے کہ ایک جبر ہے دوسرا اختیار، یہ قزاق زبردستی جان اور مال پر ہاتھ بڑھاتا ہے لیکن ہار زبردستی نہیں آتی۔ کھیل میں شریک ہو کر ہم خود ہار اور جیت کو بلاتے ہیں، قزاق کے ہاتھوں لوٹا جانا زندگی کا معمولی واقعہ نہیں، حادثہ ہے۔ لیکن کھیل میں ہارنا اور جیتنا معمولی واقعے ہیں۔ جو کھیل میں شریک ہوتا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ ہار اور جیت دونوں ہی سامنے آئیں گی۔ اس لیے اسے ہار سے مایوسی نہیں ہوتی۔ جیت سے پھولا نہیں سماتا۔ ہمارا کام تو صرف کھیلنا ہے، خوب دل لگا کر کھیلنا، خوب جی توڑ کر کھیلنا، اپنے کو ہار سے اس طرح بچانا گویا ہم کونین کی دولت کھو بیٹھیں گے لیکن ہارنے کے بعد، پٹخنی کھانے کے بعد گرد جھاڑ کر کھڑے ہو جانا چاہئے اور پھر خم ٹھونک کر حریف سے کہنا چاہئے کہ ایک بار اور!

کھلاڑی بن کر آپ کو واقعی بڑا اطمینان ہوگا میں خود نہیں کہہ سکتا کہ میں اس معیار پر پورا اتر دوں گا یا نہیں مگر کم سے کم اب مجھے کسی نقصان پر اتنا رنج نہ ہوگا جتنا آج سے چند سال قبل ہو سکتا تھا۔ میں اب شاید نہ کہوں گا کہ ہائے زندگی اکارت گئی، کچھ نہ کیا، زندگی کھیلنے کے لیے ملی تھی کھیلنے میں کوتاہی نہیں کی۔ آپ مجھ سے زیادہ کھیلے ہیں، ہار اور جیت دونوں دیکھی ہیں آپ جیسے کھلاڑی کے لیے شکوۂ تقدیر کی ضرورت نہیں۔ کوئی گولف اور پولو کھیلتا ہے۔ کوئی کبڈی کھیلتا ہے۔ بات ایک ہی ہے ہار اور جیت دونوں ہی میدانوں میں ہیں کبڈی کھیلنے

والے کو جیت کی خوشی کچھ کم نہیں ہوتی۔ اس بار کا غم نہ کیجئے، آپ نے خود ہی نہ کیا ہوگا، آپ مجھ سے مشاق ہیں۔ میں ۵ یا ٦ مئی تک کانپور آنے والا ہوں یہاں کی کوئی چیز درکار ہو تو بے تکلف لکھئے گا۔ دیگر حالات میرے پہلے خط سے معلوم ہوئے ہوں گے۔"

پریم چند کو ضعف معدہ کی پرانی شکایت تھی، جس سے بعض اوقات انھیں زندگی سے مایوسی ہو جاتی تھی۔ انیس سال کا ذکر ہے کہ اپریل 1918ء میں ایک خط میں لکھا تھا کہ:

"آپ کیا کہتے ہیں، زندگی کی امید یہاں بھی کم ہے مگر چاہتا ہوں کہ یا تو ساتھ چلیں یا خفیف تقدیم و تاخیر ہو، میں آپ کا پیشرو بننا چاہتا ہوں، مگر موت کی فکر مارے ڈالتی ہے، کتنا چاہتا ہوں پرماتما پر بھروسہ رکھوں مگر دل موذی ہے سمجھتا نہیں، کسی مہاتما کی صحبت ملے تو شاید راستہ پر آئے۔ یہی فکر ہے کہ آج مر جاؤں تو ان بال بچوں کا کون پرسان حال ہوگا، گھر میں کوئی ایسا نہیں ہے...... دوستوں میں اگر ہیں تو آپ اور نہیں ہیں تو آپ، اور نہ ہوگا تو میرے بعد سال دو سال ان کی خبر تو لے سکتے ہیں۔"

اس سے پہلے جون 1915ء کا ایک کارڈ ہے جس میں لکھتے ہیں کہ "میرے لیے بڑھاپے کا ذکر فضول ہے میں کس بوڑھے سے کم ہوں۔" ان دنوں ضعف معدہ کے باعث ان کی تندرستی خراب ہو چکی تھی اور اب ان کی صورت پہلے سے آدھی بھی نہ رہ گئی تھی۔ آخر اسی مرض نے برسوں کے بعد مرض الموت کی شکل اختیار کی۔

گو پریم چند کو عرصہ تک سرکاری ملازمت کی بندشوں کو برداشت کرنا پڑا۔ لیکن ملازمت سے انھیں دلی نفرت تھی۔ بستی سے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:۔

"میں جو عاجز ہوں وہ ماتحتی سے، کام ایسا کرنا چاہتا ہوں جس میں بجز میری طبیعت کے اور کسی کا تقاضا نہ ہو۔ جی میں آئے تو رات دن کام کرتا رہوں، اور جی چاہے تو فوراً کروں مگر یہ صرف مالکانہ حیثیت سے ہو سکتا ہے۔"

جنگ یورپ کے زمانہ میں صوبہ کی گورنمنٹ نے وار جرنل (جنگی اخبار) جاری کیا اور راقم بھی اس کی کمیٹی کا ایک ممبر نامزد ہوا تو میں نے اس خیال سے کہ پریم چند کو ایک وسیع تر حلقے میں اظہار لیاقت کا موقع مل جائے ان سے دریافت کیا کہ اگر وہ جنگی اخبار کے اردو ایڈیشن کی ذمہ داری لینے پر رضامند ہوں تو ان کے لیے کوشش کی جائے مگر انھوں نے لکھا کہ مجھے اس کام سے معاف رکھئے۔ میں اسے قومی کام نہیں سمجھتا اور مترجمی امیدواروں کا کام ہے جو اخبار نویسی سے بالکل الگ ہے۔"

درحقیقت ان کی طبیعت کو کسی فرمائشی پروپیگنڈے یا غرض مندی کی وکالت سے لگاؤ نہ تھا اور اس لیے سرکاری اخبار کے نام ہی سے بدظن تھے۔ چنانچہ ایک دوسرے خط مورخہ 6رجولائی 1918ء میں لکھتے ہیں۔

''اب میں سرکاری اخبار نویس کیا بنوں گا جنگ کے متعلق مضامین لکھنے کی بھی اس وقت مجھے فرصت نہیں ہے، بس اسی اپنی رفتار قدیم پر رہوں گا...... کسی پرائیویٹ اسکول کی ہیڈ ماسٹری، اور ایک اچھے اخبار کی ایڈیٹری اور کچھ پبلک کام، یہی میرا معراج زندگی ہے۔ اخبار بھی کسانوں کا حامی اور مددگار ہو...... اخبار کی ایڈیٹری کا بھی وقت آیا لیکن یہ ایڈیٹری کیسی مہنگی پڑی، اس کا ذکر آگے آئے گا۔

پریم چند کی طبیعت پر کبھی مذہبی عقیدت مندی کا رنگ غالب نہیں ہوا۔ وہ فطرتاً معقول پسند و آزاد خیال واقع ہوئے تھے۔ تمدنی معاملات میں بھی وہ وقتی ضروریات کے مطابق اصلاحات کے حامی تھے لیکن اس کے باوجود وہ دوسروں کے جذبات کا ہمیشہ بہت احترام کرتے تھے، اور مذہبی عقائد کے معاملے میں کسی کا دل دکھانا پسند نہ کرتے تھے۔ لیکن مناسب احتیاط برتنے کے بعد وہ نیک نیتی سے اظہار رائے سے گھبراتے بھی نہ تھے اور نہ کبھی نامعقول اعتراضوں سے مرعوب ہو کر اپنی رائے بیان کرنے میں پس و پیش کرتے تھے۔ کربلا کا ڈرامہ انھوں نے بڑی چھان بین اور غور و فکر کے بعد لکھا تھا۔ اشاعت سے پہلے دفتر زمانہ میں بھی اس پر مزید غور و خوض کیا گیا، اور چند مسلم دوستوں کے علاوہ بعض شیعہ احباب سے بھی اس کے بارے میں مشورہ کیا گیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں عرصہ تک خط و کتابت ہوئی، ڈرامہ پر ہر ممکن پہلو سے نظر ڈالی گئی اور بعض تاریخوں کی بھی ورق گردانی کی گئی۔ شروع ہی میں، میں نے انھیں لکھا تھا کہ کہیں کوئی بات ایسی نہ لکھ جائیں جو شیعہ احباب کو ناگوار ہو اس کا جواب مورخہ ۱۷رفروری 1924ء یہ ملا کہ:۔

''آپ یقین رکھیں میں نے احترام کہیں نظر انداز نہیں ہونے دیا ہے ایک ایک لفظ پر اس بات کا خیال رکھا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی احساسات کو صدمہ نہ پہنچے، اس کا مقصد پولیٹیکل ہے، باہمی اتحاد کو بڑھانا اور کچھ نہیں۔''

دو ایک دوستوں نے اس کے متعلق تنقیدی نوٹ لکھے تھے حضرت احسنؔ بھی نے بھی جو ان دنوں دفتر میں مستقل اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کرتے تھے ایک نوٹ لکھا تھا اور میں نے اسے بجنسہ پریم چند کے پاس بھیج دیا تھا مگر دوسری تنقیدوں کا صرف خلاصہ بھیجا۔ ان تنقیدوں میں بعض رکی اعتراضات کیے گئے تھے جو انھیں قدرتاً ناپسند ہوئے اور چونکہ میں نے ان اعتراضات کو بلا کاٹ چھانٹ ان کے پاس بھیج

دیا تھا اس سے انھیں میرے متعلق بھی غلط فہمی ہوئی۔ اور مجھ سے بھی وہ کچھ دل برداشتہ سے ہو گئے چنانچہ 23/جولائی 1924ء کو ان کا ایک طولانی خط آیا جس میں انھوں نے بعض اعتراضات کا بہت مفصل جواب دیا۔ چونکہ یہ خط ایک دلچسپ علمی موضوع کے متعلق ہے اس لیے یہاں پر اس کا تمام وکمال اقتباس بیجا نہ ہوگا۔ خط مذکور یہ ہے:-

"بھائی جان۔ تسلیم، بہتر ہے کہ کربلا نہ نکالئے، میرا کوئی نقصان نہیں ہے۔ نہ میں مفت کا خلجان سر پر لینے کو تیار ہوں۔ میں نے حضرت حسین کا حال پڑھا، ان سے عقیدت ہوئی، ان کے ذوق شہادت نے مفتوں کر لیا اس کا نتیجہ یہ ڈراما تھا، اگر مسلمانوں کو یہ بھی منظور نہیں ہے کہ کسی ہندو کے زبان وقلم سے ان کے کسی مذہبی پیشوا یا امام کی مدح سرائی ہو تو میں اس کے لیے مصر نہیں ہوں، اس کارڈ[1] کا جواب دینا تو فضول ہے۔ ہاں حضرت احسن کے نوٹ کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

آپ فرماتے ہیں کہ شیعہ حضرات یہ نہیں پسند کر سکتے کہ ان کے کسی مذہبی پیشوا کا ڈراما تیار کیا جائے۔ اگر شیعہ حضرات اپنے مذہبی پیشوا کی مثنوی پڑھتے ہیں، افسانے پڑھتے ہیں، مرثیے سنتے اور پڑھتے ہیں تو انھیں ڈراما سے کیوں اعتراض ہو۔ کیا اس لیے کہ ایک ہندو نے لکھا ہے؟

تاریخ اور تاریخی ڈراما میں فرق ہے جیسا آپ خود تسلیم کرتے ہیں۔ تاریخی ڈراما کے خاص کیرکٹروں میں تو کوئی تغیر نہیں کر سکتا۔ مگر ثانوی کیرکٹروں کے تبدیل اور ترمیم یہاں تک کہ تخلیق میں بھی اسے آزادی ہے۔ حضرت اصغر کی عمر چھ ماہ کی تھی لیکن بعض روایتوں میں چھ سال کی بھی لکھی ہوئی ہے۔ میں نے وہی روایت اختیار کی جو میرے موافق حال تھی۔ اگر بالفرض ایسی روایت نہ بھی ہو تو حضرت اصغر اس ڈراما کے کوئی خاص کیرکٹر نہیں ہیں۔

یزید کی اخلاقی حیثیت مجھ سے کہیں زیادہ پست مورخین نے دکھلائی ہے۔ میں مجبور تھا میں نے تو صرف اس کی شراب خواری اور عیش پسندی کا ذکر کیا ہے، شرابخوار تھا بھی، خلفاء راشدین کے بعد اور جتنے خلفا ہوئے سب پیتے تھے اور دھڑلے سے پیتے تھے، دیکھو یزید کے متعلق سید خاں امیر علی کیا فرماتے ہیں۔

"Yezid was both cruel and treacherous. His depraved nature knew no pity or justic. His pleasures were as degrading as his companions were low and vicious. He insulted the ministers of

1۔ ایک دوست کا کارڈ تھا جس میں انھوں نے ڈرامہ کی اشاعت کی ممانعت کی تھی

religion by dressing up a monkey as a learned divine and carrying the animal mounted on a beautifully caparisoned Syrian donkey. Drunken riotousness prevailed at court........."

امیر علی کو تو آپ مستند مانتے ہی ہوں گے، کیا میں نے یزید کو اس سے بھی زیادہ پست کر دیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں حالانکہ وہ مسلمان تھا۔ خوب دلیل ہے نواب...... بھی تو مسلمان تھا۔

تاریخی حیثیت سے آپ نے ساہس راؤ کے مداخل پر اعتراض کیا ہے۔ بیشک قدیم روایات میں اس کا کوئی ذکر نہیں، مگر ایک روایت ہے جو میں نے رسالہ آئینہ الہ آباد سے لی ہے، ممکن ہے وہ روایت غلط ہو۔ لیکن اگر مان لیجئے زیب داستان ہی کے لیے لی گئی ہے تو کیا؟ ڈراما تاریخ تو نہیں ہے۔ اس سے کسی تاریخی کیرکٹر پر اثر نہیں پڑتا۔ ان کیرکٹروں کا منشا ہے ہندوؤں کا حضرت حسین پر فدا ہو جانا، ان کا وجود ہی اسی لیے ہوا ہے۔ یہ ڈراما تاریخی ہونے کے ساتھ پولیٹیکل ہے۔

ادبی حیثیت کے متعلق آپ کے اعتراض کو بسر و چشم تسلیم کرتا ہوں۔ میں نے کبھی ادیب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ مجھے لوگ زبردستی، انشا پرداز اور سحر نگار اور الم غلم لکھ دیا کرتے ہیں میں بات کو سیدھی طرح سیدھی زبان میں کہہ دیتا ہوں، رنگ آمیزی اور انشا پردازی میں قاصر ہوں۔ اور جب ڈراما اس لیے تیار کیا گیا ہے کہ ہر خاص و عام اسے پڑھے تو زبان آرائی اور بھی بے موقع ہو جاتی۔ بہر حال میں ڈراما کی اشاعت کے لیے مصر نہیں ہوں۔ اس لیے یہ بحث ملتوی اور ختم ہوگئی۔ خواجہ حسن نظامی نے کرشن بیتی لکھی۔ ایک ہندو نقاد نے اس کی تعریف کی، صرف اس لیے کہ مولانا نے کرشن سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا تھا، میرا بھی یہی منشا تھا۔ اگر حسن نظامی کو وہ آزادی حاصل ہے اور مجھے نہیں ہے تو مجھے اس کا افسوس نہیں۔

براہ کرم اس مسودہ کو واپس فرما دیجئے۔

ہاں میں یہ عرض کرنا بھول گیا۔ ڈراما دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک قرأت کے لیے، ایک اسٹیج کے لیے، یہ ڈراما محض پڑھنے کے لیے لکھا گیا تھا، کھیلنے کے لیے نہیں۔ زیادہ والسلام۔

اس کے بعد مزید خط و کتابت ہوئی اور ڈراما کی غزلوں کے بارے میں لکھا گیا جس کا جواب یہ ملا:۔

> غزلیں حذف کرنے کی ضرورت نہیں میں نے حضرت حسین کی زبان سے کوئی عاشقانہ غزل کہیں نہیں ادا کرائی ہے۔ یزید کی مجلس میں غزلیں گائی گئی ہیں اور بے موقع نہیں ہیں۔ غزلوں کا انتخاب اچھا نہیں ہوا ہے تو آپ کو اختیار ہے اچھی غزلیں چن کر شامل کر لیجئے......

غرض اس طولانی بحث و مباحثہ کے بعد یہ ڈراما جولائی 1926ء سے ''زمانہ'' میں شائع ہونا شروع ہوا اور اپریل 1928ء تک مسلسل چھپتا رہا۔ اس دوران میں بھی بعض لوگوں نے اعتراضات کیے اور اخباروں میں بھی لے دے ہوئی، مگر چونکہ کسی نے کوئی ایسی بات نہ کہی جس پر پہلے ہی غور نہ کر لیا گیا تھا، اس لیے ان تحریروں کی کوئی پرواہ نہیں کی گئی۔ بات یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر عموماً معترضین کا دلی منشا کچھ اور ہوتا ہے، اور مذہب کی آڑ میں یا تو دلی عناد نکالا جاتا ہے یا خواہ مرعوب کرنے کی فکر ہوتی ہے۔ مگر ان باتوں کا ''زمانہ'' نے کبھی کوئی اثر نہیں لیا۔ پریم چند کو بھی اظہار رائے میں باک نہ تھا مثلاً شدھی کی تحریک جس طرح چلائی گئی انھیں پسند نہ تھی، اس لیے گو ان دنوں انھوں نے اردو میں مضامین لکھنا بند کر رکھا تھا، لیکن اس تحریک کی مخالفت میں انھوں نے ایک پُر زور مضمون لکھ کر ''زمانہ'' میں شائع کرایا۔ اس بارے میں ۲۳ اپریل 1923ء کے خط میں لکھتے ہیں کہ:

> ''ادھر میں نے اردو لکھنا بند سا کر رکھا ہے۔ فرصت ہی نہیں ملتی۔ لیکن ملکانہ شدھی پر ایک مختصر سا مضمون لکھ رہا ہوں۔ مجھے اس تحریک سے سخت اختلاف ہے، تین چار دن میں بھیج دوں گا آریہ سماج والے بھنائیں گے، لیکن مجھے امید ہے کہ آپ اس مضمون کو ''زمانہ'' میں جگہ دیں گے۔''

آخر یہ مضمون ''زمانہ'' میں چھپا اور اس کے چھپتے ہی ملک میں آگ سی لگ گئی، مسلمانوں نے اس کے آ... خیالی کی تعریف کی، اور آریہ سماجی حلقوں میں تہلکہ پڑ گیا لیکن پریم چند آخر تک اپنی رائے پر ڈٹے رہے۔ 1924ء میں ایک خط لکھتے ہیں:-

> ''ہندو مسلم فسادات کا سلسلہ جاری ہے، میں نے پہلے ہی پیشین گوئی کی تھی۔ وہ حرف بہ حرف صحیح ثابت ہو رہی ہے۔''

پریم چند تنگ خیال اور فرقہ پرست ہندو مسلمان دونوں کے مخالف اور دونوں سے نالاں رہتے تھے۔ اور تنگ خیال پنڈتوں اور متعصب مولویوں دونوں کو ملک کے لیے خطرناک سمجھتے تھے۔ اپنے افسانہ ''دیر و حرم'' میں انھوں نے ان دونوں کی خوب قلعی کھولی ہے۔ یہ افسانہ سب سے پہلے ہندی میں شائع ہوا، پھر اس کا اردو ترجمہ کئی جگہ چھپا اور دفتر زمانہ کے ہفتہ وار اخبار ''آزاد'' میں بھی نقل ہوا۔ اس پر ایک مقامی مسلم پرچے نے بڑا واویلا مچایا، میں نے پریم چند کو اس مخالفت کی اطلاع دی تو انھوں نے 25 رجون 1924ء کو اس کا جواب یہ دیا کہ:-

> ''اس مضمون میں کسی کو شکایت کا کیا موقعہ ہے۔ فرقہ پرستوں کی ذہنیت کا پردہ فاش کیا گیا

ہے، بلا کسی رو رعایت کے ایک طرف ہندو پنڈتوں اور پجاریوں کی مذہب پروری کا نظارہ ہے، دوسری جانب مولویوں کی مذہب پروری کا۔ دونوں مذہب کے پردے میں اپنی اپنی نفس پروری کے شکار ہو رہے ہیں۔ اگر کچھ لوگوں کو بُرا لگتا ہے تو میرا کیا اختیار ہے۔"

پریم چند پارٹی بندی سے بھی کوئی واسطہ نہ رکھتے تھے اور نہ کسی خاص سیاسی پارٹی سے منسلک ہو جانا پسند کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جس طرح ممکن ہو ملکی ترقی ہو۔ نان کوآپریشن کے آخری زمانے میں جب سوراجیہ پارٹی قائم ہوئی تو میں نے پریم چند سے پوچھا کہ آپ کی ہمدردی کس طرف ہے، اس کے جواب میں 17 رفروری 1923ء کو لکھتے ہیں کہ:-

"آپ نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں کس پارٹی میں ہوں، میں کسی پارٹی میں نہیں ہوں، اس لیے کہ اس وقت دونوں میں کوئی پارٹی کچھ عملی کام نہیں کر رہی ہے۔ میں اس آنے والی پارٹی کا ممبر ہوں جو عوام الناس کی سیاسی تعلیم کو اپنا دستور العمل بنائے۔ سوراجیہ خلافت پارٹی کی جانب سے جو کانسٹی ٹیوشن نکلا ہے اس سے البتہ مجھے کلی اتفاق ہے، مگر تعجب یہی ہے کہ ایک پارٹی سے کیوں نکلا میرے خیال میں دونوں ہی پارٹیاں اس معاملے میں متعلق ہیں۔"

دراصل ان کی یہی خواہش تھی کہ ملک کے عوام ابھریں اور خوشحالی و فارغ البالی کا دور دورہ ہو۔ اسی نقطۂ نظر سے وہ مذہب، سیاست اور علم و ادب کو دیکھتے اور پرکھتے تھے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ ان کا زاویۂ نگاہ اور ان کے خیالات بہترین سیاسی فلاسفروں کے موافق اور موجودہ ملکی ضروریات کے مطابق نہ تھے؟ ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کی صدارتی تقریر میں انھوں نے ادب کے متعلق اپنے دلی خیالات تفصیل وتشریح سے بیان کر دیے ہیں۔ لٹریچر کا صحیح مقصد کیا ہے اور مصنفین و مؤلفین کو تصنیف و تالیف میں کن باتوں کو اپنے پیش نظر رکھنا چاہئے ان کی توضیح اردو میں سب سے پہلی مرتبہ اسی تقریر میں ہوئی چنانچہ ہم اسے بجا طور پر ہندوستانی ادب کا فرمان اعلیٰ قرار دے سکتے ہیں۔ جسے ہندوستانی ادیبوں کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھنا چاہئے۔ اسی خیال سے پریم چند ادب و معاشرت دونوں کی اصلاح کے زبردست حامی تھے اور جب کبھی ان کو موقعہ ملا انھوں نے عملی حیثیت سے اپنے خیالات کی پیروی میں دریغ نہیں کیا، لیکن عقائد کی تائید میں وہ کسی طبقے کے ساتھ اعلان جنگ کے قائل نہ تھے اور نہ اصلاح کی دھن میں کسی کی دل آزاری پسند کرتے تھے۔ وہ دوسروں کے جذبات کا پورا احترام کرتے تھے البتہ ان کا دلی رجحان اصلاح معاشرت ہی کی طرف تھا۔ مگر اس میں بھی تشدد و نا منصفی سے انھیں نفرت تھی۔

پریم چند کا سیاسی میلان طبع گرم دل کی طرف تھا۔ احمد آباد کانگریس دیکھنے ہم لوگ ساتھ ہی

ساتھ گئے اور ایک ہی جگہ ٹھہرے لیکن وہ مسٹر تلک کے طرفدار تھے اور میں مسٹر گوکھلے اور سر فیروز شاہ کا حامی تھا۔ ہر وقت بحث رہتی تھی مگر دونوں اپنی جگہ قائم رہے۔

جزوی اصلاحات کو وہ کافی نہ سمجھتے تھے اور منٹو مارلی اور مانٹیگو چمسفورڈ کی اسکیم سے مطمئن نہ تھے۔

آئینی اصلاحات کے متعلق ان کا نقطۂ خیال ان کے خط مورخہ 21/دسمبر 1919ء سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"میں ریفارم اسکیم یا ایکٹ کے متعلق مسٹر چنتامنی وغیرہم سے متفق نہیں ہوں، میرے خیال میں معتدل پارٹی اس وقت ضرورت سے زیادہ مغرور اور نازاں ہے حالانکہ اصلاحوں میں اگر کوئی خوبی ہے تو صرف یہ کہ تعلیم یافتہ جماعت کو کچھ اسامیاں زیادہ مل جائیں گی۔ اور جس طرح یہ جماعت وکیل بن کر رعایا کا خون پی رہی ہے، اسی طرح آئندہ یہ حاکم بن کر رعایا کا گلا کاٹے گی۔ اس کے سوائے اور کوئی جدید اختیار نہیں دیا گیا ہے۔ جو اختیارات دیے گئے ہیں ان میں بھی اتنی شرطیں لگادی ہیں کہ ان کا دینا نہ دینا برابر ہو گیا....."

لبرل پارٹی نے مانٹیگو چمسفورڈ اسکیم کے متعلق جس ضد اور اصرار سے کام لیا اور کانگریس کی مجوزہ ترمیمات میں سے کسی سے اتفاق رائے نہ کیا۔ اس سے مجھے بھی سخت اختلاف تھا۔ لیکن دنیوی معاملات میں میرا رجحان باہمی سمجھوتہ ہی کی طرف رہتا ہے۔ پریم چند نابرابر کی لڑائی میں سمجھوتہ کے خیال سے مشتبہ رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کڑی جدوجہد کے بغیر کچھ حاصل نہ ہوگا اور وہ اس کے لیے عوام کو جلد سے جلد تیار کرنے کی طرف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ حکومت سے سخت ٹکر لیے بغیر کام نہ چلے گا اور وہ اس کے لیے نقصانات برداشت کرنے کے واسطے بھی تیار تھے۔ انگریز حکام سے انھیں عام طور سے بدظنی تھی، اور بالآخر وہ سرکاری ملازمت ترک کر کے باضابطہ نان کوآپریٹر ہو گئے۔ ایک خط کا جس میں مہاتماجی کی تحریک نمک کو قبل از وقت کہا گیا تھا، وہ نہایت گرمجوشی سے جواب دیتے ہیں۔

"جس طرح موت ہمیشہ قبل از وقت ہوتی ہے، ساہوکار کا تقاضا ہمیشہ قبل از وقت ہوتا ہے اسی طرح ایسے سارے کام جن میں ہمیں مالی وقتی نقصان کا اندیشہ ہو قبل از وقت معلوم ہوتے ہیں۔ اس تحریک کی قبولیت ہی بتلا رہی ہے کہ وہ قبل از وقت نہیں ہے۔

اس موقعہ پر صاف ظاہر ہوا کہ اگر دو فیصدی انگریزی خواں اصحاب تحریک کے ساتھ ہیں تو 98 فیصدی اس کے مخالف ہیں۔ قومی اعتبار سے یونیورسٹیوں اور اسکولوں پر جتنا روپیہ

صرف ہوا وہ قریباً ضائع ہوگیا۔ یہ لوگ سرکار کے آدمی ہوئے۔ قوم کے نہیں ہیں۔ غیر انگریزی داں۔ کاروباری اور پیشہ ور طبقوں ہی نے اس تحریک میں جان ڈالی ہے۔ اگر تعلیم یافتہ آدمیوں کے بھروسے ملک بیٹھا رہے تو شاید قیامت تک اُسے آزادی نصیب نہ ہوگی۔ جب معلوم ہے اور اس کے لیے ثبوت اور دلیل کی ضرورت نہیں کہ سرکار کوئی رفارم اس وقت تک نہیں دیتی جب تک اسے یہ یقین نہ ہو جائے کہ اس تحریک کے پیچھے کتنی طاقت ہے تو تعلیم یافتہ جماعت کا اس سے کنارہ کش رہنا کتنا دل شکن ہے! قانون پیشہ، طبابت پیشہ، پروفیسر اور سرکاری ملازمان ان سب نے جتنی غلامانہ ذہنیت کا ثبوت دیا ہے اس کی مجھے امید نہ تھی۔ یہ طبقہ اپنی خیریت گورنمنٹ کا اقتدار قائم رہنے میں سمجھتا ہے۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اپنی آسائش اور دنیا طلبی کو فراموش نہیں کرسکتا۔ یہی اس کا دین و ایمان ہے۔ وہ یا تو آزادی چاہتا ہی نہیں یا اس کے لیے قیمت نہ دے کر دوسروں پر تکیہ کرنا ہی اپنی شان کے مناسب سمجھتا ہے۔ یا وہ اس خیال میں مگن ہے کہ آپ ہی آپ آزادی مل جائے گی۔ کانگریس کے دور اول میں وہ اس سے خائف رہا، کانگریس کے دور ثانی میں بھی اس کی یہی حالت رہی۔ وہ صریح دیکھ رہا ہے کہ جو کچھ اسے ملا اور جسے اب وہ اپنا حق سمجھتا ہے۔ وہ دوسروں کے ایثار قربانی کا نتیجہ ہے۔ یہی Bourgeoisie فضا ہے، جو نادار فرقہ کو دار فرقہ کا دشمن بنا دیتی ہے......

اس خط سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ پریم چند ان دنوں سرکاری تشددات سے کس قدر متاثر ہو گئے تھے انھیں دنوں ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ:

''گورنمنٹ کی زیادتیاں نا قابل برداشت ہو رہی ہیں۔ پنڈت جواہر لال کی ضعیف ماں کے ساتھ کیسی بدعتیں کی گئیں......اب باہر رہنے میں مجھے بھی بے حیائی معلوم ہو رہی ہے۔''

چند ہی روز بعد 7/ جون (غالباً 1930ء) کے خط میں لکھنؤ سے لکھتے ہیں:۔

''یہاں کی حالت تو آپ کو معلوم ہی ہے شہر فوجی کیمپ بنا ہوا ہے بالکل بے ضرورت ....ایک بات اور عرض کروں، اگر کہیں گرفتار ہو جاؤں یا ڈنڈے پڑ جائیں اور روح قالب عنصری سے پرواز کر جائے تو میرے پسماندگان کی تھوڑی بہت خبر لیتے رہیے گا۔ مجھے غریق رحمت کر کے اور پسماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا فرما کر خاموش نہ ہو جایئے گا۔ کیونکہ اس زمانہ میں سب کچھ ممکن ہے۔ آج محرم کا دن ہے، دیکھیں خیریت سے گذرتی ہے

یا کل مارشل لا جاری ہوتا ہے۔" نقیر دھنپت رائے۔

بات یہ ہے کہ ظاہری بے پرواہی کے باوجود پریم چند بڑے ذکی الحس اور خوددار واقع ہوئے تھے اور وقتی جوش سے متاثر ہو جاتے تھے۔ مشترکہ ملکی معاملات میں باہمی منافقت انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی جو لیڈر ملک میں یگانگت پیدا کرنے میں گرمجوشی دکھاتے ان پر فدا ہو جانے کو تیار ہو جاتے تھے۔ چنانچہ 9/جنوری 1924ء کے خط میں بنارس سے لکھتے ہیں:-

...... مجھے تو اس وقت علی برادران کی صلح کل پالیسی فریفتہ کر رہی ہے۔ ان کے خیالات میں جو حیرت انگیز انقلاب ہوا ہے میں اس کو اصلی شدھی سمجھتا ہوں، اور ایسی ہی شدھی دیرپا ہو سکتی ہے۔

پریم چند اس عمل وایثار کے زمانہ میں لفظی اُلٹ پھیر کی شاعری کی کوئی ضرورت نہ سمجھتے تھے۔ اس لیے انھیں اردو شاعری سے بھی چنداں دلچسپی نہ تھی۔ اور جیسا کہ فراق صاحب نے لکھا ہے رسمی غزل گو شعراء کو وہ دل سے ہیچ سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ جب "زمانہ" کا ایک پورا پرچہ آتش کی شاعری کے نذر کر دیا گیا تو انھوں نے ایک نجی خط میں اس کے خلاف بڑے زور شور سے پروٹسٹ کیا۔ یہاں پر اس خط کا اقتباس خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ لکھتے ہیں:

"زمانہ" نومبر کا پرچہ دیکھ کر میرے دل میں جو خیالات پیدا ہوئے انھیں عرض کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں امید کہ آپ کو ناگوار نہ ہوگا۔ اس زمانہ میں گوناگوں اخلاقی، سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل ہماری تمام تر توجہ کے مستحق ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ "زمانہ" کا قریب قریب ایک پورا نمبر محض آتش کے کلام کے تبصرہ کے نذر ہو گیا۔ میں آتش کی استادی کا قائل ہوں۔ لکھنؤ کی شاعری کا مذموم پہلو آتش کی شاعری میں مقابلتہً کم ہے پھر بھی اتنا زیادہ ہے کہ باستثناء ان حضرات کے جو لکھنوی شاعری کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور سبھی طبائع کو موجودہ معیار اور ذوق صحیح سے گرا ہوا نظر آتا ہے۔

لٹریچر کا موضوع تہذیب، اخلاق، مشاہدہ، جذبات، انکشاف، حقائق اور واردات و کیفیات قلب کا اظہار ہے جو شاعری حسن و عشق کو آئینہ و شانہ، خنجر و محشر، سبزہ و خط اور دہن و کمر کے تخیل سے ملوث کرتی ہو وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ آج ہم اس کا ورد کریں جن کی افتاد طبیعت اس رنگ کی ہے۔

انھیں اختیار ہے آتش یا ناسخ رند اور امانت کا وظیفہ پڑھیں۔ لیکن "زمانہ" کے مختلف الطبائع ناظرین کو اس ورد و وظیفہ میں شریک ہونے کے لیے مجبور کرنا کہاں کا انصاف ہے؟ اس میں آتش کے کلام کا انتخاب پیش کیا گیا ہے مگر اس انتخاب میں بیشتر ایسے اشعار ہیں جنھیں ذوق لطیف ہرگز قابل ستائش نہ سمجھے گا۔ ملاحظہ ہو:-

بھر گیا دامن نظارہ گل نرگس سے آنکھ اٹھا کر جو کبھی تم نے ادھر دیکھ لیا

آنکھ کی رعایت سے نرگس کو لا کر دامن نظارہ کو گل نرگس سے بھر دینا اس میں کیا ندرت خیال ہے، کیا حقیقت ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا؟

قاصدوں کے پاؤں توڑے بدگمانی نے میرے خط دیا لیکن نہ بتلایا نشاں کوئے دوست

نشاں کیوں نہ نہیں بتلایا؟ تھی آپ کی حماقت یا نہیں۔ آپ کو خوف ہوا کہیں معشوق عاشق کا دم نہ بھرنے لگے۔ واہ رے معشوق اور واہ رے عاشق، دونوں زندہ درگور۔ ایسے اشعار ایک نہیں سیکڑوں ہیں بہت چھان بین کرنے سے سو دو سو اشعار سارے دیوان میں ایسے نکلیں گے جو پاکیزہ کہے جا سکیں جن میں واقعی جذبہ، سچا درد۔ حسرت، چونکا دینے والی جدت، رعشہ براندام کر دینے والی نازک خیال جنون انگیز مستی ہو۔ ''زمانہ'' میں اگر میرا اندازہ غلطی نہیں کرتا تو ایک درجن مرتبہ آتش کی مرثیہ، کی جا چکی ہے۔ یقینا مشاغل ادب میں شعرائے سلف کی مرثیہ خوانی کے سوا اور بھی بہت سے ضروری کام ہیں اور خاص کر ان شعرا کی جن کے دیوان کو کندن و کاہ برآوردن کے مصداق ہیں۔ میرا خیال ہے کہ رسالہ کے ایڈیٹر کو ذاتی رجحانات اور دوستانہ تعلقات سے بالاتر رہنا چاہئے۔ اس کا فرض ہے کہ ہر رنگ اور ہر مذاق کے ناظرین کا لحاظ رکھے یہ نہیں کہ:

غیرتِ مہر رشکِ ماہ ہو تم خوب صورت ہو بادشاہ ہو تم
جس نے دیکھا تمھیں وہ مر ہی گیا حسن کے تیغ بے پناہ ہو تم

(تیغ دیکھ کر کون مرجاتا ہے)

فوق ہے سارے خوش جمالوں پر وہ ستارے جو ہیں تو ماہ ہو تم

جیسے طفلانہ جذبات کے اشعار سے پرچہ کا پرچہ بھر دیں۔

غزل کے بارے میں ان کا اصلی خیال کیا تھا۔ اس پر انھوں نے اپنے ایک خط میں کچھ روشنی ڈالی ہے جس میں ڈراما کربلا کی غزلوں کی نکتہ چینی کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''خیالات کی نزاکت نہ دیکھئے، یہ دیکھئے کہ غزل سلیس عام فہم اور سلجھی ہوئی ہے یا نہیں، غزلیات میں اضافتیں اور بعید از فہم استعارے انھیں پسند نہ تھے۔''

مکرمی عبداللہ یوسف علی صاحب نے 1918ء میں لکھا تھا کہ پریم چند سے میری طرف سے کہہ دیجیے کہ میں ان کی طرز تحریر کا بڑا مداح ہوں۔ لیکن انھیں ایسے ناول اور قصے لکھنا چاہئے جن سے قوی جذبات کی نشو و نما میں مدد ملے۔ اور جو فوق العادت واقعات سے پاک ہوں۔ اس کا جواب انھوں نے یہ

دیا کہ "مسٹر عبداللہ کی رائے پر عمل کروں گا حالانکہ super Natural Element انسان کی زندگی میں داخل ہے۔"

اسی طرح ایک دفعہ میرے قدیم محب و معاون مرحوم پنڈت مادھورام صاحب وکیل انبالہ نے یہ شکایت کی تھی کہ پریم چند جی نے اصلاحی کہانیاں نہیں لکھیں، اس کا جواب دیتے ہیں کہ:

> "پنڈت مادھورام صاحب کو شکایت ہے کہ میں نے اصلاحی کہانیاں نہیں لکھیں، اور اکثر احباب کو شکایت ہے کہ اصلاحی مقاصد میرے قصہ کو خراب کر دیتے ہیں۔ میرے نصف سے زائد قصے کسی نہ کسی تمدنی معاملے سے متعلق ہیں۔ بازار حسن، پریم شرم، رنگ بھوم کوئی بھی اصلاح سے خالی نہیں۔"

اسی خط میں ایک معزز لکھنوی دوست کی نکتہ چینی کا جواب دیتے ہیں جو ان کے مختصر افسانہ "شطرنج" کے متعلق تھی، جس میں لکھنؤ والوں کی بے فکری کا مذاق آمیز پیرایہ میں خاکہ کھینچا گیا تھا۔ لکھتے ہیں کہ:۔

> "ان کے اعتراض بالکل ٹھیک ہیں لیکن انھوں نے قصے کا اصلی منشا نہ سمجھ کر ان جزیات سے بحث کی ہے جس پر روشنی ڈالنے کا میرا ارادہ نہ تھا۔ دیکھنے کی بات صرف اتنی ہے کہ اس وقت لکھنؤ کی رذمار کی یہ Mentality[1] تھی یا نہیں جس کا میں نے ذکر کیا ہے بس......

1914ء تک وہ اپنے طرز تحریر کے متعلق دبدھے میں تھے۔ چنانچہ 4/مارچ 1914ء کا خط ان کے دلی خیالات کا آئینہ ہے، لکھتے ہیں:۔

"...... مجھے ابھی تک یہ اطمینان نہیں ہوا کہ کون سا طرز تحریر اختیار کروں، کبھی تو بنکم کی نقل کرتا ہوں، کبھی آزاد کے پیچھے چلتا ہوں، آج کل کاؤنٹ ٹالسٹائی کے قصے پڑھ چکا ہوں، تب سے کچھ اسی رنگ کی طرف طبیعت مائل ہے، یہ اپنی کمزوری ہے اور کیا۔ یہ قصہ میں روانہ کر رہا ہوں اس میں لطف تحریر کی مطلق کوشش نہیں کی گئی سیدھی سادی باتیں لکھی ہیں، معلوم نہیں آپ پسند کریں گے یا نہیں۔

ناول نویسی کا انہیں شروع سے ارمان تھا۔ چنانچہ 24/جنوری 1917ء کا خط ہے:۔

آج کل ایک قصہ لکھتے لکھتے ناول لکھ چلا، کوئی سو صفحہ تک پہنچ چکا ہے، اسی وجہ سے چھوٹا قصہ نہ لکھ سکا اب اس ناول میں ایسا جی لگ گیا ہے کہ کوئی کام کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ مگر مارچ (نمبر زمانہ) کے لیے دو تین دن میں ضرور کچھ نہ کچھ بھیجوں گا، فروری کے لیے مجبوری ہے۔

---

[1] ذہنیت

اگر آپ اس ناول کو مسلسل دیں تو کیسا ہو، رسالہ کی موجودہ ضخامت اس بوجھ کو نہیں سنبھال سکتی۔ قصہ دلچسپ ہے اور مجھے ایسا خیال ہوتا ہے کہ میں اب کی بار ناول نویسی میں کامیاب ہوسکوں گا......''

اب کی جو قصہ آپ کے پاس دو تین دن میں جائے گا اسے عرصہ ہوا لکھا تھا مگر خوف کے مارے نہیں بھیجا، اس میں واعظ بن گیا ہوں حالانکہ کجا میں اور کجا پیر فرتوت۔ اگر پسند آئے تو چھاپ دیجئے ورنہ ہندی میں چھپ جائے گا......''

ہندی کی طرف دو تین سال پہلے ہی سے مائل ہو رہے تھے، واقعی امر یہ ہے کہ اردو کی کسمپرسی اور اردو داں جماعت کی عام بے قدری نے ان کا دل کھٹا کر دیا تھا۔ 20/ اکتوبر 1915ء کا بستی سے آیا ہوا ایک کارڈ ہے:۔

''زمانہ'' کے لیے ایک قصہ لکھا ہے۔ اب میں ہندی میں بھی لکھ رہا ہوں۔ سرسوتی[1] کو ایک مضمون دیا۔ ''پرتاپ''[2] کے لیے لکھا اس سے زیادہ کام کرنے سے معذور ہوں۔''

1915ء ہی کا بستی سے لکھا ہوا ایک دوسرا خط ہے، جس میں لکھتے ہیں:۔

(پریم پچیسی کے) ہندی ترجمے کے لیے کئی جگہ سے اصرار ہو رہے ہیں۔ میں خود ہی اس کام کو ہاتھ میں لوں گا۔ اب ہندی لکھنے کی مشق بھی کر رہا ہوں، اردو میں اب گذر نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بال مکند گپت مرحوم کی طرح میں بھی ہندی لکھنے میں زندگی صرف کر دوں گا۔ اردو نویسی میں کس ہندو کو فیض ہوا جو مجھے ہو جائے گا۔''

یہ خیال ترقی کرتا گیا، چنانچہ بنارس سے 17/ فروری 1923ء کا خط ہے:۔

...... میں از حد نادم ہوں کہ زمانہ کے لیے عرصے سے کچھ نہ لکھ سکا، بار بار ارادہ کرتا ہوں لیکن کبھی وقت نہیں ملتا اور کبھی مضمون نہیں سوجھتا۔ ہندی رسالوں میں لکھنے کے باعث وقت ہی نہیں ملتا۔ پھر اپنا ناول بھی لکھتے جاتا ہوں۔

''زمانہ کو پھر نقصان کا سامنا کرنا پڑا، افسوس ہے، اردو میں شاید اچھے رسالوں کا قائم رہنا غیر ممکن ہو گیا ہے۔ معلوم نہیں اس کا باعث کیا ہے۔ اردو پڑھنے والوں کی تعداد کم نہیں ہے۔ لیکن غالباً سب مفت کے پڑھنے والے ہیں۔ سب کو دعوٰی نامہ نگاری ہے، سبھی اہل قلم ہیں، پڑھنے والا کوئی نہیں اب...... سے ایک نیا رسالہ...... نکلنے والا ہے۔ دیکھوں کتنے دنوں

---

[1] بنکم چندر چٹرجی مشہور افسانہ نگار بنگال، [2] شمس العلما آزاد دہلوی۔

چلتا ہے۔"

سرسوتی پریس بنارس سے 31/ مارچ 1926ء کا لکھا ہوا کارڈ ہے:۔

"......زمانہ کے لیے کچھ نہیں لکھ سکا اس کی معافی چاہتا ہوں، اردو میں کوئی پرسان حال تو ہے ہی نہیں۔ دو ناولوں کے ترجمے دارالاشاعت پنجاب کو دیے، ابھی کچھ طے نہیں ہوا ہے اور منشی ......صاحب مارے تقاضوں کے ناک میں دم کیے ہیں۔ حالانکہ 150 دے چکا ہوں، لیکن ابھی اتنا ہی اور دینا ہے۔ ان دونوں کتابوں کی اشاعت ہی پر یہ خرچہ وصول ہوگا۔"

"اردو پبلشروں کی بے بضاعتی اور عام پست ہمتی سے دوسرے مصنفین و مؤلفین کی طرح پریم چند کو بھی ہر وقت کوفت رہتا تھا۔ زمانہ کے راستہ میں مالی مجبوریاں نہ ہوتیں تو دوسرے پبلشروں کا پریم چند کو خیال ہی نہ آتا۔ گورکھپور سے ایک خط میں اس بات پر بہت افسوس کیا کہ "مجھے اپنی کتابیں دوسروں کو دینا پڑتی ہیں......"

انھوں نے خود بھی ایک دفعہ ایک لیتھو پریس قائم کرنے کا ارادہ کیا لیکن یہ خیال پورا نہ ہوسکا۔ 22/ اپریل 23ء کا خط ہے:۔

"میرا ارادہ ایک لیتھو پریس رکھنے کا ہے......لوگ کہتے ہیں بنارس میں لیتھو پریس نہیں چل سکتا۔ لیکن ایک بار کوشش کر کے دیکھنا چاہتا ہوں، میری کئی کتابیں نکلنے کے لیے تیار ہو رہی ہیں، پریم پچیسی ختم ہوگئی۔ گوشۂ عافیت محض اس لیے ناتمام ہے کہ کوئی پبلشر نہیں ہے۔ تازہ ڈراما سنگرام بھی اردو میں نکالنا چاہتا ہوں جب تک یہ کتابیں تیار ہوں گی غالباً میرا اپنا ناول تیار ہو جائے گا۔"

32ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ لٹریری کام میں احباب کی قدر دانی کے سوائے اور کیا رکھا ہے۔"

پبلشروں نے ان کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا، اس کا کچھ حال ان کے بعض خطوط سے واضح ہوتا ہے ایک خط مورخہ 25/ فروری 32ء میں اس کی کچھ تفصیل ملاحظہ ہو:۔

"پردۂ مجاز" ابھی تک پبلشر نے نہیں بھیجا، کئی خطوط لکھ چکا۔ نہ روپے بھیجتا ہے نہ کتابیں، نہ جواب دیتا ہے۔ معلوم نہیں بیمار ہے یا کیا؟ ادھر فین کا ترجمہ بھی شروع کر دیا ہے۔ ایک نیا

---

1 ان دنوں میں ان کے چھوٹے افسانوں کا قائل تھا اور لمبے قصوں میں ان کا پڑنا نہیں پسند کرتا تھا۔
2 الہ آباد کا مشہور ہندی رسالہ۔ 3 کانپور کا مشہور اخبار

ناول بھی شروع کر دیا ہے۔ مگر سرد بازاری بلائے جان ہو رہی ہے..... کتابوں کی نئی بکری نہیں..... میں اپریل میں بنارس چلا جاؤں گا اور دیہات میں بیٹھ کر لٹریری کام کرتا رہوں گا، اگر ریڈریں منظور ہو گئیں تو تین سال تک کوئی پریشانی نہ ہوگی۔ آئندہ کیا ہوگا، ایشور جانے..... بڑی ہمت شکن حالت ہے اور سب خیرت ہے۔"

گورکھپور سے ایک خط مورخہ 24 اپریل (سنہ ندارد) میں بھی اردو کی کساد بازاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"کیا حوصلہ اخبار نویسی اور لٹریری کام کا ہو، پریم پچیسی حصہ اول کو چھپے ہوئے چار سال ہوئے۔ مگر ابھی تک نصف پڑی ہوئی ہے۔ حصہ دوم کی مشکل سے 150 جلدیں بکیں ہیں اس سے بہتر نہیں لکھ سکتا اور بہتر کامیابی کی امید نہیں رکھتا۔ آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ میرے ہندی ناول نے خوب شہرت حاصل کی اور اکثر نقادوں نے اسے ہندی زبان کا بہترین ناول کہا ہے۔ یہ بازار حسن کا ترجمہ ہے۔ بازار حسن اب صاف کر رہا ہوں۔

انھیں حالات سے پریشان ہو کر انھوں نے دیسی کرگھوں کا کام شروع کرنا چاہا۔ اس پر جب میں نے لکھا کہ ہم لوگوں کی یہ لائن نہیں ہے، اس سے مالی فائدہ کی امید رکھنا فضول ہے، اس کے متعلق ان کے جواب سے بھی ان کے دلی انتشار کا پتہ چلتا ہے، لکھتے ہیں:۔

"آپ فرماتے ہیں تمھاری لائن یہ نہیں ہے، میں تسلیم کرتا ہوں مگر چارہ کیا ہے؟ میں قربانی کو اپنی ذات تک رکھنا چاہتا ہوں، عیال کو اس چکی میں پیسنا نہیں چاہتا، فی الحال روٹیاں مل جاتی ہیں، کچھ لٹریری کام کر لیتا ہوں، یہ قربانی ہے، خدا اور دنیائے دوں، قوم اور ذات دونوں کو ساتھ لیے ہوں، میں لٹریری کام کو تھوڑی قربانی نہیں سمجھتا۔ جو شخص اپنی فالتو آمدنی کا ایک حصہ کسی مدرسہ کے لیے خیرات کر دیتا ہے۔ وہ ہماری قربانی کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا، جو اپنے لیے سونا تک حرام کر لیتی ہے۔ آپ نے میرے لیے کوئی ایسی تجویز نہیں نکالی جس میں فکر معاش سے آزاد ہو کر میں زندگی کاٹتا۔ میں عرض کر چکا کہ اس سے زیادہ نفس کشی میرے امکان سے باہر ہے اور آپ نے جب کبھی کوئی تجویز کی تو وہی ہوائی۔ آکاشی معاش سے مجھے اطمینان نہیں ہوتا۔ ضروریات کے لیے مستقل صورت چاہئے تکلفات کے لیے آکاشی صورت ہو تو مضائقہ نہیں..... اخباری زندگی میں کس قدر فکر اور جھنجھٹ ہے..... ابھی ہمارے یہاں وہ زمانہ نہیں آیا کہ جرنلزم کو Career (وجہ معاش) بنایا جا سکے۔"

سر بحث اوپندر ناتھ اشک لاہوری نے ایک خط کا اقتباس شائع کیا ہے، اس میں بھی پریم چند نے کتب فروشوں کی سخت شکایت کی ہے، لکھتے ہیں:۔

"بک سیلروں کا تجربہ آپ سے زیادہ تلخ مجھے ہوا ہے......... میرے ڈیڑھ سو روپے دبائے بیٹھا ہے لاہور ہی میں ایک دوسرا پبلشر میرے سات سو روپے ہضم کرنا چاہتا ہے۔
اخبارات کا یہ حال ہے، بک سیلروں کا یہ، بیچارہ مصنف کیا کرے....."

اس پر ستم بالائے ستم یہ کہ بیسوں اصحاب بے تکلف خوشہ چینی ہی نہیں بلکہ ادبی سرقے کے مرتکب ہوئے چنانچہ ایک خط میں اس کی شکایت کرتے ہیں کہ:۔

میرے قصوں کے آج کل بہت چور ہو رہے ہیں، ممکن ہے آپ کو زیادہ نظر آتے ہوں، مجھے ..... دیکھنے[1] کا موقعہ ملا......... نکالتے ہیں، حضرت نے میری عبارت کے پورے پورے پیراگراف نقل کر لیے ہیں۔ جنوری، فروری، مارچ، تینوں نمبروں میں یہی حال ہے۔ اوٹ پٹانگ قصہ لکھ کر اسے مرقہ کے لباس سے بچانے کی کوشش کی ہے۔ فروری کے "ذخیرہ"[2] "میں ظریف الطبع" ایک قصہ ہے لکھنؤ کے ایک صاحب نے لکھا ہے، اسے پڑھیے اور میرا قصہ "مناؤن"[3] پڑھیے، صاف چربہ معلوم ہوگا، صرف جزئیات میں رد بدل کر دیا گیا ہے۔ دماغ پر زور نہ ڈالا چاہیں اور مضمون نگار بننے کا خبط یا جنون سوار، .... کہیے تو ان چوریوں پر ایک چھوٹا سا شگوفہ چھوڑ دوں، یہ حضرات جز بز ہوں گے، ہوا کریں......... مگر اردو میں یہ باتیں معمولات میں ہیں۔ "ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر۔"

میں نے انھیں پریس کے جھنجھٹ میں پڑنے سے بھی روکا تھا۔ میری رائے تھی کہ وہ ترک ملازمت کے بعد صرف تصنیف و تالیف اور مضمون نگاری سے واسطہ رکھیں اور اسی میں استقلال کے ساتھ مصروف رہیں لیکن وہ ایک مستقل کارخانہ قائم کر کے بندھی ہوئی آمدنی کی سبیل نکالنا چاہتے تھے۔ پریس کے کام میں جیسا کہ انھیں بعد میں محسوس ہوا، بلا سمجھے بوجھے کود پڑے اور نقصان کثیر اٹھایا۔ جب پریس و اخبارات کی بدولت کافی زیر بار ہو گئے اور بعض کارپردازوں نے بد معاملگی سے بھی مزید نقصان پہنچایا۔ تو انھیں کسی دوسرے ذریعہ سے روپیہ پیدا کرنے کی فکر ہوئی۔ ہندی تصانیف سے تھوڑا سا سرمایہ جمع ہو گیا

---

[1] یہ ریڈریں ابتدائی درجوں کے لیے تیار کی گئی تھیں۔

[2] غالباً ہزار بارہ سو کاپیاں چھپی تھیں۔

[3] پہلے اردو میں لکھا گیا تھا مگر جب اردو میں کوئی پبلشر نہ مل سکا تو اس کا ہندی ایڈیشن مرتب کیا گیا جو اردو سے پہلے چھپا۔

تھا، مگر پریس کے نقصانات سے اس کے فنا ہونے کا اندیشہ ہو گیا جس کو وہ پسند نہ کرتے تھے کیونکہ اس رقم کو وہ بچوں کے لیے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے اس خیال سے کہ اس میں مزید کمی نہ ہو جائے اور پریس کی زیر باری بالا ہی بالا پوری ہو جائے۔ انھیں فلمی دنیا میں داخل ہونا پڑا۔ نقصان کے باوجود پریس بند کرنے کی طبیعت نہ ہوتی تھی۔ ان کی روز افزوں شہرت نے فلم کمپنیوں کو ان کی طرف متوجہ کر دیا۔ چنانچہ انھیں دنوں شری ہجت جنندر کمار جی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

''بمبئی کی ایک فلم کمپنی مجھے بلا رہی ہے، تنخواہ کی بات نہیں ٹھیکہ کی بات ہے۔ آٹھ ہزار روپیہ سالانہ پر میں اس حالت پر پہنچ گیا ہوں جب مجھ کو اس کے سوائے کوئی چارہ نہیں رہ گیا ہے کہ یا تو وہاں چلا جاؤں یا اپنے ناول کو بازار میں بیچوں،...... کمپنی والے حاضری کی کوئی قید نہیں رکھتے، میں جو چاہوں لکھوں جہاں چاہے چلا جاؤں۔ وہاں سال بھر رہنے کے بعد ایسا کنٹریکٹ کرلوں گا۔ یہیں (بنارس میں) بیٹھے بیٹھے میں چار کہانیاں لکھ دیا کروں گا اور چار پانچ ہزار روپے مل جایا کریں گے جن سے جاگرن[1] اور ہنس[2] دونوں مزے میں چلیں گے۔ اور پیسے کی تکلیف جاتی رہے گی۔''

اس وقت انھیں منجملہ اور حسابات کے دو ہزار روپے کے قریب کاغذ کی قیمت میں ادا کرنے کو تھے۔ مجھے بھی اس کے متعلق لکھا تھا۔ بمبئی سے 10 رجولائی 34ء کا خط ہے۔

''میں یکم جون کو بمبئی چلا آیا۔ اس کمپنی سے ایک معاہدہ کرلیا ہے، سال بھر میں چھ قصے اسے دینا ہوں گے، رسالوں سے متواتر نقصانات ہو رہے تھے۔ بک سیلروں سے روپے وصول نہ ہوتے تھے، کاغذ وغیرہ کا بار بڑھتا جاتا تھا۔ مجبور ہو کر میں نے یہ معاہدہ کرلیا، چھ قصے لکھنا مشکل نہیں ہاں ڈائرکٹروں کے مشورے سے لکھنا ضروری ہے۔ کیا چیز فلم کے لیے موزوں ہوگی، اس کا بہترین فیصلہ وہی کر سکتے ہیں......

مگر سال بھر بھی پورا نہ ہونے پایا کہ وہ فلم ڈائرکٹروں سے اکتا گئے، اور وہاں کی واقعی دنیا نے ان کی آنکھیں کھول دیں۔ چنانچہ 20 ؍اپریل 34ء کو جنندر کمار جی کو پھر لکھتے ہیں کہ:

''میں جن ارادوں سے یہاں آیا تھا ان میں سے ایک بھی پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ یہ پروڈیوسر جس طرح کی کہانیاں بناتے رہے ہیں اس لیک سے جو بھر نہیں ہٹ سکتے۔ رکیک مذاق کو یہ

---

1. لاہور کے ایک اردو رسالہ کا تھا۔

2. ایک دوسرا اردو رسالہ جو غالباً حیدرآباد دکن سے نکلتا تھا۔

لوگ تماشے کی جان سمجھتے ہیں، ان کا عقیدہ انوکھا ہے۔ راجہ رانی وزیروں کی سازشیں، نقلی لڑائیاں بوسہ بازی یہی ان کے مقصد ہیں، میں نے سماجی کہانیاں لکھی ہیں جنھیں تعلیم یافتہ طبقہ بھی دیکھنا چاہتا ہے، لیکن ان کو فلم کرتے وقت شبہ ہوتا ہے کہ چلیں یا نہ چلیں، یہ سال تو پورا کرنا ہی ہے قرض دار ہو گیا تھا، قرض پٹ جائے گا، مگر اور کوئی فائدہ نہ ہو ناول گئودان کے آخری صفحات لکھنے کو باقی ہیں، ادھر طبیعت ہی نہیں جاتی، اپنے پرانے اڈے پر جا بیٹھوں، وہاں دولت نہیں ہے مگر سکون قلب ضرور ہے، یہاں تو معلوم ہوتا ہے زندگی برباد کر رہا ہوں۔"

13/جنوری 35ء کو مسٹر اوپندر ناتھ کو لکھتے ہیں:-

"بمبئی میں تو اب زندگی سے تنگ آ گیا ہوں، یہاں ڈائرکٹروں کی ذہنیت ہی انوکھی ہے۔ بازارِ حسن کی مٹی پلید کر دی.....مل البتہ کچھ اچھی ہے..........لیکن سچ پوچھو تو مجھے وہ اپنا کنج عافیت ہی زیادہ پسند ہے، جلد ہی بنارس چلا جاؤں گا۔"

مکرمی ضیاء الدین برنی صاحب کے نام انھوں نے بمبئی سے ایک خط بھیجا تھا جس میں لکھا ہے کہ "بمبئی میں مجھے ہم مذاق آدمی نہیں ملتا، اس لیے آپ سے ملنے کا مجھے کتنا شوق ہوسکتا ہے وہ آپ سمجھ سکتے ہیں۔"

پریم چند ایک ہی وقت میں مختلف قسم کے ادبی کام کے مشکلات پر 28/نومبر 29-1928ء کے خط میں گورکھپور سے لکھتے ہیں:-

"......بازارِ حسن عدیم الفرصتی کا شکار ہو رہا ہے۔ اسی اثناء میں "بانگ سحر" ہو گیا اور دو صفحے ہو بھی چکے اب کچھ دنوں سے چھوٹے قصے لکھنا بند کر کے علمی مضامین لکھنے کی کوشش کروں گا۔ دماغ ایک ساتھ دو مختلف پلاٹ نہیں سنبھال سکتا۔ ایک وقت میں ایک ہی کام ہوسکتا ہے، یا تو ناول لکھوں یا کہانیاں، ناول میں ایک ہی پلاٹ کافی ہے اور اس کا لکھنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا ہر ماہ دو تین کہانیوں کا......

پریم چند کی زندگی جن خرخشوں میں کٹی اس کا بہت کافی ذکر ہو چکا ہے۔ اپنی زندہ دلی کے باوجود آخر میں وہ بچوں کی کم سنی کے خیال سے متردد ہو جاتے تھے۔ 9/جنوری 24ء کے خط کے آخر میں اپنے بچوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

آپ لڑکیوں کے اعتبار سے پدریت کے جس درجے میں ہیں لڑکوں کے اعتبار سے اسی درجے

میں ہیں اس وقت مجھے ان خرخشوں سے نجات مل جانی چاہیے تھی تاکہ کسی گوشہ میں بہ اطمینان پڑا ہوا کچھ لکھا پڑھا کرتا۔ مگر یہاں ابھی بچے پال رہا ہوں، جو کام چالیس کی عمر میں ہونا چاہیے وہ اب پچپن سالے میں ہو رہا ہے۔ جب آدمی پلشر ہو جاتا ہے......

21 ستمبر 35ء کے خط سے بھی مایوسی کا اظہار ہوتا ہے:-

> پیسے کے اعتبار سے ہم دونوں گھاٹے میں رہے، آپ نے بھی خون پسینہ ایک کیا، میں نے شاید آپ سے زیادہ۔ آنسو پونچھنے کو کچھ نام ملا، مگر ہم دونوں نے ایسی علت پال لی کہ اس سے تادم آخر گلوخلاصی ہونے کی امید نہیں۔ زمانہ نے آپ کو پامال کیا، پریس نے مجھکو...... اگر بیچ میں بمبئی نہ چلا جاتا تو شاید اب تک پریس بند ہو گیا ہوتا۔ بہت اچھا ہوتا۔ لیکن انسان ہوس کا پتلا ہے۔ نقصان اور پریشانی اٹھا رہا ہوں، پھر بھی پریس چلائے جاتا ہوں۔"

15 جون 1935ء کا خط ہے:-

> "پریس کے جنجال سے کسی طرح رہائی نہیں ہوتی...... اب تک پندرہ ہزار کا نقصان ہو چکا ہے، مگر کیا کروں گلے میں جو ڈھول پڑ گئی ہے اسے بجائے جاتا ہوں۔"

واقعہ یہ ہے کہ پریم چند تصنیف و تالیف ہی کے کام کے تھے، وہ پریس کیا کوئی تجارتی کاروبار کامیابی کے ساتھ نہیں چلا سکتے تھے، انھیں اس قضیے میں پڑنا ہی نہ تھا۔ میں نے بھی پریس جاری کیا تھا لیکن دو ہی تین سال میں جی بھر گیا۔ اور جب گھر کا کوئی آدمی اس کام میں نہ لگ سکا تو آخر اسے بند ہی کرنا پڑا۔ پریم چند کی مصیبت یہ تھی کہ ادبی مشاغل کے ساتھ ساتھ تجارت بھی کرنا چاہتے تھے۔ ایک خط میں انھوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ:-

> "جس توجہ سے (پریس میں) کام کرنا چاہئے وہ نہ دے سکا۔ گھر پر لٹریری کام کرتا ہی ہوں۔ اس کام کو تفریح کے طور پر کرتا رہا۔ مگر تفریح خرچ کی چیز ہے۔ تجارت دل و جان دونوں چاہتی ہے۔"

ان کی دوسری دقت یہ تھی کہ دوستوں سے سلوک ہونا چاہتے تھے، اور جہاں تک ہو سکتا تھا لوگوں کی حاجت روائی بھی کرتے تھے۔ گو اس میں کبھی کبھی تکلیف ہو جاتی تھی جیسا کہ معمولی ذرائع رکھنے والے ہر دوست نواز اور ہمدرد انسان شخص کو بارہا تجربہ ہوا ہوگا۔ انھیں بھی خلاف توقع نقصانات پیش آجاتے تھے اور وہ بہ تقاضائے بشریت کبھی کبھی دل ہی دل میں پچھتانے لگتے تھے اور خود اپنی نکتہ چینی کرنے لگتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:-

''ایسے موقع بھی آئے ہیں جب مجھے وہ دوستوں کی خاطر اپنے اوپر انتہائی جبر کرنے پڑے ہیں لیکن میں نے اپنی اصلی حالت کو ان پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اور انھیں یہ بھرم رہا کہ میں کوئی متمول آدمی ہوں۔ فضول خرچی سے مجھے آشنائی نہیں لیکن متمول کا اظہار مجھے پنپنے نہیں دیتا۔''

دراصل یہ تمول کا اظہار نہ تھا بلکہ انسانی غیرت اور دوسروں کے ساتھ ہمدردی کے جذبہ کا تقاضا تھا کہ کوئی خاص سرمایہ نہ رکھنے کے باوجود اور اپنی آئندہ ضرورتوں کو نظر انداز کر کے بھی وہ ضرورت مند دوست آشناؤں کی کار براری کو تیار ہو جاتے تھے۔

ان کی عمر کا زیادہ تر حصہ اسی طرح کی کشمکش میں کٹا بقدر ہمت وسعت نہ رکھنے والوں کا یہی حال رہتا ہے۔ لیکن ایسے لوگ ان لوگوں سے کہیں زیادہ دل بشاش رہتے ہیں جو اپنے بہت ہی قریبی عزیزوں کے سوائے اور کسی کو دھیان ہی میں نہیں لاتے ہیں۔ اور یہ تو پرانی بات ہے۔

کریماں را بہ دست اندر درم نیست	خداوندان نعمت را کرم نیست

بہرحال اس مزاج کے آدمی کو دنیا سے کوئی شکایت نہیں ہوتی اور بخت نارسا کا رونا کبھی نہیں روتا ہے۔ پریم چند بھی شاکر وصابر تھے اور مصائب ومشکلات کے اخلاقی پہلو پر نظر رکھتے تھے۔ ایک دوست کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

''مصائب کا اخلاقی پہلو بھی ہوتا ہے۔ آزمائشیں ہی انسان کو انسان بناتی ہیں اور انھیں سے آدمی میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔

یہ فلسفانہ نقطۂ خیال کتنا تسکین بخش ہے اس میں شک ہی کیا ہے کہ پے در پے تجربات انسان کو مشکلات کا خوگر بنا کر طبیعت میں استحکام پیدا کر دیتے ہیں جس کے سامنے دولت کی چنداں حقیقت نہیں رہتی ہے۔ اور حالات پر قابو پانے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔

پریم چند نے کبھی کسی کی خوشامد روانہ سمجھی اور نہ کبھی کسی رئیس یا والی ملک کی مہمانداری وقدر دانی کے خواہش مند ہوئے۔ اگر کبھی کسی سے ملاقات کا اتفاق بھی ہوا تو اس کی تعریف کے پل بھی کبھی نہیں باندھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ:-

علم وذہانت، فہم وفراست، اور دیگر ذہنی اور دماغی اوصاف کو ہوس اور زر پرستی کا غلام نہیں بنا دینا چاہئے۔

وہ نہ مادہ پرستی کے قائل تھے اور نہ سرمایہ داری کے حامی۔ ہندو فلسفہ ان کی زندگی کا سہارا اور خدمت خلق ان کی زندگی کا مقصد تھا۔

وہ ہر چیز کو اسی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور اپنے روحانی مقاصد میں اس وجہ سے کامیاب رہے کہ انھیں آرام طلبی کی عادت نہ تھی، اور فضول تکلفات کو انھوں نے اپنی روزمرہ زندگی میں داخل نہیں ہونے دیا۔ اور نہ اپنے لیے کبھی کوئی خاص اہتمام کرنا پسند کیا۔ بیسیوں دفعہ ایسا ہوا ہے، کہ وہ اپنے لیے کوئی ضروری چیز خرید لائے مگر کسی عزیز نے اسے پسند کرلیا اور وہ دم بخود ہو گئے۔ لوگوں نے انھیں دھوکا بھی دیا، خود غرض احباب سے بھی انھیں سابقہ پڑا مگر وہ سب کو ہنسی خوشی نباہتے رہے۔ بہت دنوں کی بات ہے جب پریم چند کانپور میں اسکول ماسٹر تھے اور قلیل تنخواہ پاتے تھے۔ وہ اپنے لیے ایک نیا کوٹ سلوالائے اور ایک نیا جوتا خرید لائے۔ مگر دونوں چیزیں ان کے ایک نادار عزیز جوان دنوں ان کے ساتھ رہتے تھے بے پوچھے استعمال کرنے لگے۔ پریم چند نے اس کا کوئی خیال نہ کیا، اور خوشی خاطر سے اپنا پرانا کوٹ اور پرانا جوتا پہنے رہے۔ اسی قسم کا ایک واقعہ مسز پریم صاحبہ نے بھی لکھا ہے۔

جب کبھی بھی پہاڑ وغیرہ جانے کا ذکر ہوا تب بھی عزیزوں کا خیال سدّ راہ ہو جاتا تھا۔ 1934ء کے ایک خط کا اقتباس ہے کہ

> ''جب کبھی اس قسم کا ارادہ کرتا ہوں تو مجھے فوراً گھر والوں کا خیال آجاتا ہے کہ میں تو وہاں تفریح کروں اور یہ بیچارے یہاں سڑا کریں۔ بس اسی خیال سے رک جاتا ہوں، کنبے بھر کو لے جانا مشکل ہے۔ میرے لیے خس کا ایک پردہ اور دو تین پیسے کا روزانہ برف موسم کی تکلیف کے لیے کافی ہے۔

پریم چند کھانے پینے میں پرہیز کے عادی نہ تھے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ ضعف معدہ کی شکایت کا وہ کامیابی سے مقابلہ نہ کر سکے۔ وہ غذا کے عادی نہ تھے، مگر ان سے دیر تک غذا کے متعلق کوئی پابندی نہ ہو سکتی تھی۔ ادنیٰ سی تحریک پر وہ بدپرہیزی کر بیٹھے تھے۔

مزاج بھی کبھی کبھی متلون ہو جاتا تھا اور بعض اوقات ذرا سی بات مرضی کے خلاف ہونے پر ملول خاطر ہو جاتے تھے، لیکن اگر دوسرے شخص نے اپنی غلطی مان لی یا ان کے رفع ملال کی ذرا سی بھی کوشش کی تو پھر فوراً پانی ہو جاتے تھے۔ ہاں جب انھیں یہ خیال ہوتا کہ دوسرے کو ان کی کوئی پرواہ نہیں ہے تو ان کے دل پر ضرور ٹھیس لگتی تھی۔ تاہم یہ کہنا سچ ہوتا کہ پریم چند دنیا میں آرام کرنے نہیں بلکہ دوسروں کو آرام پہنچانے اور کام لینے نہیں بلکہ کام کرنے آئے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی اردو، ہندی ادب کو فروغ دینے میں صرف کر دی، اور ان دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ وہ ہندوستانی زبان کی ترقی کی کوشش میں اس لیے منہمک تھے کہ وہ اسے ہندوستان اور ہندوستانیوں کی خدمت کا ایک

ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ سچے محب وطن اور کامل ادیب تھے۔ اور فن کا کامل وہی شخص ہو سکتا ہے جس کا دل وسیع نگاہ بلند، طبیعت بے ریا اور نیت صالح ہو۔ جو زر پرست نہ ہو، بلکہ انسان دوست ہو، جاہ و حشم کا پرستار نہ ہو بلکہ ادنیٰ و اعلےٰ ہر ایک کا ہمدرد ہو۔ اور ہر حال میں بے لوث رہ کر زندگی کے حقائق سے واقفیت پیدا کرتا رہے۔

مضمون طولانی ہو گیا، مگر میری داستان ابھی ختم نہیں ہوئی، بقول شاعر:-

لطیف بود حکایت دراز تر گفتم

بہر نوع ناظرین رسالہ کے قیمتی وقت کا خیال ضروری ہے۔ اس لیے اس طوالت کی معذرت کر کے یہ مضمون یہیں پر ختم کیا جاتا ہے، ورنہ میرے لیے "ذکر حبیب کم نہیں وصل حبیب سے۔"

دیانرائن نگم

"زمانہ" اور پریم

1910ء کے پہلے تک پریم چند صاحب کے مضامین "نواب رائے" کے نام سے شائع ہوئے۔ اس کے بعد پریم چند کا نام شروع ہوا، بعض نوٹ بلا نام بھی درج ہوئے مگر اس وقت ان کا چھانٹنا مشکل ہے۔ پریم چند صاحب نے بعض اہم تنقیدیں بھی زمانہ کے لیے لکھیں جو کبھی ان کے نام سے اور کبھی بلا نام شائع ہوئیں انھوں نے زمانہ کے لیے بہت سے ادبی مضامین، سوانح عمریاں، افسانے اور ترجے مستقل مضامین کی حیثیت سے لکھے۔ سرسری طور پر حساب لگانے سے معلوم ہوا کہ انھوں نے 96 مستقل مضامین خاص طور پر زمانہ کے لیے لکھے، جس میں چھ تنقیدیں، پندرہ سوانح عمریاں، پندرہ متفرق مضامین اور انسٹھ مختصر افسانے ہیں۔ مرحوم نے ڈنمارک کے نامور مصنف میٹر لنک کے ایک مشہور و معروف تمثیلی ڈرامے کا اردو ترجمہ "شب تار" کے نام سے 1919ء میں زمانہ کے لیے کیا، جو رسالہ کے تین نمبروں میں شائع ہوا۔ واقعات کربلا کے متعلق ان کا اورنجیل ڈرامہ جولائی 1926ء سے لے کر اپریل 1928ء تک زمانہ کے سترہ مختلف نمبروں میں ہدیۂ ناظرین ہوا۔

تنقیدی مضامین کی فہرست یہ ہے:۔

1. تنقید

(1) ناول کرشن کنور مصنفہ حکیم برہم مرحوم	مندرجہ زمانہ فروری 1905ء
(2) آئین قیصری اور محاربات (شمس العلماء ذکاء اللہ)	مندرجہ زمانہ اپریل 1908ء
(3) سوانح عمری ملکۂ وکٹوریہ (شمس العلماء ذکاء اللہ)	مندرجہ زمانہ اگست 1905ء
(4) دکرم اروسی (ترجمہ مولوی عزیز مرزا صاحب)	مندرجہ زمانہ فروری 1908ء
(5) پیک ابر (ترجمہ میگھدوت)	مندرجہ زمانہ جولائی 1917ء
(6) رسالہ اردو	مندرجہ زمانہ اگست 1921ء

2. سوانح عمریاں

(1) راجہ مان سنگھ	مندرجہ زمانہ اکتوبر 1905ء
(2) آنریبل گوپال کرشن گوکھلے	مندرجہ زمانہ نومبر۔دسمبر 1905ء
(3) گیری بالڈی	مندرجہ زمانہ جولائی 1907ء
(4) ٹامس کینس برو	مندرجہ زمانہ ستمبر 1907ء
(5) سوامی وویکانند	مندرجہ زمانہ مئی 1908ء
(6) مصور رینالڈس	مندرجہ زمانہ جنوری 1909ء
(7) رنجیت سنگھ	مندرجہ زمانہ مئی 1911ء
(8) ڈاکٹر بھنڈارکر	مندرجہ زمانہ جون 1913ء
(9) راناجنگ بہادر	مندرجہ زمانہ جولائی 1923ء
(10) بھارتیندو بابو ہریشچندر	مندرجہ زمانہ جنوری 1924ء
(11) کالی داس کی شاعری	مندرجہ زمانہ 1914ء
(12) بہاری	مندرجہ زمانہ 1917ء
(13) کیشو	مندرجہ زمانہ جولائی 1917ء
(14) منشی گورکھ پرشاد عبرت	مندرجہ زمانہ نومبر 1919ء
(15) متن دوبے	مندرجہ زمانہ دسمبر 1921ء

3. ادبی مضامین

(1) فن تصویر	مندرجہ زمانہ مارچ 1907ء
(2) گالیاں	مندرجہ زمانہ دسمبر 1907ء
(3) ہندو تہذیب اور رفاہ عام	مندرجہ زمانہ مارچ 1912ء
(4) قیس	مندرجہ زمانہ 1913ء
(5) ہلسی	مندرجہ زمانہ فروری 1916ء
(6) دور جدید و قدیم	مندرجہ زمانہ فروری 1919ء

(7) کاؤنٹ ٹالسٹائی اور فن لطیف　　مندرجہ زمانہ مارچ 1917ء

(8) اردو، ہندی، ہندستانی　　مندرجہ زمانہ اپریل 1935ء

(9) ادب کی غرض و غایت　　مندرجہ زمانہ 1937ء

4. متفرق مضامین کی تفصیل یہ ہے:

(1) دیسی اشیاء کو کیوں کر فروغ ہو سکتا ہے؟　　مندرجہ زمانہ جون 1905ء

(2) صوبۂ متحدہ میں ابتدائی تعلیم　　مندرجہ زمانہ مئی۔ جون 1908ء

(3) ترکی میں آئینی سلطنت　　مندرجہ زمانہ اگست 1908ء

(4) ہندستانی ریلوں کی تاریخ　　مندرجہ زمانہ جنوری 1915ء

(5) موجودہ تحریک کے راستہ میں رکاوٹیں　　مندرجہ زمانہ اکتوبر۔ نومبر 1921ء

5. مختصر افسانے جو خاص طور پر زمانہ کے لیے لکھے گئے یہ ہیں:

(1) روٹھی رانی　　مندرجہ زمانہ اپریل۔ مئی و اگست 1907ء

(2) عشق دنیا اور حب وطن　　مندرجہ زمانہ اپریل 1908ء

(3) سیر درویش　　مندرجہ زمانہ اپریل۔ مئی۔ جون 1910ء

(4) رانی سارندھا　　مندرجہ زمانہ اگست و ستمبر 1910ء

(5) بڑے گھر کی بیٹی　　مندرجہ زمانہ دسمبر 1910ء

(6) وکرمادتیہ کا تیغہ　　مندرجہ زمانہ جنوری 1911ء

(7) کرشمۂ انتقام　　مندرجہ زمانہ فروری 1911ء

(8) دونوں طرف سے　　مندرجہ زمانہ مارچ 1911ء

(9) راجہ ہردول　　مندرجہ زمانہ اپریل 1911ء

(10) منزل مقصود　　مندرجہ زمانہ اگست و ستمبر 1911ء

(11) آہ بیکس　　مندرجہ زمانہ اکتوبر 1911ء

(12) آلہا　　مندرجہ زمانہ جنوری 1912ء

(13) ماتا　　مندرجہ زمانہ فروری 1912ء

(14) راج ہٹ	مندرجہ زمانہ ستمبر 1912ء
(15) عالم بے عمل	مندرجہ زمانہ مئی و جون 1912ء
(16) تریا چرتر	مندرجہ زمانہ جنوری 1913ء
(17) موت اور زندگی	مندرجہ زمانہ مارچ 1913ء
(18) اماوس کی رات	مندرجہ زمانہ اپریل 1913ء
(19) نگاہِ ناز	مندرجہ زمانہ مئی 1913ء
(20) ملاپ	مندرجہ زمانہ جون 1913ء
(21) اندھیر	مندرجہ زمانہ جولائی 1913ء
(22) صرف ایک آواز	مندرجہ زمانہ اگست و ستمبر 1913ء
(23) بانکا زمیندار	مندرجہ زمانہ اکتوبر 1913ء
(24) اناتھ لڑکی	مندرجہ زمانہ جون 1914ء
(25) خون سفید	مندرجہ زمانہ جولائی 1914ء
(26) شکاری اور راج کمار	مندرجہ زمانہ اگست 1914ء
(27) شامتِ اعمال	مندرجہ زمانہ ستمبر و اکتوبر 1914ء
(28) پچھتاوا	مندرجہ زمانہ نومبر 1914ء
(29) مرہم	مندرجہ زمانہ جنوری و فروری 1915ء
(30) غیرت کی کٹار	مندرجہ زمانہ جولائی 1915ء
(31) بیٹی کا دھن	مندرجہ زمانہ نومبر 1915ء
(32) دو بھائی	مندرجہ زمانہ جنوری 1916ء
(33) پنچایت	مندرجہ زمانہ مئی و جون 1916ء
(34) سرِ پُرغرور	مندرجہ زمانہ اگست 1916ء
(35) جگنو کی چمک	مندرجہ زمانہ اکتوبر 1916ء
(36) دھوکا	مندرجہ زمانہ نومبر 1916ء
(37) راجپوت کی بیٹی	مندرجہ زمانہ جنوری 1917ء
(38) شعلۂ حسن	مندرجہ زمانہ مارچ 1917ء

(39) مشعلِ ہدایت	مندرجہ زمانہ مئی 1917ء
(40) فتح	مندرجہ زمانہ اپریل 1918ء
(41) راہِ خدمت	مندرجہ زمانہ جون 1918ء
(42) خنجرِ وفا	مندرجہ زمانہ نومبر 1918ء
(43) قربانی	مندرجہ زمانہ جنوری 1919ء
(44) آتمارام	مندرجہ زمانہ جنوری 1920ء
(45) مہرِ پدر	مندرجہ زمانہ جولائی 1920ء
(46) نوک جھونک	مندرجہ زمانہ دسمبر 1920ء
(47) روحِ حیات	مندرجہ زمانہ جنوری 1921ء
(48) معمہ	مندرجہ زمانہ مارچ 1921ء
(49) دستِ غیب	مندرجہ زمانہ اپریل 1921ء
(50) لال فیتہ	مندرجہ زمانہ جولائی 1921ء
(51) موٹھ	مندرجہ زمانہ جنوری 1922ء
(52) بزمِ پریشاں	مندرجہ زمانہ جون 1922ء
(53) حسنِ ظن	مندرجہ زمانہ اکتوبر 1922ء
(54) شطرنج	مندرجہ زمانہ دسمبر 1924ء
(55) مایۂ تفریح	مندرجہ زمانہ فروری 1925ء
(56) منتر	مندرجہ زمانہ فروری 1928ء
(57) عفو	مندرجہ زمانہ مئی 1929ء
(58) علیحدگی	مندرجہ زمانہ فروری 1930ء

6. ڈرامے :

(1) شبِ تار	مندرجہ زمانہ اکتوبر، نومبر 1919ء
(2) کربلا	مندرجہ زمانہ جولائی 1926ء لغایت اپریل 1928ء 17 مختلف نمبروں میں

ایڈیٹری کے فرائض پریم چند کی نظر میں

اخبار کا ایڈیٹر ہمیشہ کے قاعدوں کے مطابق قوم کا خادم ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے قومی وسیع النظری سے اور جو کچھ سوچتا ہے اس پر بھی قومیت کی مہر لگی ہوتی ہے۔ ہمیشہ قومی خیالات کی وسیع فضا میں گھومتے رہنے سے شخصی اہمیت کا دائرہ اس کی نگاہوں میں بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ وہ شخصیت کو ہیچ، حقیر اور نا قابلِ توجہ خیال کرنے لگتا ہے۔ شخصیت کو قومیت پر قربان کرنا اس کی روش کا مقدم ترین اقتضا ہے۔ حتیٰ کہ اکثر وہ اپنی غرض کو قوم پر نچھاور کر دیتا ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد عظیم، اور اس کا معیار پاکیزہ ہوتا ہے۔ وہ ان زبردست شخصیتوں کا مقلد ہوتا ہے، جنھوں نے قوموں کو بنایا اور سنوارا ہے۔ جن کا نام اَمر ہو گیا ہے۔ جو مظلوم قوموں کے لیے نجات دہندہ ثابت ہو چکی ہیں۔ وہ حتی الامکان کوئی کام ایسا نہیں کرتا۔ جس سے اس کے پیش رووں کی چمکتی ہوئی شہرت میں داغ لگ جانے کا اندیشہ ہو۔

(فردوسِ خیال)

پریم چند

یادگار پریم چند

حصہ دوم

پریم چند کی افسانہ نگاری

کچھ عرصہ ہوا ہمارے دوست ایڈیٹر صاحب "نیرنگ خیال" نے ملک کے مشہور افسانہ نگاروں سے یہ سوال کیا تھا کہ آپ افسانہ کیوں کر لکھتے ہیں؟ منشی پریم چند نے اس استفسار کا جو جواب دیا تھا ذیل میں ہدیۂ ناظرین ہے۔ ایڈیٹر

میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہدہ یا تجربہ پر مبنی ہوتے ہیں اس میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں، مگر محض واقعہ کے اظہار کے لیے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اس میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں ملتی میرا قلم ہی نہیں اٹھتا زمین تیار ہونے پر میں کریکٹروں کی تخلیق کرتا ہوں، بعض اوقات تاریخ کے مطالعہ سے بھی پلاٹ مل جاتے ہیں، لیکن کوئی واقعہ افسانہ نہیں ہوتا تاوقتیکہ وہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار نہ کرے۔

میں جب تک کوئی افسانہ اول سے آخر تک ذہن میں نہ جمالوں لکھنے نہیں بیٹھتا۔ کیرکٹروں کا اختراع اس اعتبار سے کرتا ہوں، کہ اس افسانے کے حسب حال ہوں۔ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ افسانے کی بنیاد کسی پرلطف واقعہ پر رکھوں۔ اگر افسانے میں نفسیاتی کلائمیکس موجود ہوں تو خواہ وہ کسی واقعہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں اس کی پرواہ نہیں کرتا، ابھی میں نے ہندی میں ایک افسانہ لکھا ہے جس کا نام ہے "دل کی رانی" میں نے تاریخ اسلام میں تیمور کی زندگی کا ایک واقعہ پڑھا تھا جس میں حمیدہ بیگم سے اس کی شادی کا ذکر ہے، مجھے فوراً اس تاریخی واقعہ کے ڈرامائی پہلو کا خیال آیا تاریخ میں کلائمیکس کیسے پیدا ہو۔ اس کی فکر ہوئی۔ حمیدہ بیگم نے بچپن میں اپنے باپ سے فنِ حرب کی تعلیم پائی تھی اور میدان جنگ میں کچھ تجربہ بھی حاصل کیا تھا تیمور نے ہزار

ترکوں کو قتل کر دیا تھا۔ ایسے دشمن قوم سے ایک ترک عورت کس طرح مانوس ہوئی۔ یہ عقدہ حل ہونے سے کلائمکس نکل آتا تھا۔ تیمور وجیہہ نہ تھا۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ اس میں ایسے اخلاقی اور جذباتی محاسن پیدا کیے جائیں جو ایک عالی نفس خاتون کو اس کی طرف مائل کر سکیں، اس طرح وہ قصہ تیار ہو گیا۔

کبھی کبھی سنے سنائے واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر افسانہ کی بنیاد آسانی سے رکھی جا سکتی ہے، لیکن کوئی واقعہ محض لچھے دار اور چست عبارت میں لکھنے اور انشا پردازانہ کمالات کی بنا پر افسانہ نہیں ہوتا۔ میں اس میں کلائمکس لازمی چیز سمجھتا ہوں۔ اور وہ بھی نفسیاتی۔ یہ بھی ضروری ہے کہ افسانے کے مدارج اس طرح قائم کیے جائیں کہ کلائمکس قریب تر آتا جائے۔ جب کوئی ایسا موقع آجاتا ہے، جہاں ذرا طبیعت پر زور ڈال کر ادبی یا شاعرانہ کیفیت پیدا کی جا سکتی ہے تو میں اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہی کیفیت افسانہ کی روح ہے۔

میں سست رفتار بھی ہوں، مہینے بھر میں شاید میں نے کبھی دو افسانوں سے زائد نہیں لکھے، بعض اوقات تو مہینوں کوئی افسانہ نہیں لکھتا۔ واقعہ اور کیرکٹر تو سب مل جاتے ہیں لیکن نفسیاتی بنیاد بمشکل ملتی ہے۔ یہ مسئلہ حل ہو جانے پر افسانہ لکھنے میں دیر نہیں لگتی۔ مگر ان چند سطور سے افسانہ نویسی کے حقائق نہیں بیان کر سکتا، یہ ایک ذہنی امر ہے، سیکھنے سے بھی لوگ افسانہ نویس بن جاتے ہیں، لیکن شاعری کی طرح اس کے لیے بھی اور ادب کے ہر شعبہ کے لیے کچھ فطری مناسبت ضروری ہے۔ فطرت آپ سے پلاٹ بناتی ہے۔ ڈرامائی کیفیت پیدا کرتی ہے، تاثیر لاتی ہے، ادبی خوبیاں جمع کرتی ہے، نادانستہ طور پر آپ ہی آپ سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ ہاں قصہ ختم ہو جانے کے بعد میں خود اسے پڑھتا ہوں۔ اگر اس میں مجھے کچھ ندرت، کچھ جدت، کچھ حقیقت کی تازگی، کچھ حرکت پیدا کرنے کی قوت کا احساس پیدا ہوتا ہے، تو میں اسے کامیاب افسانہ سمجھتا ہوں، ورنہ سمجھتا ہوں فیل ہو گیا۔ حالانکہ فیل اور پاس دونوں افسانے شائع ہو جاتے ہیں۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس افسانے کو میں نے فیل سمجھا تھا۔ اسے احباب نے بہت زیادہ پسند کیا۔ اس لیے اپنے معیار پر زیادہ اعتبار نہیں کرتا۔"

پریم چند

شاعری

شاعری سچے جذبات کی تصویر ہے اور سچے جذبات خواہ درد کے ہوں یا مسرت کے اسی وقت دل میں پیدا ہوتے ہیں، جب ہم درد یا مسرت کا مزہ چکھتے ہیں اور جذبات کے پیدا ہونے کے بعد ان کا زبانِ قلم تک آنا تو ایک آسان بات ہے۔ (جلوۂ ایثار)

پریم چند

پریم چند افسانہ نگار کی حیثیت سے

از مولانا عبدالماجد دریا آبادی بی۔اے

الف لیلہ اور داستان امیر حمزہ کے دور اقبال کا آفتاب جب غروب ہونے کو آیا، اور بوستان خیال اور طلسم ہوش ربا کے دفتر، جب زمانے کے ہاتھوں ''داخل دفتر'' ہونے لگے، تو ''صاحب'' کے قدموں کی برکت سے، ایک نئی دنیا، دلوں اور دماغوں کی، خیالات اور جذبات کی، سرزمین ہند پر آباد ہونے لگی، اور اس دیس کے لوگ ایک نئی چیز اور نئے نام ''ناول'' سے آشنا ہونے لگے۔ ''طلسمات'' کی جگہ اب ''سین'' اور ''سینری''، ''کوہ قاف'' کی جگہ شہر کی گلیاں اور بالا خانے، ''شہباز لکر'' کی جگہ ''پلاٹ''، دیووں اور شہزادوں'' کی جگہ ''ہیرو'' اور ''پریوں اور شہزادیوں کی جگہ ہیروین''!

شاگرد نے استاد کے منہ سے نکلے ہوئے انچھر گرہ میں باندھ لیے، اور خود بھی وہی بولتا اور وہی سوچتا، وہی لکھتا اور وہی پڑھنا شروع کر دیا، جس کے سبق اسکول اور کالج میں پڑھے تھے۔ اردو میں ناول چھپنے لگے اور بکنے لگے، لکھے جانے اور پڑھے جانے لگے۔ اور ناول بھی ہر ہر رنگ کے، ہر ہر ڈھنگ کے، کوئی تاریخی اور کوئی محض خیالی، کوئی معاشرتی اور کوئی اصلاحی۔ جیسا اخبار اسٹریٹ کی طرف قدم اٹھایئے، تو ''جاسوسی'' بھی اور ''ادب لطیف'' کے ضلع میں آجایئے تو ''قاسوی'' بھی! شرر و سرشار، اپنے اپنے فن میں استاد، ناول نویسوں کے لشکر کے علمبردار۔ پیچھے پیچھے چلنے والوں کی تعداد بے شمار!

بات میں بات نکلتی ہے، اور شاخ سے شاخ۔ بڑے ناول تو کتابی صورت کے لیے مخصوص رہے، ان کے ولی عہد، ''مختصر افسانے'' پیدا ہوئے، اور وہ رسالوں اور ماہناموں میں نکلنے لگے۔ بازار میں ان کی مانگ بھی خوب رہی۔ اور ناول اور مختصر افسانے، علم و ادب کی شاخ تو کسی ایک ہی آدھ کے لیے، باقی ایک پُر منفعت تجارت اور کامیاب کاروبار بہتوں کے لیے بن گئے، لیکن ان سب میں ہوتا کیا تھا؟ ناول ہو یا شارٹ اسٹوری، عام ذہنوں کے سامنے ان کا مفہوم تھا کیا؟ وہی حسن و عشق کی پرانی

داستان، وہی لیلیٰ و مجنون، شیرین و فرہاد کی ہزار ہا مرتبہ کی دہرائی ہو کہانی، جو لاکھ پرانی ہونے پر بھی اب تک پرانی نہیں ہوئی ہے!

یہ وہ مضمون ہے کہ ہوگا نہ پرانا ہرگز!

بس یہی کہ فلاں کی آنکھ فلاں سے لڑگئی، فلاں، فلاں کے ساتھ نکل گئی۔ اس کی عصمت یوں لٹی، اس کی آبرو یوں بچی، کسی لب پہ آہ سوزاں، کسی کے جگر میں زخم پیکاں۔ یہ اس پر مفتون، اور وہ اس کے لیے مجنوں۔ ایک اپنی آرزوؤں میں کامیاب ہوگیا، دوسرا ناشاد، نامراد دنیا سے کوچ کرگیا...... گویا ہر داستان حیات داستان نل و دمن اور ہر افسانۂ زندگی، افسانہ شیریں و کوہکن! ناول کی دلکشی کا راز عشق و عاشقی کی گھاتوں میں اور ناول نویس کے قلم کا اعجاز جوانی کی راتوں میں! یہاں زندگی مترادف تھی، صرف ہجر و وصال کے۔ صرف رُخ و خال کے۔ گویا انسانی زندگی اپنی ساری رنگارنگی اور بوقلمونی کے باوجود کیا تھی؟ غزل کا ایک مضمون اور دنیائے عمل اپنی ساری وسعت و پنہائی کے باوجود کیا تھی؟ مشاعرہ کی ایک محفل!

یہ رنگ تھے اور یہ ڈھنگ کہ ایک گوشہ سے چپکے سے پریم چند نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے، فضا کی کایا پلٹ کر گئے۔ دبے پاؤں خاموشی سے آتے وقت نہ شور پیدا ہوا نہ ہنگامہ۔ لیکن جب گئے تو یاران بزم کا انداز ہی کچھ سے کچھ اور! جب تک رہے نہ کسی سے جھگڑے، نہ کسی سے الجھے، شکل آپ دیکھتے تو سادہ، بات چیت کرتے تو سادہ تر پاتے۔ بس یہی معلوم ہوتا کہ شہر کے نہیں کسی قصبہ کے معمولی پڑھے لکھے سے آدمی ہیں، اور گئے، تو ایک جدید اسلوب کی بنیاد رکھ کر، صاحب طرز ہوکر یا ''صاحب'' کے محاورہ میں اپنا ایک مستقل ''اسکول'' چھوڑ کر!...... یہ نہیں کہ پریم چند سے پہلے کسی کو عام ڈھرے سے ہٹنے کا خیال ہی نہ آیا ہو۔ مستثنیات کس کلیہ میں نہیں ہوتے؟ اردو میں بھی بعض باکمال یقیناً ایسے گزر چکے تھے، جن کا قلم ان بے اعتدالیوں اور عریانیوں سے بالکل بچ بچ کر چلا، اور جو زندگی کو زندگی سمجھے شاعری کا مترادف نہیں سمجھے، لیکن ان کی کوششیں اور کاوشیں بس انھیں کی ذات تک محدود رہیں۔ دریا میں پتھر آ کر گرا، چکر بنا...... تلاطم ہوا...... لیکن آناً فاناً سب غائب، اور تھوڑی دیر میں سطح برابر! دھارے کا رخ پھیرنا، وہ جتنا بھی سہی، پریم چند ہی کے نصیب میں آیا۔

پریم چند خود تو اپنی اردو کتابوں میں بازار حسن کو نمبر اول پر رکھتے تھے، لیکن اس کم سواد، بے استعداد کا خیال ہے، کہ سب سے بڑھ چڑھ کر، ان کی ضخیم کتاب دو جلدوں، اور ایک ہزار صفحہ والی چوگان ہستی ہے۔ کہیں سے بھی کھول لیجیے، یکساں دلچسپ۔ شروع کر دینا شرط ہے ختم کیے بغیر جی ماننے کا نہیں۔ آورد اور تصنع، کہنا چاہیے کہ ان کا قلم جانتا ہی نہیں۔ جو صفحہ بھی الٹ کر دیکھیے، سادگی، بیساختگی، آمد کے

لحاظ سے خطہ گلزار۔ جس حصہ کا بھی انتخاب کیجئے دلکشی، دلآویزی، اور جاذبیت کے اعتبار سے نمونہ بہار۔ جان سیوک نامی بنارس میں ایک دیسی ''صاحب'' عیسائی مذہب شخص ہیں، پکے دنیادار، ان کی نوجوان لڑکی صوفیہ کا رجحان ہندو مذہب کی جانب ہوجاتا ہے، ایک موقعہ پر ماں بیٹی سے دوبدو گفتگو ہو پڑتی ہے اور درمیان میں لڑکی کے بوڑھے دادا، اور جہاں تک ظاہری احکام کا تعلق ہے بڑے دیندار مسیحی ایشور سیوک آجاتے ہیں، سب کے قلمی چہرے اس آئینہ میں ملاحظہ ہوں:۔

''صوفیہ: میں مذہبی معاملات میں اپنے ضمیر کے سوا اور کسی کے احکامات نہیں مانتی۔

مسز سویک۔ میں تجھ کو اپنی اولاد نہیں سمجھتی اور تیری صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔

یہ کہہ کر وہ صوفیہ کے کمرہ میں گھس گئی اور اس کی میز پر سے بودھ مذہب اور ویدانت فلاسفی کی کئی کتابیں اٹھا کر باہر برآمدہ میں پھینک دیں، اسی جوش میں انھیں پیروں سے کچلا اور پھر جاکر ایشور سیوک سے بولیں۔ پاپا، آپ صوفی کو ناحق بلا رہے ہیں، وہ حضرت مسیح کی ہجو کر رہی ہے۔''

مسٹر ایشور سیوک ایسا چونکے گویا بدن پر آگ کی چنگاری گر پڑی ہو اور اپنی بے نور آنکھوں کو پھاڑ کر بولے۔ ''کیا کہا۔ صوفی حضرت مسیح کی ہجو کر رہی ہے؟ صوفی؟''

مسز سیوک۔ ہاں، ہاں! صوفی! کہتی ہے مجھے ان کے معجزوں، ان کے مواعظ اور احکامات پر اعتقاد نہیں ہے۔

ایشور سیوک (ٹھنڈی سانس کھینچ کر) یسوع مجھے اپنے دامن میں چھپا! اپنی گمراہ بھیڑوں کو راہِ راست پر لا! کہاں ہے صوفی! مجھے اس کے پاس لے چلو! میرے ہاتھ پکڑ کر اٹھاؤ۔ خدا میری بیٹی کے دل کو ایمان کے نور سے منور کر! میں اس کے پیروں پر گروں گا۔ اس سے منتیں کروں گا، اس کو عاجزی سے سمجھاؤں گا۔ مجھے اس کے پاس لے چلو!

مسز سیوک۔ میں سب کچھ کرکے ہار گئی۔ اس پر خدا کا قہر ہے۔ میں اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔

ایشور سیوک۔ بیٹی ایسی باتیں نہ کرو۔ وہ میرے گوشت کا گوشت، میرے خون کا خون۔ میری جان کی جان ہے، میں اسے کلیجہ سے لگاؤں گا یسوع! مجھے اپنے دامن میں چھپا!

جب مسز سیوک نے اب بھی سہارا نہ دیا تو ایشور سیوک لکڑی کے سہارے اُٹھے اور لاٹھی ٹیکتے ہوئے صوفیہ کے کمرہ کے دروازہ پر آکر بولے ''بیٹی صوفی! کہاں ہے؟ ادھر آ بیٹی؟ تجھے گلے سے لگاؤں۔ ہمارا یسوع خدا کا دلارا بیٹا تھا، غریبوں کا مددگار، کمزوروں کا محافظ، مفلسوں کا دوست، ڈوبتوں کا سہارا،

گنہگاروں کا شافع، دکھیوں کا بیڑا پار کرنے والا! بھئی ایسا کون سا نبی ہے، جس کا دامن اتنا وسیع ہو۔ جس کی گود میں دنیا کے سارے گناہوں، ساری برائیوں کے لیے جگہ ہو؟ وہی ایک ایسا ہی ہے جس نے بدکاروں کو، کافروں کو، گنہگاروں کو نجات کا مژدہ سنایا۔ نہیں تو ہم جیسے ناپاک لوگوں کے لیے نجات کہاں تھی؟ ہم کو بچا لینے والا کون تھا؟''

یہ کہتے کہتے انھوں نے صوفیہ کو گلے سے لگا لیا۔ (چوگان ہستی جلد اول ص 46-48)

یہ ساری گفتگو اول سے آخر تک کتنی سچی اور کیسی مطابق واقعہ ہے۔ صرف آخری ٹکڑے میں ذری سی لغزش ہوگئی ہے۔ جہاں حضرت مسیح کو ایک مسیحی کی زبان سے خدا کا نبی کہا ہے، یہ عقیدہ اسلامی ہے، مسیحی نہیں۔ مسیحیوں کے نزدیک تو ''خدا کے اکلوتے بیٹے'' کو نبی کہنا اس کی توہین کرنا ہے۔ لیکن ایسی خفیف لغزشیں افسانہ میں اور وہ بھی محض ضمناً قابل اعتنا نہیں۔

انھیں مس صوفیہ پر، ضلع کے انگریز نوجوان کلکٹر مسٹر کلارک کا دل آجاتا ہے اور محبت شروع ہوجاتی ہے، صاحب بہادر، مع صوفیہ کے ایک بڑی ریاست جسونت نگر میں مہمان ہیں۔ جیل میں مشہور محب وطن اور رئیس زادہ ونے سنگھ، صوفیہ کا دل سے چاہنے والا قید ہے، صوفیہ بھی حقیقتاً دل سے اسی کی طرف مائل ہے، کلکٹر کے ساتھ محض مصلحتاً نباہ کررہی ہے۔ دیوان ریاست سردار نیلکنٹھ مہمان داری کی خدمات کے لیے وقف ہیں، صوفیہ جیل میں ونے سنگھ کو دیکھ کر اپنا اشتیاق پورا کرنا چاہتی ہے، اور اس لیے جسونت نگر میں ابھی اور ٹھہرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد اصل گفتگو اب خود سنئے۔

''شہر کا گشت کرکے صوفیہ، مسٹر کلارک، سردار نیلکنٹھ اور دو ایک اعلیٰ ملازمین سرکاری تو شاہی محل کل میں آکر رونق افروز ہوئے۔ بقیہ لوگ رخصت ہوگئے۔ میز پر چائے لائی گئی۔ مسٹر کلارک نے بوتل سے پیالہ میں شراب ڈالی تو سردار صاحب جنھیں شراب کی بو سے نفرت تھی۔ کھسک کر صوفیہ کے پاس جابیٹھے اور بولے...... جسونت نگر آپ کو کیسا پسند آیا؟

صوفیہ: نہایت پرفضا مقام پر ہے۔ پہاڑیوں کا منظر نہایت دلفریب ہے۔ شاید کشمیر کے سوا ایسا قدرتی نظارہ اور کہیں نہ ہوگا۔ شہر کی صفائی سے جی خوش ہوگیا۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ کچھ دنوں یہیں رہوں،

نیلکنٹھ ڈر گئے۔ ایک دو روز تک تو پولیس اور فوج کی طاقت سے شہر کو پرامن رکھا جاسکتا ہے مگر مہینے دو مہینے تک کسی طرح بھی نہیں۔ بالکل ناممکن ہے۔ کہیں یہاں ٹھہر گئے تو شہر کی واقعی حالت ضرور ہی روشن ہوجائے گی۔ نہ جانے اس کا کیا انجام ہو۔ بولے،'' یہاں کی ظاہری دلفریبی کے دھوکے میں نہ آیئے

آب وہوا بہت خراب ہے۔ آگے جا کر آپ کو اس سے زیادہ بہتر مقامات دیکھنے کو ملیں گے۔"

صوفیہ — کچھ ہی ہو، میں یہاں دو ہفتے ضرور ہی رہوں گی۔ کیوں ولیم۔ تمھیں یہاں سے جانے کی جلدی تو نہیں ہے؟

کلارک۔ تم یہاں رہو تو میں دفن ہو جانے کو تیار ہوں۔

صوفیہ: لیجیے سردار صاحب ولیم کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔

صوفیا کو سردار صاحب کے دق کرنے میں مزہ آرہا ہے۔

نیلکنٹھ۔ پھر بھی میں آپ سے یہی عرض کروں گا کہ جسونت نگر بہت اچھی جگہ نہیں ہے۔ آب وہوا کی خرابی کے علاوہ یہاں کی رعایا میں بدامنی کی علامات پیدا ہو گئی ہیں۔

صوفیہ جب تو ہمارا یہاں رہنا اور بھی ضروری ہے۔ میں نے کسی ریاست میں یہ شکایت نہیں سنی۔ گورنمنٹ نے ریاستوں کو اندرونی انتظامات میں خود مختار بنا رکھا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے، کہ ریاستوں میں بغاوت کے جراثیم کو نشو ونما پانے کا موقع دیا جائے۔ اس کی ذمہ داری ریاست کے حکام پر ہے اور گورنمنٹ کو اختیار ہے کہ وہ اس غفلت کے لیے ان سے اطمینان بخش جواب طلب کرے۔

سردار صاحب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ صوفیہ سے انھوں نے یہ بات بے خوف ہو کر کہہ دی تھی۔ اس کی منکسر مزاجی سے انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ میری نذر و نیاز نے اپنا کام کر دکھایا ہے۔ وہ کچھ بے تکلف سے ہو گئے تھے۔ یہ ڈانٹ پڑی تو آنکھیں چوندھیا گئیں۔ التجا کے لہجہ میں بولے۔"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر چہ ریاست پر موجودہ حالات کی ذمہ داری ہے تاہم ہم لوگوں نے حتی الامکان حالات کو درست رکھنے کی کوشش کی اور اب بھی کر رہے ہیں۔ یہ بدامنی کا بیج اس مقام سے آیا جہاں سے اس کے آنے کا کوئی خیال نہ تھا۔ یا یوں کہیے کہ زہر کے قطرے سنہری برتنوں میں لائے گئے۔ بنارس کے رئیس کنور بھرت سنگھ کے والنٹیر وں نے کچھ ایسی ہوشیاری سے کام کیا کہ ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔ ڈاکوؤں سے دولت کی حفاظت کی جا سکتی ہے مگر سادھوؤں سے نہیں۔ رضا کاروں نے خدمت کی آڑ میں یہاں کی بیوقوف رعایا پر ایسا منتر پھونکا کہ اس کے اتارنے میں ریاست کو بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ خصوصاً کنور صاحب کا لڑکا تو نہایت شریر طبیعت کا آدمی ہے.................................

.........ہم لوگوں کی نیند حرام ہو گئی ہر لمحہ بغاوت کی آگ بھڑک اٹھنے کا اندیشہ تھا۔ یہاں تک کہ ہمیں صدر سے فوجی کمک روانہ کرنی پڑی۔ ونے سنگھ تو کسی طرح گرفتار ہو گیا مگر اس کے دیگر رفقاء

ابھی تک علاقہ میں چھپے ہوئے رعایا کو اکسا رہے ہیں۔ کئی بار یہاں سرکاری خزانہ لٹ چکا ہے۔ کئی بار ونے کو جیل سے نکال لے جانے کی ناکام کوشش کی جا چکی ہے اور ملازمین کو ہمیشہ اپنی جانوں کا خوف بنا رہتا ہے۔ مجھے مجبور ہو کر آپ سے یہ حال بیان کرنا پڑا، میں آپ کو یہاں ٹھہرنے کی صلاح ہرگز نہ دوں گا۔ اب آپ خود سمجھ سکتی ہیں کہ ہم لوگوں نے جو کچھ کیا اس کے سوا اور کیا کر سکتے تھے۔

صوفیہ نے بہت زیادہ متفکرانہ انداز سے کہا۔ ''واقعی حالت اس سے زیادہ تشویشناک ہے جتنا میں سمجھتی تھی۔ ایسی حالت میں ولیم کا یہاں سے چلا جانا فرض کے خلاف ہوگا۔ وہ یہاں گورنمنٹ کے قائم مقام ہو کر آئے ہیں۔ صرف سیر و تفریح کے لیے نہیں۔ کیوں ولیم تمہیں یہاں رہنے میں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟ یہاں کے حالات کے رپورٹ بھی تو بھیجنی پڑے گی۔

مسٹر کلارک نے شراب کا ایک گھونٹ پیتے ہوئے جواب دیا۔ ''تمھاری مرضی ہو تو جہنم میں بھی بہشت کی خوشی حاصل کر سکتا ہوں۔ رہا رپورٹ کا لکھنا وہ تمھارا کام ہے۔''

نیلکنٹھ۔ میری آپ سے مودبانہ عرض ہے کہ ریاست کو سنبھلنے کے لیے کچھ اور وقت دیجیے آپ کا رپورٹ بھیجنا ہمارے لیے مضر ہوگا۔'' (چوگان ہستی، جلد ۱۔ ص 4-7)

اقتباس طویل ذرا زائد ہو گیا۔ لیکن باہنر مصور کی ہنرمندی کے نمونے دکھانے میں بخل بھی کہاں تک روا رکھا جائے؟ ریاستوں کی بے بسی، میم صاحب کی ذہانت و ذکاوت، اور سب سے بڑھ کر صاحب بہادر کے بے پناہ اختیارات کی ہمہ گیری، ہر شے ان میں سے اپنے اپنے موقع پر کیسی کجوی ہوئی ہے! اس کا نام ہے قلم کی مرصع کاری!

بات ذرا الگ ہوئی جاتی ہے، لیکن کلکٹر صاحب کی اس خدائی پر اکبر کا ایک شعر بیساختہ یاد آ گیا۔ اپنے ہم مذہبوں کے سامنے خدا تعالیٰ کی قدرت کا وعظ فرماتے فرماتے کہتے ہیں، کہ موضوع کو طول کہاں تک دوں، بس یہ سمجھ لو، کہ خدا تعالیٰ کو وہ اختیارات حاصل نہیں، جو صاحب کلکٹر بہادر کو ہوتے ہیں! (معاذ اللہ)

اس کی قدرت کا کہاں تک میں کروں تم سے بیاں
میں تو اللہ تعالیٰ کو کلکٹر سمجھا!

''کہاں تک'' کی بلاغت ملاحظہ ہو! شاعر بیان کرتے کرتے تھک گیا ہے، آخر میں عاجز آ کر ایک بے مثال سب سے بڑی، جامع و مانع دے رہا ہے!

شہری زندگی کی نقاشی بہتوں نے کی ہے۔ اسکول میں اور کالج میں، پارک میں اور چمن میں،

کچہری اور اسٹیشن پر سب ہی گھومے پھرے ہیں۔ کھیت کی منیڈوں پر کوئی کم ہی چلا ہے۔ دیہات کے چوپالوں میں، اہیروں اور بھرجیوں کی جھونپڑیوں میں کم ہی کسی کے قدم گئے ہیں۔ پریم چند کے قلم کا اصلی جولانگاہ یہی ہے۔ فن کے دوسرے لوازم میں تو ان کے نظیر ل بھی جائیں گے، لیکن جہاں تک دیہاتی زندگی کی مصوری کا تعلق ہے۔ اب تک پریم چند کے جوڑ پر کوئی نظر نہیں پڑا، دیہات کے جس جس منظر کا سماں دکھلاتے ہیں، دور سے بتلاتے نہیں، گویا اٹھا کر وہیں پہنچا دیتے ہیں۔ ایک گاؤں ہے۔ اور برسات کا موسم، کہ اتنے میں موضع کے زمیندار ٹھاکر صاحب دورہ فرماتے ہیں، گانوں کی لہلہاہٹ اور ٹھاکر صاحب کی قہرمانی دونوں ملاحظہ ہوں۔

''اساڑھ کا مہینہ تھا۔ کسان گہنے اور برتن بیچ بیچ کر بیلوں کی تلاش میں دربدر پھرتے تھے۔ گاؤں کی بوڑھی بنیائن نویلی دولہن بنی ہوئی تھی۔ اور فاقہ کش کمہار برات کا دولہا تھا۔ مزدور موقع کے بادشاہ بنے ہوئے تھے۔ ٹپکتی ہوئی چھتیں ان کے نگاہ کرم کے منتظر گھاس سے ڈھکے ہوئے کھیت ان کے دست شفقت کے محتاج جسے چاہتے تھے بساتے تھے، جسے چاہتے تھے اجاڑتے تھے۔ آم اور جامن کے پیڑوں پر آٹھوں پہر نشانہ باز، منچلے لڑکوں کا محاصرہ رہتا تھا۔ بوڑھے گردنوں میں جھولیاں لٹکائے پہر رات سے نیکے کے کھوج میں گھومتے نظر آتے تھے۔ جو باوجود پیرانہ سالی کے بھجن اور جاپ سے زیادہ لچسپ اور پرمزہ شغل تھا۔ نالا پُر شور، ندیاں اتھاہ۔ چاروں طرف ہریالی اور سبزہ اور نزہت کا حسن بسیط۔ انھیں دنوں ٹھاکر صاحب مرگ بے ہنگام کی طرح گاؤں میں آئے۔ ایک بجی ہوئی بارات تھی۔ ہاتھی اور گھوڑے اور ساز وسامان۔ لٹھیتوں کا ایک رسالہ ساتھ! گاؤں کے لوگوں نے یہ طمطراق اور کروفر دیکھا تو رہے سہے ہوش اُڑ گئے۔ گھوڑے کھیتوں میں اینڈنے لگے اور غنڈے گلیوں میں۔'' (پریم پچیسی جلد 2۔ ص 63-64)

دوسرا منظر:-

''دوسرا اساڑھ آیا تو وہ گاؤں پھر رشک گلزار بنا ہوا تھا۔ بچے پھر اپنے دروازوں پر گھروندے بنانے لگے۔ مردوں کے بلند نغمے کھیتوں میں سنائی دیے اور عورتوں کے سہانے گیت چکیوں پر۔ زندگی کے دلفریب جلوے نظر آنے لگے۔

سال بھر اور گزرا۔ جب ربیع کی دوسری فصل آئی تو سنہری بالوں کو کھیتوں میں لہراتے دیکھ کر کسانوں کے دل لہرانے لگتے تھے۔ سال بھر کی افتادہ زمین نے سونا اُگل دیا تھا۔ عورتیں خوش تھیں، کہ اب کے نئے نئے گہنے بنوائیں گے۔ مرد خوش تھے کہ اچھے اچھے بیل مول لیں گے۔ اور داروغہ کی مسرت کی تو کوئی انتہا نہ تھی۔ ٹھاکر صاحب نے یہ خوش آیند خبریں سنیں اور دیہات کی سیر کو چلے۔ وہی تزک

واحتشام، وہی لٹھیتوں کا رسالہ، وہی غنڈوں کی فوج! گاؤں والوں نے ان کی خاطر و تعظیم کی تیاریاں کرنی شروع کیں۔ موٹے تازے بکروں کا ایک پورا گلہ چوپال کے دروازے پر باندھا۔ لکڑی کے انبار لگائے، دودھ کے حوض بھر دیئے۔ ٹھاکر صاحب گاؤں کے مینڈے پر پہنچے تو پورے ایک سو آدمی ان کی پیشوائی کے لیے دست بستہ کھڑے تھے۔" (ایضاً ص 67-68)

چوگان ہستی میں اگر کمال یہ تھا کہ پلاٹ کی بندش، اتنی طوالت اور اتنی ضخامت کے باوجود کہیں سے سست نہیں ہونے پائی اور اتنے پھیلاؤ کے باوجود دلآویزی میں خلل پڑنے کا کوئی لمحہ نہیں آنے پایا، تو یہ چھوٹے چھوٹے افسانے بھی جن کے مجموعہ کا نام "پریم پچیسی" ہے۔ اپنی نظیر آپ ہی ہیں۔ دو جلدیں اس کی بھی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں عجب دلکشی، سادے اور میٹھے بولوں میں غضب کی موہنی، ہر فقرہ گویا موتیوں کی لڑی!...... فریب نظر کی حد یہ ہے کو دھوکا خود اپنے متعلق ہونے لگے۔ پریم چند کے افسانہ خوانوں کو یہ کب یاد رہ جاتا ہے، کہ سامنے کتاب کھلی ہوئی ہے، اور وہ سرگزشت کسی اور کی پڑھ رہے ہیں؟ محسوس یہ ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ خود ہمارے اوپر گزرتی چلی جارہی ہے۔ بچے بھی ہمیں، بوڑھے ہمیں۔ ہمیں ظالم، ہمیں مظلوم۔ ابھی ہنس بھی ہم ہی رہے تھے۔ ابھی رونے بھی ہم ہی لگے!...... تماشہ سے لطف اٹھایا کیسا، بازیگر کی داد دنیا کجا، ہم خود تماشہ بن گئے۔

شرافت، پریم چند کے قلم کی جان، اور روح انسانیت کی بیداری ان کے ہر افسانہ کا عنوان ہے ان کے افسانے اس کام کے نہیں کہ نوجوانوں کے نفسانی خیالات کو بھڑکائیں، اکسائیں۔ وہ اس غرض کے لیے ہیں کہ روح کی پاکیزگی کو جگائیں، گرمائیں۔ منظر کیسا ہی گندہ ہو، ان کی نظر انتخاب ہمیشہ انھیں عنصروں کو چن لیتی ہے، جو نفس کو نہیں، روح کو تڑپائیں، جذبات کے سفلی نہیں علوی حصے کو گرمائیں، اور بدی کی نہیں، نیکی کی قوت کر حرکت میں لائیں۔

سمن، ایک شریف ہندو، گجادھر پرشاد کی بیوی ہے، پڑوس میں ایک بازاری عورت آکر رہتی ہے بچپن کی بات سمن کے کان میں پڑی ہوئی ہے، کہ بیسواؤں کا پیشہ بھی ذلیل ہے، اور کوئی بھلا آدمی ان کی طرف رخ بھی نہیں کرتا۔ اب اپنی آنکھ سے جو کچھ دیکھتی ہے اس پر اسے اچنبھا ہو کر رہ جاتا ہے، اور نفس کی نظروں میں اگر بدی سرتا سر خوشنما نہیں آنے لگتی ہے، تو کم از کم پیشتر کی سی بدنما اور گھناونی تو یقیناً نہیں باقی رہتی:-

"سمن کے مکان کے سامنے بھولی نام کی ایک طوائف کا مکان تھا۔ بھولی نت نئے سنگار کر کے اپنے بالا خانہ کے جھرو کے پر بیٹھا کرتی۔ پھر رات تک اس کے کمرہ سے نغمۂ خوش آئند کی صدائیں آیا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ فٹن پر سوار ہو کر ہوا کھانے جایا کرتی۔ سمن اسے

حقارت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ سمن نے سن رکھا تھا کہ طوائفیں بہت ہی ذلیل اور بدکار ہوتی ہیں۔ وہ اپنے ناز و انداز سے نوجوانوں کو اپنے دام میں پھنسالیا کرتی ہیں۔ کوئی شریف آدمی ان سے بات چیت نہیں کرتا۔ محض شوقین لوگ رات کو چھپ کر ان کے یہاں جایا کرتے ہیں۔ بھولی نے کئی بار اسے چق کی آڑ میں کھڑے دیکھ کر اشارہ سے بلایا تھا۔ پر سمن اس سے بولنا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھی۔ میں غریب سہی مگر اپنی عصمت پر تو قائم ہوں۔ کسی شریف آدمی کے گھر میں میری روک تو نہیں۔ بھولی کتنا ہی عیش و آرام کرے پر اس کی کہیں عزت تو نہیں ہوتی۔ بس اپنے کوٹھے پر بیٹھی اپنی بے شرمی اور اپنی بے حیائی کا سوانگ دکھایا کرے۔ لیکن سمن کو بہت جلد معلوم ہوا کہ اسے حقیر سمجھنا میری غلطی ہے۔

اساڑھ کے دن تھے۔ گرمی کے مارے سمن کا دم گھٹ رہا تھا۔ شام کے وقت اس سے اندر نہ رہا گیا۔ اس نے چق اٹھا دی اور دروازہ پر بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔ تو کیا دیکھتی ہے کہ بھولی بائی کے دروازے پر کسی تقریب کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بھشتی پانی کا چھڑکاؤ کر رہے تھے صحن میں ایک شامیانہ تانا جا رہا تھا۔ شیشہ آلات ٹھیلوں پر لدے چلے آتے تھے، بچھایا جا رہا تھا۔ بیسوں آدمی ادھر سے اُدھر دوڑے پھرتے تھے۔ اتنے میں بھولی کی نگاہ سمن کی طرف اٹھی قریب آ کر بولی ''آج میرے یہاں مولود ہے دیکھنا چاہو تو پردہ کرا دوں۔

سمن نے بے پروائی سے۔ ''میں یہیں بیٹھے بیٹھے دیکھ لوں گی۔''

بھولی۔ دیکھ تو لوگی پر سن نہ سکوگی۔ حرج کیا ہے اوپر پردہ کرا دوں؟

سمن۔ مجھے سننے کی اتنی خواہش نہیں۔

بھولی نے اس کی طرف اک نگاہ ترحم سے دیکھا اور دل میں کہا یہ گنوارن شاید دیہات سے آئی ہے۔ اپنے دل میں نہ جانے کیا سمجھے بیٹھی ہے۔ اچھا آج تو دیکھ لے کہ میں کون ہوں۔ اس نے زیادہ اصرار نہ کیا۔

رات ہو رہی تھی۔ چولھے کی صورت دیکھ کر سمن کی روح کانپ رہی تھی، پر طوعاً و کرہاً اٹھی چولھا جلایا۔ کھچڑی ڈالی اور پھر دروازہ پر آ کر تماشہ دیکھنے لگی۔ آٹھ بجتے بجتے شامیانہ گیس کی روشنی سے گنبد نور بن گیا۔ پھول پتوں کی آرائش سونے پر سہاگہ تھی۔ تماشائی چاروں طرف سے آنے لگے۔ کوئی بائیسکل پر آتا تھا۔ کوئی ٹمٹم پر، کوئی پیدل، تھوڑی دیر میں دو تین فٹنیں بھی آ پہنچیں۔ ایک گھنٹہ میں سارا صحن بھر گیا۔

اس کے بعد مولانا صاحب تشریف لائے۔ ان کے چہرے سے ایک جلال برستا تھا اور وہ آراستہ تخت پر مسند لگا کر آ بیٹھے اور مولود شروع ہو گیا۔ کئی آدمی مہمانوں کی تواضع و تکریم کرنے لگے۔ کوئی گلاب چھڑکتا تھا، کوئی خاص دان پیش کرتا تھا۔ سمن نے شرفا کی ایسی مجلس آج تک کبھی نہ دیکھی تھی۔

نو بجے گجادھر پرشاد آئے سمن نے انھیں کھانا کھلایا۔ گجادھر بھی کھانا کھا کر اسی مجلس میں شریک ہو گئے، اور سمن کو تو کھانے کی سدھ ہی نہ تھی۔ گیارہ بجے رات تک وہ وہیں بیٹھی رہی۔ پھر شیرینی تقسیم ہوئی اور بارہ بجے مجلس ختم ہو گئی۔

گجادھر گھر میں آئے تو سمن نے کہا "یہ سب کون لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔"

گجادھر: میں سب کو پہچانتا تھوڑے ہی ہوں۔ بھلے برے سبھی ہوں گے۔ شہر کے کئی رئیس بھی تھے۔

سمن۔ کیا یہ لوگ ایک طوائف کے گھر آنے میں اپنی توہین نہیں سمجھتے۔؟

گجادھر۔ توہین سمجھتے تو آتے ہی کیوں۔

سمن۔ تمھیں تو وہاں جاتے ہوئے شرم آئی ہو گی۔

گجادھر۔ جب اتنے شرفا بیٹھے ہوئے تھے تو مجھے کیوں شرم آنے لگی؟ وہ سیٹھ جی بھی آئے تھے جن کے یہاں میں شام کو کام کرنے جایا کرتا ہوں۔

سمن نے پرخیال انداز سے کہا۔ "میں سمجھتی تھی کہ ان عورتوں کو لوگ بہت ذلیل سمجھتے ہیں گجادھر۔ ہاں ایسے لوگ بھی ہیں پر گنے گنائے۔ انگریزی تعلیم نے لوگوں کو آزاد بنا دیا ہے۔ بھولی بائی کی شہر میں بڑی عزت ہے۔

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا بالکل بند تھی۔ گجادھر پرشاد دن بھر کے تھکے ہوئے چارپائی پر جاتے ہی سو گئے۔ پر سمن کو نیند نہ آئی۔

دوسرے دن شام کے وقت جب وہ پھر چق اٹھا کر بیٹھی تو اس نے بھولی کو چھجے پر بیٹھے دیکھا۔ وہ برآمدے میں نکل کر خود بھولی سے بولی۔ "رات تو آپ کے یہاں بڑی دھوم تھی۔"

بھولی سمجھ گئی کہ میری فتح ہوئی۔ مسکرا کر بولی۔ "تمھارے لیے شیرینی بھیج دوں۔ حلوائی کی بنائی ہوئی ہے اور برہمن لایا ہے۔"

سمن نے شرماتے ہوئے کہا "بھجوا دیجیے گا۔"

ہماری معاشرت جس طرح شیطان کی اعزازی ایجنٹ بنی ہوئی ہے، اس کی تصویر اس سے بڑھ کر لطیف بھی، اور پُر درد بھی اور کیا ہوگی؟..... لوگ قصہ کہانیوں کو محض لطف و تفریح کے لیے پڑھتے ہیں، لیکن اس لطف کے ساتھ ہی ساتھ اگر نفع بھی منظور ہو، بدی کی مخفی راہوں کا علم، شیطنت کی خفیہ چالوں کا احساس، وطنیت کا صحیح جذبہ، اور ایثار، اخلاص اور خدمت خلق کی تربیت بھی اگر مدنظر ہو، تو ایسی شیریں، خوش گوار کونین[1]، پریم چند ہی کے دواخانہ میں دستیاب ہوگی، اور ہندوستان میں تحریک وطنیت کی تاریخ، مورخ کا قلم جب آج سے سو پچاس برس کے بعد لکھے گا تو اس کے تیس پچیس برس کی تاریخ سمجھنے کے لیے جہاں گاندھی جی، موتی لال، جواہر لال، داس، محمد علی انصاری اور ابوالکلام کی تقریریں اور تحریریں پڑھنی لازمی ہوں گی، وہاں پریم چند کے افسانے بھی ناگزیر ہوں گے۔

علم وذہانت

علم اور ذہانت، فہم اور فراست یا دیگر ذہنی اور دماغی اوصاف کو ہوس اور زر پرستی کا غلام نہیں بنانا چاہیے۔ علم کا کام ہے تہذیب اخلاق، اور تہذیب اخلاق کا نتیجہ فیاضی، فراخدلی، ایثار، بے نفسی، ہمدردی، غریب دوستی اور انصاف پسندی ہے۔ وہ تعلیم جو ہمیں ثروت وجاہ کا غلام بنادے، جو ہمیں زبردست آزاری پر مائل کرے، جو ہمیں تکلفات کا مطیع بنائے، جو ہمیں دوسروں کا خون پی کر فربہ ہونے کی تحریک کرے، تعلیم نہیں شیطنت ہے۔ جہلا، حرص وطمع کے بس میں ہو جائیں تو قابل معافی ہیں، مگر مدعیان علم وتہذیب کے لیے نفس پرستی صد درجہ شرمناک ہے۔

(پریم بتیسی)   پریم چند

---

[1] Quinine

"منشی پریم چند کے آرٹ پر ایک سرسری نظر"

(از ایچ.ایل.گاندھی، بی.اے جرنلسٹ)

منشی پریم چند کی وفات ایک قومی حادثہ ہے۔ جس کا ملال عرصہ دراز تک اہل ملک کے دلوں میں باقی رہے گا۔ اردو ہندی ادب میں جو پوزیشن منشی پریم چند کو حاصل تھی، وہ کسی موجودہ مصنف کو نصیب نہیں اور نہ مستقبل قریب میں ہمیں ان کا کوئی جانشین پیدا ہوتے ہوئے نظر آتا ہے۔

ہندوستانی ادیبوں میں ڈاکٹر ٹیگور کے بعد پریم چند ہی کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی، ان کی موت کو اب ایک سال سے زیادہ ہو گیا ہے لیکن ان کے ادبی کارنامے ہندوستانی مصنفین کے لیے قیامت تک چراغ ہدایت کا کام دیتے رہیں گے۔

اردو ہندی میں منشی پریم چند مختصر افسانہ نگاری کے بانی ہوئے ہیں، ان سے قبل اس صنف سے ہمارا ادب بالکل نا آشنا تھا۔ انھوں نے نفسیات کے لطیف ترین جذبات کو مجلسی، معاشرتی، قومی اور ملکی واقعات کی رنگت دے کر افسانوں اور ناولوں کی شکل میں پیش کیا ہے۔

فنی حیثیت سے منشی پریم چند کے آرٹ کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، یعنی

(1) کردار نگاری (2) پلاٹ (3) طرز نگارش (4) بیک گراؤنڈ (پس نظر) اور (5) پیغام

اس مختصر سے مضمون میں ان سب باتوں پر سرسری روشنی ڈالی جائے گی۔

کردار نگاری: منشی پریم چند فطرت نگار تھے، ان کے کمال افسانہ نگاری کی اہمیت ان کے کرداروں میں ہے ان کے کارناموں میں سب طرح کے جوجیتے جاگتے کردار ہیں، کٹ پتلیاں یا مٹی کے کھلونے نہیں ہیں، بلکہ گوشت پوست کے مکمل انسان ہیں، نہ دیوتا ہیں اور نہ راکھشش، ان میں خوبیاں اور برائیاں دونوں ہیں خاص خاص اوقات اور حالات میں ان کے جذبات، خیالات اور احساسات میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں، انقلاب آتے ہیں اور عادات بنتی بدلتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔

''غبن'' میں رما ایک کمزور نوجوان کی صورت میں پیش کیا گیا ہے، وہ حالات کے ہاتھوں بالکل کٹ پتلی بن گیا ہے، اس میں جرأت نہیں کہ ان کا مقابلہ کر سکے، رتن واقعی رتن ہے، دنیا کے مکروفریب سے بے نیاز! جالپا کا کردار فطرت انسانی کا دلکش مطالعہ ہے۔ شروع میں وہ فیشن پرست، لاپروا اور سوسائٹی میں امتیازی شان حاصل کرنا چاہتی ہے، لیکن اس کے شوہر کا فرار اس کے نظامِ زندگی کو یک لخت بدل دیتا ہے جس سے ایک انقلاب عظیم پیدا ہو جاتا ہے، چنانچہ وہ مصمم عزم کر کے شوہر کی تلاش میں نکلتی ہے، اور اپنی بلند حوصلگی سے اس کو روحانی گراوٹ سے بچا لیتی ہے۔ اگر جالپا کی جگہ کوئی اور کمزور دل عورت ہوتی تو رما بابو کی کشتی حیات سنگین واقعات کی چٹانوں سے ٹکرا کر چکنا چور ہو جاتی۔

''بازارِ حسن'' میں پدم سنگھ، وٹھل داس، سدن اور سمن قابل ذکر کردار ہیں۔ پدم سنگھ اور وٹھل داس شاہدانِ بازاری کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں، لیکن دونوں کے نظریے میں اختلاف ہے۔ بھولی سمن کو بدی کی طرف لے جانے کے لیے جال پھیلاتی ہے۔ اس کی چکنی چپڑی باتیں معصوم اور مکروفریب سے بے نیاز سمن کے لیے زہر قاتل ثابت ہوتی ہیں۔ اس کو ان گناہ آلود باتوں کی کتنی گراں قیمت دینا پڑتی ہے! وہ سوسائٹی کی نظروں میں گر جاتی ہے۔

''گوشۂ عافیت'' میں بلراج ایک دیہاتی نوجوان کی بہترین تصویر ہے۔ غوث خاں اور قادر خاں دو متضاد اصولوں کی زندہ تصویریں ہیں، ایک کسانوں کے لیے تن من دھن قربان کر دینا چاہتا ہے، دوسرا ان کی ذرا سی کوتاہی کو رائی کا پہاڑ بنا دیتا ہے۔ پریم شنکر ''ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا'' کے اصول کا علمبردار ہے شردھا اور ودیا ہندوستانی عورتوں کی بہترین مثالیں ہیں۔

''پردۂ مجاز'' میں چکر دھر کو ایک نڈر بے دھڑک اور دلیر آدمی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ غریبوں کا سچا ہمدرد اور کسانوں و مزدوروں کا پکا خیر خواہ ہے، اور ہندو مسلم فساد کو سلجھانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے منورما سچ مچ دیوی ہے۔ اس کا وجود کئی تاریک دلوں کے لیے چراغ ہدایت کا کام دیتا ہے۔ وہ چکر دھر سے محبت کرتی ہے۔ اپنے دل کی گہرائیوں سے، لیکن اس کی محبت گناہ کی آلایشوں سے قطعی پاک ہے۔ اس کی شادی ایک راجہ سے ہو جاتی ہے، وہ رانی بنتی ہے، لیکن اپنے عروج سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھاتی، بلکہ ہمیشہ غریبوں کسانوں اور دکھیوں کا ساتھ دیتی ہے۔

پلاٹ: منشی پریم چند ایک زبردست داستان گو ہیں۔ ان کے ناول دلآویز اور فنی خامیوں سے مبرا ہیں۔ ان کا پلاٹ ہمیشہ نہایت دلکش اور چست ہوتا ہے، ان کے ناول مجلسی معاشرتی، قومی اور ملکی واقعات کا آئینہ ہیں۔ ان کی بنیاد میں اظہار حقیقت کا خیال اور اصلاح کا جذبہ کارفرما رہتا ہے، دراصل ان کے سب

قصے ہماری روز مرہ زندگی کی عکسی تصویریں ہیں۔ اور ان کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنی داستان حیات کے کسی واقعہ کو پڑھ رہے ہیں۔

طرزِ نگارش: منشی پریم چند اردو ہندی کے زبردست انشاپرداز تھے، ان کا کوئی صفحہ لاپروائی سے لکھا ہوا نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ ہر فقرہ فنی حیثیت سے جامع ہوتا ہے۔ ان کی طرزِ نگارش سادہ، پاک وصاف سلیس ودلکش ہے ان کی تحریر عبارت آرائی کے پیچیدار الجھنوں سے قطعی پاک ہے۔ ان کے مکالمے بالکل قدرت کے مطابق اور کردار کے حسب حال ہوتے ہیں۔

پس منظر: منشی پریم چند زندگی کو روحانی نقطۂ نگاہ سے نہ دیکھتے تھے، وہ ایک زبردست حقیقت نگار اور عملی فلاسفر تھے۔ انھوں نے فلسفۂ زندگی کو اپنے ناولوں میں اچھی طرح نبھایا ہے۔ انھوں نے زندگی کے تاریک پہلوؤں پر بھی بخوبی روشنی ڈالی ہے۔ ان کے ناولوں کا ایک خاص موضوع افلاس وتنگدستی اور مظلوموں کی آہ وبکا ہے، وہ سچے وطن پرست تھے۔ ان کی ہر تصنیف سے حب الوطنی کی بو آتی ہے۔ سب سے بڑھ کر وہ ایک سچے مصلح قوم تھے۔ انھوں نے ادب کے ذریعے سوسائٹی، قوم اور ملک کی اصلاح کی کوشش کی ہے۔ وہ ہمیشہ غریب کسانوں اور افلاس زدہ مزدوروں اور سوسائٹی کی نظروں سے گرے ہوئے بدنصیبوں کے حق میں پروپیگنڈا کیا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے منشی پریم چند، ڈکنز، ٹھیکرے، ٹالسٹائی کے ہم پلہ ہیں، بلکہ بعض مقامات پر ان سے بھی بہت آگے بڑھ گئے ہیں "بازارِ حسن" میں انھوں نے رنڈیوں کے سدھار کے لیے آواز بلند کی ہے۔ "پردۂ مجاز" "گوشۂ عافیت" چوگانِ ہستی" میں کسانوں، زمینداروں، مزدوروں اور سرمایہ داروں کے متعلق پروپیگنڈا کیا ہے۔ گالزوردی بھی اپنے ناولوں میں اسی قسم کا پروپیگنڈا کرتا ہے۔ لیکن غیر جانبدارانہ حیثیت سے منشی پریم چند جانبدار ہوکر کسانوں اور مزدوروں کے حق میں پروپیگنڈا کرتے ہیں۔

پیغام: ادب کا سب سے بڑا فرض مجلسی اصلاح اور مسائل زندگی کا حل پیش کرنا ہے۔ منشی جی نے اپنے ناولوں میں نہایت خوش اسلوبی سے اس کے ہر پہلو کا تبصرہ کیا ہے۔ ہر مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی ہے "پردۂ مجاز" میں انھوں نے نکاح ثانی، ہندو مسلم فساد، کاشت کاروں پر کیے ہوئے ظلم اور مسئلہ تناسخ کا حل نہایت کامیابی سے پیش کیا ہے۔

"بازارِ حسن" میں بازاری عورتوں کی اصلاح اور ان کے متعلق ہندو مسلم نظریہ پیش کیا گیا ہے۔

"گوشۂ عافیت" میں کاشتکاروں کی مشکلات، بیگار، وصولی مالیہ وغیرہ جیسے دشوار گزار مسائل حل کیے گئے ہیں۔

منشی پریم چند کا انتقال چھپن برس کی عمر میں ہوا ہے اور گو اس وقت ان کا آرٹ درجۂ کمال پر پہنچ چکا تھا، تاہم اگر وہ بیس سال اور زندہ رہتے تو لازمی طور پر ان کے نئے شاہکار نسبتاً کہیں زیادہ موثر وقیع اور قابل قدر ہوتے۔ اس وقت بہت سے ایسے مسائل زندگی ہیں جو بدقسمتی سے آج کل ہر ہندوستانی کے لیے سوہان روح ثابت ہو رہے ہیں۔ چند سال کی بہت مہلت ملتی تو یقیناً وہ اپنے ریفارم مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیتے۔ مگر نا وقت موت نے ان کو ہم سے چھین لیا۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

•

پریم چند اور دیہات

از اوپیندر ناتھ اشک، بی۔اے۔ایل ایل بی

''بھائی انسان کا بس ہو تو کہیں دیہات میں جا بسے۔ دو چار جانور پال لے اور زندگی کو دیہاتیوں کی خدمت میں گذار دے۔''   پریم چند (9؍جولائی 1936ء)

یہ عبارت اس خط سے اقتباس کی گئی ہے جو منشی پریم چند نے اپنی طویل علالت کے شروع میں مجھے لکھا تھا یہ علالت آخر ان کی جان ہی لے کر رہی۔ عمر کا بیشتر حصہ شہروں میں بسر کرنے کے باوجود پریم چند کا دل ہمیشہ دیہات ہی میں رہا۔ اور وہ غریب دیہاتیوں کے دکھ درد میں برابر شریک رہے۔ ان کا دماغ ہمیشہ انھیں قعر ذلت سے نکال کر بام ترقی پر پہنچانے کی ترکیبیں سوچتا رہتا تھا۔

پریم چند کی یاد آتے ہی میرے سامنے دیہات کی تصویر کھنچ جاتی ہے۔ اور گو مجھے ان کے نزدیک رہنے اور اس بات کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا کہ وہ اپنے طرز رہائش سے کس حد تک دیہاتی تھے۔ لیکن ان کے خطوط کو پڑھ کر ان کے زندہ جاوید ادبی کارناموں کو دیکھ کر ان کا مطالعہ کر کے میں اس کے سوائے کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا کہ دیہات کی روح ان کے رگ و ریشہ میں بسی ہوئی تھی وہ جانتے تھے کہ ہندوستان دیہات میں بستا ہے اور ملکی آزادی اور ترقی کا راز دیہات کی آزادی اور ترقی میں مضمر ہے۔ جب تک دیہاتی بے علمی، جہالت، کورانہ عقیدت، قرضہ اور دوسری بدعتوں میں جکڑے ہوئے رہیں گے ہندوستان کبھی آزاد نہیں ہو سکتا۔

پریم چند نے دیہات کی زندگی کے متعلق بیسیوں کہانیاں لکھی ہیں پنچ پرمیشور، بیٹی کا دھن، نمک کا داروغہ اور دوسری کہانیاں دیہاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں، اسی پر آپ کے بیشتر ناولوں کی بنیاد قائم ہے یہیں وہ پیدا ہوئے اور پروان چڑھے۔ ان کے ناولوں میں چوگان ہستی، میدان عمل، گوشۂ عافیت اور گئودان زیادہ تر دیہات کی رام کہانی ہیں۔

پریم چند کے گاؤں: شمالی کوہستانی سلسلوں کے بیچ میں ایک چھوٹا سا ہرا بھرا گاؤں ہے۔ سامنے گنگا دوشیزہ کی طرح ہنستی کھیلتی، ناچتی گاتی چلی جارہی ہے۔ گاؤں کے پیچھے ایک بوڑھا پہاڑ کسی بوڑھے جوگی کی طرح جٹا بڑھائے سیاہ تمکین خیال میں محو کھڑا ہے۔ یہ موضع گویا اس کی طفلی کی یاد ہے۔ خوشیوں اور دلچسپیوں سے پُر یا کوئی عالم شباب کا سنہرا خواب، گاؤں میں مشکل سے بیس پچیس جھونپڑے ہوں گے۔ پتھر کے ناہموار ٹکڑوں کو اوپر نیچے رکھ کر دیواریں بنائی گئی ہیں۔ ان پر چھپر ڈال دیے گئے ہیں۔ دروازوں پر ٹبکٹ کی ٹٹیاں ہیں۔ انھی کا بکوں میں اس گاؤں کی مخلوق اپنے گائے بیل، بھیڑ اور بکریوں کے لیے خدا جانے کب سے آباد ہے۔"

شہری زندگی سے تنگ آئے ہوئے امرکانت کو یہ گاؤں خوبصورت لگا۔ امرت کانت کہتے بھی ہیں۔ "ایسا خوبصورت گاؤں میں نے نہیں دیکھا۔ ندی، پہاڑ، جنگل اس کا تو سماں ہی نرالا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ یہیں رہ جاؤں اور کہیں جانے کا نام نہ لوں۔" امرکانت ہی کیوں کوئی بھی قدرت کا عاشق وہاں جا کر اپنی جلی ہوئی روح کو تسکین پہنچا سکتا ہے۔ ہندوستان کے دیہات قدرت کا روپ ہیں۔ قدرت کا ہی رنگ ہیں۔ جہاں پہاڑ ہے، ندی ہے، ہرے بھرے درخت ہیں کھیت ہیں۔ وہاں مٹی یا پتھر کے بنے ہوئے چھوٹے گھروں کی تصویر خود بخود ذہن میں کھنچ جاتی ہے۔ شہر تو قدرت کے حسین جسم پر پھوڑے ہیں اس کی خوبصورتی کے رہزن ہیں۔ اور اگر شہریوں کی شاطرانہ چالوں نے ان خوبصورت دیہات میں رہنے والوں کی زندگی کو تلخ نہ کر دیا ہوتا۔ تو وہاں جانیوالا سچ مچ ہی پھر آنے کا نام نہ لیتا۔

اپنے آخری ناول گئودان میں پریم چند نے ایک جگہ بیلاری میں پھاگن کی آمد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> "پھاگن اپنی جھولی میں نئی جوانی کی دولت لے کر آ پہنچا۔ آم کے پیڑ دونوں ہاتھوں سے بور کی خوشبو بانٹ رہے تھے، اور کوئل آم کی ڈالیوں میں چھپی ہوئی موسیقی کا گپت دان کر رہی تھی۔"

یہی خوبصورتی ہے جو پریم چند کو بار بار دیہات کی طرف کھینچتی رہی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خوبصورتی کا نقشہ کھینچتے وقت پریم چند دیہات کی فضا میں کھو جاتے تھے۔ لیکن دیہات کی اصلی دلکشی دیہاتیوں کی فارغ البالی پر ہی منحصر ہے۔ فاقہ مست کو روزوں کی خوبیوں کا تذکرہ کیا بھائے گا۔ امر کانت نے جو گاؤں دیکھا تھا۔ وہ گئودان کے بیلاری سے مختلف تھا۔ وہاں کے باشندے فاقہ مست نہیں ہیں۔ بیگار کی مزدوری کا وہاں نام نہ تھا۔ امرکانت چاہتے تھے کوئی کام مل جائے تو گاؤں میں ہی ٹک

جائیں۔ ان کا ارادہ جاننے پر گوبر کہتا ہے۔ کام کی یہاں کون کمی ہے۔ گھاس بھی کرلو تو روز روز کی مزدوری ہو جائے۔ نہیں جوتے کا کام ہے، تکیاں بناؤ۔ چرسے بناؤ۔ محنت کرنے والا بھوکا نہیں رہتا۔ دھیلی کی مزدوری کہیں گئی نہیں۔''

لیکن بیلاری میں مزدوری ایسے آرام سے نہیں ملتی۔

دھنیا کہتی ہے۔ کب تک پیال میں گھس کر رات کاٹیں گے۔ اور پیال میں گھس بھی لیں تو پیال کھا کر تو گذارہ نہ ہوگا۔ تمھاری خواہش ہو تو گھاس کھاؤ۔ لیکن گھاس کھا کر تو رہا نہ جائے گا۔

ہوری کہتا ہے۔ مزدوری تو ملے گی۔ مزدوری کر کے کھائیں گے۔

دھنیا پوچھتی ہے۔ ''کہاں ہے اس گاؤں میں مزدوری''؟

رائے صاحب وہاں مزدوری لیتے ہیں لیکن ایک آنہ روز دیتے ہیں۔ داتا دین سینت میت (مفت) میں یا تین آنے یومیہ پر مزدوری لیتے ہیں لیکن ایسی کڑی کہ کوئی مزدور ان کے ہاں نکتا نہیں۔ اور ایک ٹھیکیدار بھی مزدوری لیتے ہیں۔ لیکن ایسی مزدوری جو ہوری کی جان ہی لے لیتی ہے۔

ایسے گاؤں کا نقشہ پریم چند کس طرح اپنے قلم کی جولانی سے خوبصورت بنا سکتے تھے۔ اور اسی لیے جب گوبر شہر سے لوٹتا ہے۔ تو وہی گاؤں جو فارغ البالی کی حالت میں دل کو راحت اور آنکھوں کو سرور بخشتا۔ اب اُجڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ میدان عمل کے گاؤں کے بعد اب ذرا گئو دان کے اس گاؤں کا نقشہ ملاحظہ کیجئے۔

> ''گوبر نے گھر پہنچ کر اس کی حالت دیکھی تو ایسی مایوسی ہوئی کہ اسی وقت وہاں سے لوٹ جائے گھر کا ایک حصہ تو تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی گرا۔ ابھی گرا۔ دروازے پر ایک بیل بندھا ہوا تھا وہ بھی نیم جان۔''

اور یہ حالت صرف ہوری کی ہی نہ تھی۔ سارے گاؤں پر یہی مصیبت نازل تھی۔ ایسا ایک بھی آدمی نہ تھا۔ جس کی رونی صورت نہ ہو۔ گویا ان کی روح پر غم کا سکہ بیٹھا ہوا انھیں کٹھ پتلیوں کی طرح نچا رہا ہے۔ دروازوں پر منوں کوڑا جمع ہے۔ بدبو اڑ رہی ہے۔ لیکن ان کی ناک میں نہ سونگھنے کی حس باقی ہے نہ آنکھوں میں دیکھنے کی طاقت۔ سرِ شام ہی سے دروازوں پر گیدڑ رونے لگتے ہیں۔ لیکن انھیں کوئی غم نہیں۔'' (گئو دان صفحہ 598)

کہاں ہے وہ خوبصورتی اور وہ دلکشی جو شہر سے آنے والے کو موہ لے۔ میری ہریالی سے آنکھوں کی پیاس بجھاؤ۔ میری آزاد اور پاکیزہ فضا میں سانس لو۔ پریم چند حقیقت نگار تھے۔ اور اپنے ناولوں میں

انھوں نے جہاں جہاں دیہات کا نقشہ کھینچا ہے دیہاتیوں کی زندگی کو کبھی نہیں بھولے ہیں۔

دیہات کے موسم: پریم چند جس چیز کا ذکر کرتے ہیں۔اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔آپ نے اپنی زندگی میں کوئی گاؤں نہ دیکھا ہو۔آپ کو کبھی دیہات کی سردیوں سے پالا نہ پڑا ہو۔آپ نہ جانتے ہوں مفلس اور قلاش کسان موسم سرما کیسے گذارتے ہیں تو پریم چند کے جادو نگار قلم سے کھینچی ہوئی تصویر دیکھیے۔آپ سب کچھ جان جائیں گے۔اور آپ کے سامنے گاؤں کی سردی اور اس میں ٹھٹھرتے ہوئے کسان کی تصویر کھنچ جائے گی۔

''ماگھ کے دن تھے۔مہاوٹ لگی ہوئی تھی۔گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ایک تو سردیوں کی رات اس پر ماگھ کی بارش،موت کا سناٹا تھا۔اندھیرا تک نہ سوجھتا تھا۔ہوری کھانا کھا کر پنیا کے کھیت کی مینڈھ پر لیٹا ہوا تھا۔چاہتا تھا۔سردی کو بھول جائے اور سو رہے۔لیکن تار تار کمبل اور پھٹی ہوئی مرزئی اور سرد نمناک ہوا کے جھونکوں سے گیلی پیال۔نیند اتنے دشمنوں کے سامنے آنے کا حوصلہ کیسے کر سکتی۔آج تمبا کو بھی نہ ملا تھا نہیں تو اس سے ہی من بہلاتا۔اپلا سلگا لایا تھا۔لیکن سردی میں وہ بھی بجھ گیا۔پھٹے ہوئے پیروں کو پیٹ میں ڈال کر اور کمبل سے منہ چھپا کر اپنے ہی گرم سانسوں سے خود کو گرم رکھنے کی سعی لا حاصل میں مصروف تھا۔لیکن کمبل کیا کرے۔وہ بوڑھا کمبل اس کا ساتھی تو ہے۔لیکن اب وہ کھانا چبانے والا دانت نہیں دکھنے والا دانت ہے۔'' (گئودان صفحہ 194)

کتنی دردناک تصویر ہے۔گرمیوں کے دنوں میں اگر بارش نہ ہو تو کیا حالت ہو جاتی ہے۔ذرا اس کا حال بھی پڑھئے۔

''ساون کا مہینہ آگیا تھا اور بگولے اٹھ رہے تھے۔کنوؤں کا پانی بھی سوکھ گیا تھا۔اوکھ تپش سے جلی جاتی تھی۔نہر سے تھوڑا تھوڑا پانی ملتا تھا۔لیکن آئے دن اس کے پیچھے لاٹھیاں چلتی تھیں۔یہاں تک کہ ندی نے بھی جواب دے دیا تھا۔جگہ جگہ چوریاں ہونے لگیں ڈاکے پڑنے لگے۔سارے صوبہ میں واویلا مچ گیا۔''

اور اگر اس حالت میں بارش ہو جائے تو دونوں کے دل کے سوکھے کنول کس طرح ہرے ہو جاتے ہیں۔کس طرح ان کے نیم مردہ دلوں میں جان آجاتی ہے۔اس کا خاکہ پریم چند نے اس طرح کھینچا ہے۔

''بارے خدا بارش ہوئی۔کسانوں کے دل ہرے ہو گئے۔کتنی خوشی،کتنی مسرت تھی اس دن

مسرت کا جام گویا چھلکا پڑتا تھا۔ زمین کی جیسے پیاس ہی نہ بجھتی تھی۔ پیاسے کسان اس طرح اچھل رہے تھے جیسے بوندیں نہیں اشرفیاں برس رہی ہوں۔ بٹور لو جتنا بٹور سکو۔ کھیتوں میں جہاں بگولے چلتے تھے وہاں ہل چلنے لگے۔ لڑکے لڑکیاں نکل کر تالابوں پوکھروں اور چھپڑوں کا معائنہ کرنے لگے۔ اوہو تالاب تو آدھا بھر گیا۔" اور وہاں سے چھپڑ کی طرف بھاگے۔" (گئو دان صفحہ 151)

کتنی زندہ تصویر ہے۔ برسات کے بعد کی حالت بھی دیکھیے۔

"برسات کے دن تھے۔ کسانوں کو مکئی اور باجرے کی رکھوالی سے دم مارنے کی فرصت نہ تھی۔ جدھر دیکھو ہا۔ ہو۔ کی آواز سنائی دیتی تھی۔ کوئی ڈھول بجاتا تھا۔ کوئی ٹین کے پیپے پیٹتا تھا۔ دن کو طوطوں کے جھنڈ کے جھنڈ ٹوٹتے تھے۔ رات کو گیدڑوں کے غول اس پر دھان کی کیاریوں میں پودے بٹھانے پڑتے تھے۔ پہر رات رہے کھیتوں میں جاتے تھے اور پہر رات گئے آتے تھے۔ کسی کا گھر گرتا تھا۔ کسی کے کھیت کی مینڈھیں کاٹی جاتی تھیں۔ کشمکش حیات کی دوہائی مچی ہوئی تھی۔ (گوشہ عافیت)

برسات کے خاتمہ کی ایک اور تصویر ملاحظہ ہو:۔

"برسات ختم ہو چکی تھی۔ سڑکوں میں جدھر نکل جائیے۔ سڑے ہوئے سن کی بدبو اڑتی تھی کبھی جیٹھ کو لجانے والی دھوپ ہوتی تھی۔ اور کبھی ساون کو شرمانے والے بادل گھر آتے تھے۔ مچھر اور ملیریا کا زور تھا۔ نیم کی چھال اور گلو کی چڑھ بنی ہوئی تھی۔ چراگاہ میں دور تک ہری ہری گھاس لہرا رہی تھی۔ ابھی کسی کو اس کے کاٹنے کی فرصت نہ تھی۔" (گوشۂ عافیت)

پریم چند کی نگاہ کتنی باریک بیں ہے ان کے قلم میں کیا کمال حاصل ہے۔

دیہاتی اور ان کی زبوں حالی: پریم چند کے دیہات کے بھولے بھالے مفلس وقلاش قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے رسم ورواج کے پابند۔ دھرم اور دین کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے۔ آن کی خاطر مر مٹنے والے بے بس اور مظلوم دیہاتی ہیں۔ وہ گناہ کرتے ہیں لیکن ان کا گناہ بھی مجبوری کا دوسرا نام ہے۔ اور وہ گناہ کی تلخیوں سے پاک ہے۔ بلکہ اس میں ان کی سادہ لوحی ٹپکتی ہے۔ اس لیے ان کے گناہ دیکھ کر غصہ کے بجائے رحم آتا ہے۔

منوہر غوث خاں کو قتل کر دیتا ہے۔ لیکن کیا وہ گناہ گار ہے؟ کیا اس قتل کی وجہ سے آپ کے دل میں اس کے لیے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ وہ کمزور غریب اور قلاش دیہاتی ہے۔ رات کو اسے ٹھیک طرح

سوجھائی بھی نہیں دیتا۔ ساٹھ سال کی عمر ہے۔ پھر کیا وجہ کہ جس کام کو اس کا نوجوان لڑکا مضبوط اور طاقتور ہوتے ہوئے بھی کرنے سے جھجکتا ہے۔ وہ بوڑھا اور کمزور ہو کر بھی کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ یہ اسی کی زبان سے سنئے۔ رات کے وقت جب چاروں طرف سناٹا چھایا ہے اور سب لوگ سوئے ہیں۔ منوہر اپنے لڑکے بلراج کو جگا کر کہتا ہے:۔

> ''اچھا تو اب رام کا نام لے کر تیار ہو جاؤ۔ اپنی عزت اور ناموس کی حفاظت کرنا مردوں کا کام ہے۔ ایسے مظالم کا ہم اور کیا جواب دے سکتے ہیں۔ بے عزت ہو کر جینے سے مرنا اچھا۔'' (گوشۂ عافیت)

اور پھر یہی منوہر جب دیکھتا ہے کہ اس کام کے لیے جس کا وہ تنہا ذمہ دار ہے۔ سارے کا سارا گاؤں بندھا جارہا ہے۔ تو وہ اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کی رسی کاٹ دیتا ہے۔ کیا اس کا یہ اقدام اس کے کردار کو ہماری نظروں میں بلند نہیں کرتا۔ اور کون جانتا ہے آئے دن دیہات میں جو قتل و غارت گری ہوتی ہے۔ ڈاکے پڑتے ہیں۔ لڑائیاں ہوتی ہیں۔ ان کی تہ میں کون سے مظالم کام کرتے ہیں۔

گئو دان میں ہوری لڑکی کو بیچنے کا گناہ کرتا ہے۔ دین دھرم اور مرجادا (خاندانی ناموس) کا پابند ہوری روپا جیسی کمسن نازنین کو رام سیوک جیسے ادھیڑ شخص سے بیاہ دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ:

> ''زندگی کی تگ و دو میں اسے ہمیشہ شکست ہوئی۔ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ ہر شکست جیسے اسے قسمت سے مقابلہ کرنے کی طاقت دے دیتی تھی۔ لیکن اب تو وہ اس آخری حالت کو پہنچ گیا تھا۔ جب اس میں خود اعتمادی بھی نہ رہی تھی کہ وہ اپنے ایمان پر مستحکم رہ سکے۔''
>
> (گئو دان صفحہ 598)

ایک دوسری جگہ پر پریم چند دیہاتیوں کے تنزل کی دردناک تصویر کھینچتے ہیں:۔

> ''ایسا ایک بھی آدمی نہیں جس کی رونی صورت نہ ہو۔ چلتے پھرتے تھے۔ کام کرتے تھے پستے تھے۔ گھٹتے تھے۔ اسی لیے کہ پسنا اور گھٹنا ان کی تقدیر میں لکھا ہے۔ زندگی میں کوئی امید ہے نہ کوئی اُمنگ جیسے ان کی زندگی کے چشمے سوکھ گئے ہوں۔ اور ساری ہریالی مرجھا گئی ہو۔''
>
> ''جیٹھ کے دن ہیں۔ ابھی تک کھلیانوں میں اناج موجود ہے۔ لیکن کسی کے چہرے پر خوشی نہیں، بہت کچھ تو کھلیانوں ہی میں تل کر مہاجنوں کے کارندوں کی بھینٹ ہو چکا ہے۔ اور جو بچا ہے وہ بھی دوسروں ہی کا ہے۔ مستقبل کی تاریکی ان کے سامنے ہے۔ اس میں انھیں کوئی راستہ نہیں سوجھتا۔ ان کے ہوش گم ہو چکے ہیں۔ سامنے جو کچھ موٹا جھوٹا آجاتا ہے نگل

جاتے ہیں۔ اسی طرح جیسے انجن کوئلہ نگل جاتا ہے۔ ان کے بیل جوئی چوکر کے بغیر ناند میں منہ نہیں ڈالتے۔ لیکن انھیں تو صرف پیٹ میں کچھ ڈالنے کو چاہیے۔ مزے سے انھیں کوئی مطلب نہیں ان کی زبان کا رس ہی مر چکا ہے۔ اس لیے۔

''چاہے ان سے دھیلے دھیلے کے لیے بے ایمانی کروالو۔ مٹھی بھر اناج کے لیے لاٹھیاں چلوالو۔ گراوٹ کی یہ انتہا ہے جب آدمی شرم اور عزت کو بھول جاتا ہے۔''

(گئو دان صفحہ 598)

اس اندوہناک حالت میں ان پریشان حال دیہاتیوں پر جن کی بدحالی کا باعث شہر اور شہروں کی فیشن پرستی ہے۔ کیا نفرت کی بجائے رحم نہیں آتا۔ کیا ان سے ہمدردی نہیں پیدا ہوتی۔ اس حالت میں وہ بڑے سے بڑا گناہ بھی کردیں تو قابل معافی ہیں۔ سزا کے مستوجب وہ نہیں بلکہ وہ ہیں جو انھیں اپنی اور دوسروں کی ہستی کو بھول جانے کے لیے مجبور کرتے ہیں اور یہ بھی بھول جانے کے لیے مجبور کرتے ہیں کہ وہ حیوان نہیں انسان ہیں۔ اور ان کے پہلو میں دل اور سر میں دماغ موجود ہے۔

دیہات کی جونکیں: دیہات کی اس نیم جاں لاش کو جو جونکیں چمٹی ہوئی اور اس کے خون کا آخری قطرہ تک چوس جانا چاہتی ہیں پریم چند نے ان کو بھی فراموش نہیں کیا۔ گئو دان کے ''پنڈت داتا دین، جھنگری شاہ، منگرو شاہ، پٹواری پٹیشوری اور کارندہ نوکھے رام، اور گوشئہ عافیت کے غوث خاں، فیض اللہ، بشیشر شاہ، تھانیدار دیا شنکر وغیرہ انھی جونکوں کی مختلف اقسام ہیں۔ دیہاتیوں کے جسم میں خون کا نام تک نہیں رہا۔ بے جان سے ہوگئے ہیں۔ اس بات سے انھیں کوئی غرض نہیں۔ وہ تو جب تک خون کا قطرہ ہے۔ ان کے جسم سے چمٹے رہیں گے۔ دیا دھرم، رحم و ہمدردی کا ان کے ہاں نام نہیں۔

ہوری کی گائے کو اس کا سگا بھائی زہر دے کر خود روپوش ہوگیا ہے۔ پولیس خانہ تلاشی کرنا چاہتی ہے۔ ہوری مرجاد کا پابند ہے۔ وہ نہیں چاہتا اس کے بھائی کے گھر تلاشی ہو۔ وہ اس کا دشمن ہی سہی، اس کی برسوں سے سینچی ہوئی آرزوؤں کو تباہ کرنے والا ہی سہی اس کی گائے کو زہر دینے والا ہی سہی، لیکن بھائی تو اسی کا ہے۔ کیا اس کی تلاشی سے اس کے کل کو طعنہ لگے گا، بھائی کی عزت کیا اس کی عزت نہیں؟

پٹواری پٹیشوری ہوری کی ایسی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ ہوری کے گھر کھانے کو اناج نہیں۔ اس کی فاقوں پر بسر ہوتی ہے۔ اس سے انھیں کیا وہ اس موقع سے اگر ہاتھ نہ رنگیں تو کیا کریں۔ تھانے دار سے کہتے ہیں، حضور تلاشی کی کیا ضرورت ہے اس کا بھائی آپ کی خدمت کو حاضر ہے دونوں آدمی ذرا الگ جا کر باتیں کرنے لگتے ہیں۔

''کیسا آدمی ہے''

''بہت غریب حضور روٹی کے لالے پڑے ہوئے ہیں؟

''سچ''

''ہاں حضور ایمان سے کہتا ہوں۔''

''ارے تو کیا ایک پچاسے کا بھی ڈول نہیں۔''

''کہاں کی بات حضور۔ دس بھی مل جائیں تو ہزار مجھیے پچاس تو پچاس جنم میں بھی ممکن نہیں۔ اور وہ بھی جب کوئی مہاجن کھڑا ہو جائے گا۔''

''داروغہ ذرا خدا ترس تھے۔ ایک منٹ تک سوچ کر بولے۔ تو پھر اسے ستانے سے کیا فائدہ میں ایسوں کو نہیں ستاتا۔ جو آپ ہی مر رہے ہوں۔''

پٹیشوری نے دیکھا نشانہ اور آگے جا پڑا۔ بولے نہیں حضور ایسا نہ کیجیے۔ نہیں پھر ہم کہاں جائیں گے۔ ہمارے پاس دوسری کون سی کھیتی ہے۔''

''تم علاقے کے پٹواری ہو جی کیسی باتیں کرتے ہو؟

''جب ایسا ہی کوئی موقع آجاتا ہے۔ تو حضور آپ کی بدولت ہم بھی کچھ پا جاتے ہیں۔ نہیں تو پٹواری کو کون پوچھتا ہے؟

''اچھا جاؤ تیس روپے دلوا دو بیس ہمارے دس تمھارے۔''

''چار کھیا ہیں اس کا تو خیال کیجیے۔''

''اچھا آدھے آدھ پر رکھو۔ لیکن کرو جلدی مجھے دیر ہو رہی ہے۔''

''پٹیشوری نے جھینگری سے کہا۔ جھینگری نے ہوری کو اشارے سے بلوایا۔ اپنے گھر لے گئے۔ تیس روپے گن کر اس کے حوالے کیے اور احسان سے دباتے ہوئے بولے۔'' آج ہی کاغذ لکھ دینا تمھارا منھ دیکھ کر روپے دے رہا ہوں۔ تمھاری شرافت کی وجہ سے۔''

(گئودان صفحہ 185)

اسے کہتے ہیں دوسرے کے گھر کو آگ لگا کر ہاتھ سینکنا۔ موت پر، غمی پر، نفع پر، نقصان پر، لڑائی پر، جھگڑے پر کوئی بھی موقع کیوں نہ ہو یہ دیہاتی جونکیں ان کا خون چوستی ہی رہیں گی۔ انھیں کسی کے جذبات سے غرض نہیں۔ کسی کی زبوں حالی سے مطلب نہیں۔ اس ظلم کے خلاف ذرا دھنیا کی چیخ وپکار بھی سنیے۔ جب ہوری روپے لیے جا رہا تھا تو اس نے بھانپ لیا۔ جھٹکا دیا۔ گانٹھ ہلکی تھی کھل گئی۔ جل کر بولی۔

"جس کے روپے ہیں اس کے جا کر دے دو ہمیں کسی سے ادھار نہیں لینا۔ میں دمڑی بھی نہ دوں گی چاہے مجھے حاکم کے اجلاس تک چڑھنا پڑے۔ ہم لگان کی باقی چکانے کے لیے 25 روپے مانگتے تھے تو کسی نے دیے نہیں۔ آج مٹھی بھر روپے نکال کر ٹھنا ٹھن دے دیے میں سب جانتی ہوں یہاں تو بانٹ بخرہ ہونے والا ہے۔ سبھی کے منہ میٹھے ہوتے ہیں یہ ہتھیارے گاؤں کے مکھیا ہیں کہ غریبوں کا خون چوسنے والے سود بیاج ڈیڑھی سوائی نذر نذرانہ، رشوت وشوت جیسے بھی ہو غریبوں کو لوٹو۔" (گئودان صفحہ 188)

اور ایسے ہی بیسیوں واقعات ہیں جن میں یہ لوگ پہلے انھیں پھنسا دیتے ہیں اور پھر ان کی بے بسی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تیس کے سود ملا کر تین سو پانچ ہو جاتے ہیں اور دیہاتی ساری عمر ان کی غلامی کرتے کرتے مر جاتا ہے۔ خدا جانے دیہات کی ان جونکوں کا کب خاتمہ ہوگا؟

آدرش گاؤں: چوگان ہستی اور گئودان میں پریم چند نے دیہاتوں کی تباہی کا نقشہ کھینچا ہے۔ صنعت و حرفت کی ترقی کے دور اور کارخانوں کے زمانہ میں جب ہندوستان میں بھی مشینوں کا شور و شغب سنائی دینے لگا ہے۔ پریم چند شہروں کے نواحی دیہات کی تباہی اور بربادی کا منظر دیکھتے ہیں۔ پانڈے پور بھی بنارس کے نواح میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہی تھا۔ اس کی بربادی کا حال پڑھ کر مشہور انگریزی نظم (Deserted Yillage) کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ گئودان میں دیہات کی جس تباہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ ہمارے موجودہ سسٹم کی خرابیاں زمینداروں اور ان کے کارندوں کے مظالم اور ساہوکاروں کی خون چوسنے والی سرگرمیاں ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ پریم چند کو ہمیشہ تاریکی ہی تاریکی دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے آدرش گاؤں کے خواب بھی دیکھے ہیں جن کی تعبیر آپ کو گوشۂ عافیت کے لکھن پور میں نظر آئے گی۔

مایا شنکر کی اس تقریر نے جو اس نے اپنے تعلقہ دار ہونے پر کی اس آدرش کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ پریم شنکر کے آشرم میں پلا ہوا نوجوان دیکھیے کیا آدرش پیش کرتا ہے۔

"میرا یقین ہے کہ مجھے کسانوں کی گردنوں پر اپنا جوار رکھنے کا کوئی حق نہیں۔ میں آپ سب کے سامنے ان حقوق سے دستبردار ہوتا ہوں جو پرانے اصولوں۔ رسم ورواج اور سوسائٹی نے مجھے دیے ہیں۔ میں اپنی رعایا کو اپنے حقوق کی ان زنجیروں سے آزاد کرتا ہوں۔ وہ نہ میرے آسامی ہیں نہ میں ان کا تعلقہ دار وہ سب میرے دوست ہیں۔ میرے بھائی ہیں بس ان کا کام ہر مہینے جا کر مختار کو اپنا لگان دے دینا ہے۔

''اور مجھے امید ہے کہ میرے بھائی آپس میں محبت سے رہیں گے اور بات بات میں عدالتوں کی طرف نہ دوڑیں گے۔''

اسی اعلان کے نتیجے کے طور پر ہم گوشۂ عافیت کے آخری صفحات میں آزاد اور فارغ البال لکھن پور کی تصویر دیکھتے ہیں۔

''مایا شنکر اپنے دورے پر ہیں۔ اسی سلسلہ میں لکھن پور بھی آئے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ وہی لکھن پور جو تباہی اور بربادی کا مسکن تھا اب بہار آفریں اور بہشت زار بن گیا ہے وہاں خوب رونق اور صفائی ہے۔ سبھی گھروں کے دروازوں پر سائبان لگے ہوئے ہیں۔ ان میں بڑے بڑے تخت بچھے ہیں۔ اکثر گھروں میں سفیدی ہوگئی ہے۔ پھوس کے جھونپڑے مفقود ہیں۔ اب سبھی گھروں پر کھپریل ہیں۔ دروازوں پر بیلوں کے لیے پکّی چرنیاں بنی ہوئی ہیں۔ ایک دو کے دروازوں پر گھوڑے بندھے نظر آتے ہیں۔ پرانے چوپال میں اسکول ہے۔ اور اس کے سامنے ایک پکا کنواں اور دھرم شالہ ہے۔ انھیں دیکھتے ہی سب اپنے کام چھوڑ کر دوڑے۔ مایا شنکر سکھو چودھری کے مندر پر رکتے ہیں۔ وہاں اس وقت بڑی بہار ہے۔ مندر کے سامنے سکھو چودھری بیٹھے ہوئے رامائن پڑھ رہے ہیں۔ اور عورتیں بیٹھی ہوئی سن رہی ہیں۔ مایا شنکر گھوڑے سے اتر کر چبوترے پر جا بیٹھتے ہیں۔ اور گاؤں کے آدمی انھیں گھیر لیتے ہیں۔''

یہ سب کایا پلٹ صرف دو سال میں ہوئی ہے۔ اب دیہاتیوں کی حالت سنیے۔ قادر میاں جنھیں مایا شنکر چاچا کہہ کر پکارتے ہیں۔ انھیں اپنی حالت بتاتے ہیں۔

''بٹیا اور کیا دعا دیں۔ روم روم سے تو دعائیں نکل رہی ہیں۔ مجھ کو ہی دیکھو پہلے بیس بگھے کا کاشتکار تھا سو روپے لگان دینا پڑتا تھا۔ دس بیس روپے سالانہ نذرانہ میں نکل جاتے تھے۔ اب کل بیس لگان ہے۔ اور نذرانہ لگتا نہیں۔ پہلے اناج کھلیان سے گھر تک نہ آتا تھا۔ آپ کے چپراسی کارندے وہیں گلا دبا کر تلوا لیتے تھے۔ اب اناج گھر میں بھرتے ہیں اور سہولت سے فروخت کرلیتے ہیں۔ دو سال میں کچھ نہیں تو تین چار سو روپے بچا لیے ہوں گے۔ ڈیڑھ سو کی ایک جوڑی بیل لایا۔ گھر کی مرمت کرائی۔ سائبان ڈالا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اب کسی کی دھونس نہیں۔ مال گذاری داخل کرکے چپکے سے گھر آجاتے ہیں نہیں تو ہر وقت جان سولی پر چڑھی رہتی تھی۔ اب اللہ کی عبادت میں بھی جی لگتا ہے۔ نماز بھی بوجھ

معلوم نہیں ہوتی۔" (گوشۂ عافیت)

اور یہی حال درگھن بھگت، سکھو چودھری، بلراج وغیرہ کا ہے۔ بلراج کے پاس تو ایک گھوڑا بھی ہے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کا وہ ممبر ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ جہاں کوئی اخبار کا نام بھی نہ جانتا تھا وہاں اب چھوٹی سی لائبریری بھی ہے۔ اچھے اچھے اخبار آتے ہیں۔ اخلاق بھی گاؤں والوں کا سدھر گیا ہے اور بلراج کے قول کے مطابق گاؤں میں اب رام راج ہے۔"

یہ ہے دیہاتوں کی حیثیت جس کے وہ خواب دیکھتے تھے۔

پریم چند کا کنج عافیت: آخیر میں اس کنج عافیت کی تصویر بھی دیکھیے جس میں مرحوم جا کر بسنا چاہتے تھے۔ ان کے ناول گوشۂ عافیت میں آپ کو اس کا بھی خاکہ دکھائی دے گا۔ اپنے اسی خط میں جس کا اقتباس میں نے مضمون کے شروع میں دیا ہے۔ منشی پریم چند نے لکھا تھا۔ شہروں میں اور خاص کر بڑے شہروں میں تو صحت زندگی سب تباہ ہو جاتے ہیں۔ قدرتی طور پر ان کا میلان دیہات کی طرف تھا۔ سکون کا متلاشی ان کا دل وہاں اُڑ کر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اور یہ خواہش اپنی زندگی کے آخری ایام میں ہی نہ تھی جیسا کہ شائد کچھ اصحاب بستر مرگ سے لکھے ہوئے ان کے ان الفاظ کو پڑھ کر سمجھیں بلکہ جب انھوں نے گوشۂ عافیت لکھا تب بھی ان کے دل کے کسی کونے میں یہ خواہش موجود تھی۔

دیہات کی جیسا کہ میں نے بتایا پریم چند نے دو تصاویر کھینچی ہیں۔ ایک حقیقی ہے دوسری آدرش حقیقی تصویر گئودان میں موجود ہے اور آدرش گوشۂ عافیت میں دیہات کی اسی آدرش تصویر میں انھوں نے اپنے لیے ایک کٹیا بھی بنائی تھی۔ ورنا ندی کے کنارے شہر اور اس کی چہل پہل سے دور حاجی پور میں یہ کٹیا بنی ہوئی ہے۔ ذرا اس کے بیرونی ماحول کی دلفریبی دیکھیے۔

> "پوس کا مہینہ ہے۔ کھیتوں میں چاروں طرف ہریالی چھائی ہوئی ہے۔ سرسوں، مٹر، گیہوں، السی کے نیلے پیلے پھول اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ کہیں شوخ طوطوں کے جھنڈ ہیں کہیں اچکے کوؤں کے غول۔ جگہ جگہ سارسوں کے جوڑ اہنسا (عدم تشدد) کی تصویر بنے اپنے خیال میں محو ہیں۔ دیہات کی حسین نازنیں سروں پر گھڑے رکھے ندی سے پانی لا رہی ہیں۔ کوئی کھیت میں بتھوئے کا ساگ توڑ رہی ہے۔ کوئی بیلوں کے لیے ہریالی کا گٹھا سر پر رکھے آ رہی ہے۔ پُرسکون، سادگی زندگی کی پاکیزہ تصویر ہے۔ شہری چہل پہل شور وشغب دوڑ دھوپ کے سامنے یہ سکون۔ یہ شانتی بے حد مسرت زا اور دل کو ٹھنڈک پہنچانے والی محسوس ہوتی ہے۔" (گوشۂ عافیت)

اور دیہات کی ایسی ہی پُرسکون فضا میں ندی کے کنارے مرحوم پریم چند اپنی کٹیا بنانا چاہتے تھے۔ اپنے آخری خط میں بھی انھوں نے اسی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ لیکن ہم جو سوچتے ہیں وہ کب ہوتا ہے؟ اور جو ہوتا ہے اسے ہم کب چاہتے ہیں۔ ان کا یہ آدرش بھی آدرش ہی رہا اور عملی جامہ نہ پہن سکا!

انسان کا دل

انسان کا دل ایک رازِ سربستہ ہے۔ کبھی تو وہ لاکھوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا اور کبھی چند پیسوں پر پھسل جاتا ہے۔ کبھی صدہا بے گناہوں کے خون پر اُف تک نہیں کرتا اور کبھی بچے کو دیکھ کر رو دیتا ہے۔ جلوۂ ایثار

پریم چند

مل مزدور فلم کیسے بنی؟

(سریجت للت کمار کا لکھا ہوا)

بعض دوستوں کا خیال ہے کہ منشی پریم چند فلم کی دنیا میں ناکامیاب رہے۔ مگر جب تک پروڈیوسر سینیریو[1] بناتے وقت افسانہ کی نزاکت اور افسانہ نویس کے دلی خیالات نہ سمجھ لے اس کو کبھی کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ سرت چندر کو سمجھنے کے لیے بروا جیسے ڈائرکٹر کی ضرورت ہے تبھی ''دیوداس'' ایک کامیاب فلم بن سکا۔ اس لیے جب تک پریم چند کی کہانیوں کو پسند کرنے والے ٹیکنیشین[2] اور پروڈیوسر پیدا نہیں ہوجاتے فلمی دنیا میں ان کے قصوں کا سرا اونچا نہیں ہوسکتا۔ جب پریم چند جی کا ''سیوا سدن'' بازار حسن بنا دیا گیا، اور یہ فلم پہلے پہل بمبئی کی امپیریل سینما ہاؤس میں چلائی گئی تو میں موجود تھا۔ بڑی ناامیدی ہوئی۔ پریم چند جی سے ملاقات ہونے پر میں نے اس کی وجہ پوچھی۔ انھوں نے کہا ''بھائی مجھ سے کتاب کا کاپی رائٹ مانگا گیا میں نے اسے دے دیا۔ اب اگر فلم بنانے والے اسے اچھی طرح کامیاب نہ بنا سکیں تو میرا کیا قصور؟ بات درست تھی۔ سدرشن جی کے ''دھوپ چھاؤں'' کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی تھی۔

اپریل 1934ء میں پریم چند جی کو بمبئی کی اجنتا سینے ٹون نے بڑے چاؤ سے بلایا اور ایک برس کے لیے معاہدہ ہوا۔ شاید نو ہزار میں معاملہ طے ہوا تھا، آخر مئی کو میں بھی وہاں پہنچا اور ان کی کرپا سے کمپنی کے ایکٹروں میں بھرتی کرلیا گیا۔ اس لیے ہر روز ان سے ملنے اور بات چیت کرنے کا موقع ملتا تھا۔

اس وقت وہ اپنی پہلی کہانی ''مل مزدور'' ختم کرنے میں مصروف تھے اور زیادہ تر اجنتا ہی کے لیے لکھتے تھے کہانی ختم ہوتے ہی انھیں اس کا اردو ترجمہ بھی کرنا پڑا۔ کیونکہ کمپنی کے مینجنگ ڈائرکٹر فلم ڈائرکٹر مسٹر بھونانی اور ان کے ساتھی مسٹر خلیل آفتاب بی۔ اے ہندی نہ جانتے تھے۔ پھر سنیریوں کی آسانی

اور بھونانی صاحب کی رائے کے مطابق کہانی میں کئی تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ کچھ نئی باتیں جوڑیں اور کچھ ہٹائی گئیں۔ جو شکل پہلے تجویز کی گئی تھی، اس کے تمام حصے الگ کر دیے گئے اور قصہ کو نئی شکل دی گئی۔ اس سے پلاٹ میں صرف تبدیلی ہی نہیں ہوئی بلکہ کئی جگہ اصل مطلب اور زبان کا لطف بھی فوت ہو گیا۔ اس کے بعد شوٹنگ شروع ہوئی، تصویر تیار کی جانے لگی اور کئی جگہ پھر تبدیلیاں ہوئیں۔ خیر دن رات محنت کر کے تقریباً تین ساڑھے تین مہینے میں تصویر تیار ہوئی۔ اندازاً ساٹھ ستر ہزار روپے اس میں لگے ہوں گے۔ اس فلم سے کمپنی کو بڑی بڑی امیدیں تھیں۔ کیونکہ تمام تبدیلیوں کے باوجود بھی کہانی کے اصل مطلب میں کوئی فرق نہیں آیا تھا اور اس میں ایک ایسے عام مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی تھی جس میں دولت مندوں یعنی مل کے مالکوں اور مزدوروں کی کشمکش نمایاں تھی۔ پریم چند کی اس پُر جوش تصنیف نے اس مسئلہ پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔ مالکوں کا ظالمانہ رویہ ان کی سختی، مالکوں کا من مانا برتاؤ مزدوروں کی خراب حالت، ان کی بہو بیٹیوں کی غیر محفوظ حالت اور اس کا نتیجہ۔ یہ سب باتیں بڑی صفائی اور قابلیت سے دکھائی گئی ہیں۔ ابھی تک ہندی میں اس موضوع پر کوئی فلم نہیں بنی تھی، اس کی زبان کے بارے میں لکھنا ہی فضول ہے کیونکہ اس کے لکھنے والے پریم چند جی تھے۔

اس فلم میں منشی پریم چند نے خود بھی پارٹ کیا ہے۔ کھیل کے ختم ہونے کے پہلے ایک نظارہ آتا ہے جس میں مزدوروں اور مل مالکوں کا جھگڑا نپٹانے کے لیے پنچایت بیٹھتی ہے۔ اس کے چودھری پریم چند جی ہی ہیں۔ دراصل ''اجنتا'' کا منتخب اسٹاف ہی اس میں شامل کیا گیا تھا۔ پوری تیاری کے بعد جب اس کا پرائیویٹ مظاہرہ ہوا تو ہم لوگوں کو اُمید ہوگئی کہ یہ تماشہ ملک میں نہایت مقبول ہوگا۔ کانگریس کے اجلاس پر اس کی افتتاحی رسم کسی لیڈر سے ادا کرانے کا خیال تھا، لیکن افسوس سنسر کی قاتل قینچی نے ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ ایک تو اتنی دیر ہوگئی کہ موقعہ ہی نکل گیا دوسرے اس بے رحمی سے کاٹ چھانٹ کی گئی کہ فلم کی دھجیاں اُڑ گئیں، کتنے ہی مؤثر نظارے کاٹ دیے گئے۔ کتنے ہی اتنے مختصر کر دیے گئے کہ ان کا مقصد ہی فوت ہو گیا۔ غرض فلم کا چہرہ ہی خراب ہو گیا۔

اس طرح سنسر کے بعد فلم بالکل برباد ہو گئی، آہ، بیچاری کمپنی کو نئے سرے سے دردِ سر مول لینا پڑا۔ کتنی ہی تصویریں دوبارہ لینی پڑیں۔ مگر سنسر کی تسلی نہ ہوئی اور اس نے نام بدلنے پر بھی مجبور کیا اور ''مل مزدور'' کے بجائے ''سیٹھ کی بیٹی'' نام تجویز کیا۔ پھر حکم ہوا کہ ان مقامات پر جہاں کارخانے نہ ہوں اس کو ریلیز کیا جائے۔ چنانچہ شاید پہلے صوبۂ پنجاب کی طرف یہ بدقسمت فلم ریلیز ہوئی۔ لیکن چند ہی مقامات پر

لے Scenario　　　ع ماہرفن

چلنے کے بعد پھر قینچی چلی، اور چیڑ پھاڑ ہوئی، کچھ اور بھی جاندار رگیں نکال ڈالی گئیں، کئی حصوں کے خاص خاص حصوں کو گھٹا دیا گیا۔ کہیں کہیں اصلی ہڈی نکال کر کاٹھ کی نقلی ہڈی لگا دی گئی۔ اب جو چیز سامنے ہے لوگ دیکھتے ہیں اور سر دھنتے ہیں۔

اب ناظرین ہی فیصلہ کریں کہ پریم چند جی اس لائن میں خود ناکامیاب ہوئے یا ناکامیاب بنائے گئے۔ "مل مزدور" کے علاوہ پریم چند جی نے اور بھی تین چار کہانیاں لکھیں جن کے فلم اجنتا والوں نے بنائے ہیں لیکن وہ چمک کسی میں نہ آئی۔

پریم چند کی زندگی اور تصنیفات پر ایک نظر

از سید علی جوادزیدی

امارت اور آسودہ حالی، غربت پر خندۂ تحقیر کرتی ہے لیکن اس کے باوجود امارت کو وہ فخر کہاں نصیب جو غربت کو حاصل ہے۔ غربت ہی کی زرخیز زمین سے ایسے ایسے جواہر بے بہا نکلے جو دنیا میں آسمان کے درخشاں ستاروں سے بھی زیادہ چمک دار ثابت ہوئے۔ غربت ہی کے ماحول میں منشی دھنپت رائے معروف بہ ''نواب رائے'' و ''پریم چند'' پیدا ہوئے۔ اس کی پست ذہنیت کے خلاف قولاً وفعلاً دونوں طرح سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش میں انھوں نے اپنی زندگی بسر کردی۔ پریم چند اپنے مشن میں کامیاب ہوئے اور ہماری بدلی ہوئی ذہنیت ان کے بار احسان سے ہمیشہ جھکی ہوئی رہے گی۔

منشی پریم چند ذات کے سریواستو کایستھ تھے اس صوبے کے دیہاتوں میں عموماً کایستھوں کی قوم اور خصوصاً سریواستو صاحبان مسلمانوں سے میل جول رکھنے میں سب سے پیش پیش ہیں چنانچہ انھیں عموماً فارسی اور اردو سے بہت محبت ہوتی ہے۔ پریم چند بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھے۔ وہ بنارس کے قریب ایک گاؤں میں ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے جو موجودہ فرقہ پرستی کے دور سے بہت دور تھا۔ 1880ء میں ملک میں باہمی جنگ وجدال کا یہ جذبہ موجود نہ تھا جو آج موجود ہے۔ اپنے ہی پیدا کردہ کردار کی زبان سے جس کا نام بھی وہ اپنے افسانہ ''چوری'' میں ظاہر کرنا پسند نہیں کرتے یہ الفاظ ادا کراتے ہیں:۔

''دوسرے گاؤں میں ایک مولوی صاحب کے یہاں پڑھنے جایا کرتا تھا.......... میری عمر آٹھ سال کی تھی.......... علی الصباح جو کی روٹیاں کھا کر.......... روانہ ہوجاتے تھے۔ مولوی صاحب کے یہاں حاضری کا رجسٹر تو تھا ہی نہیں...... پھر خوف کس بات کا؟ کبھی تو تھانے کے سامنے کھڑے سپاہیوں کی قواعد دیکھتے، کبھی کسی ریچھ یا بندر نچانے والے مداری

کے پیچھے پیچھے گھومنے میں دن گزار دیتے۔ کبھی ریلوے اسٹیشن کی طرف جاتے اور گاڑیوں کی بہار دیکھتے........ کبھی ہم ہفتوں غیر حاضر رہتے مگر مولوی صاحب سے ایسا بہانہ کر دیتے کہ ان کی چڑھی ہوئی تیوریاں اُتر جائیں۔''

اس تصویر میں کچھ مبالغہ کی رنگ آمیزی اور مصنفانہ اضافے ہو سکتے ہیں لیکن یہ اس بچے کی فطرت کی جیتی جاگتی تصویر ضرور ہے۔ جو اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ''مولوی صاحب'' کے یہاں جاتا ہے۔ ''کھیلنا'' اور ''پڑھنا'' یہ دو کام اس کے سامنے ہیں۔ دو متضاد جذبات میں جنگ ہوتی ہے۔ بالآخر طفلانہ فطرت اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ اور وہ کھیلنے میں مشغول ہوتا ہے۔

اس موقع پر ناظرین کے دلوں میں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہو رہا ہوگا کہ اس بچہ کے ایام طفولیت کیوں کر گذرے؟ کیا بتاؤں اس وقت کے حالات تو وہی بتا سکتا ہے جس نے ان کا بچپن دیکھا ہو۔ لیکن بھلا اس وقت کون جانتا ہوگا کہ یہ بچہ آگے چل کر اتنی عظیم الشان شخصیت کا مالک ہوگا لیکن پریم چند کے حساس دل میں ان دنوں کی یاد باقی تھی۔ وہ ان کا تذکرہ کرتے ہیں اور دل پر ایک خاص اثر لے کر کرتے ہیں۔ اسے اب انھیں کے الفاظ میں سنئے:۔

ہائے بچپن تیری یاد نہیں بھولتی! وہ کچا گھر........ وہ برہنہ پا، برہنہ جسم، کھیتوں میں گھومنا، آم کے درختوں پر چڑھنا، ساری باتیں نگاہوں میں پھر رہی ہیں گٹھیلے جوتے پہن کر اس وقت جو خوشی ہوتی تھی اب فلیکس کے جوتوں سے بھی نہیں ہوتی۔ گرم تیلے رس میں جو لذت تھی وہ اب گلاب کے شربت میں بھی نہیں۔ چربن اور کچے بیروں میں جو ذائقہ ملتا تھا وہ اب شیر برنج اور انگوروں میں بھی نہیں ملتا۔''

یہ ڈاک خانہ کے ملازم کا بیٹا ایک اور واقعہ کی طرف اپنے افسانہ ''قزاقی'' میں اشارہ کرتا ہے جس سے کیا عجب ہے اس کے بچپن کا ایک دھندھلا سا خاکہ آنکھوں کے سامنے پھر جائے: ''قزاقی ذات کا پاسی تھا........ روزانہ ڈاک کا تھیلہ لے کر آتا........ جب وہ دوڑتا تو اس کے بلم کے گھنگھرو بجنے کے بعد اس بچے کی کیا حالت ہوتی تھی:۔

''میرا دل فرطِ مسرت سے زیادہ اچھلنے لگتا۔ خوشی کی اُمنگ میں میں بھی دوڑ جاتا اور ایک لمحہ میں قزاقی کا کندھا میرا سنگھاسن بن جاتا۔ وہ مقام میری تمناؤں کا بہشت تھا۔ بہشت والوں کو بھی شاید وہ متحرک سرور نہ ملتا ہوگا جو مجھے قزاقی کے چوڑے کندھوں پر ملتا تھا۔ دنیا میری نگاہوں میں ہیچ ہو جاتی اور جب قزاقی مجھے اپنے کندھوں پر لیے دوڑنے لگتا تب تو ایسا معلوم ہوتا کہ گویا میں ہوا کے گھوڑے پر اُڑا چلا

جارہا ہوں۔"

یہی نہیں بلکہ اس بچے میں محبت، ہمدردی، ایثار وغیرہ کے جو جذبات موجود ہیں وہ کھلے بندوں یہ بتا رہے ہیں کہ فسانہ نویس دراصل اپنا ہی کردار پیش کر رہا ہے۔ صرف تخیل نے کہیں کہیں اضافے کر دیئے ہیں۔ ایک غریب ہرکارے کو ملازمت سے علیحدہ ہوتے ہوئے دیکھ کر اس کے جوش گریہ کا عالم دیدنی ہوتا ہے۔ ماں کے پاس باپ کی فریاد لے جانا فطرت کے مطابق ہے۔ اسے قزاقی کے علیحدہ ہونے کا افسوس ہوا۔ پھر بھی وہ کہتا ہے کہ "کھانا تو میں نے کھالیا، کیونکہ بچے غم میں بھی کھانا نہیں ترک کرتے اور خصوصاً جب ربڑی بھی سامنے ہو۔" وہ بیٹھے بیٹھے سوچتا ہے کہ ایک عالیشان محل بنوائے گا جس میں اپنے منو (ہرن کے بچے) کے لیے ایک علیحدہ کمرہ اور پلنگ ہوگا۔ علیحدہ فٹن بھی۔ اسی طرح ہزاروں ہوائی قلعے بناتا اور بگاڑتا ہے۔"

پریم چند ابتدا ہی سے سخی واقع ہوئے بچپن ہی میں انھیں لوگوں کی تکلیفوں کا فوراً احساس ہو جاتا تھا۔ اور ان کے دل میں اس قسم کے سوالات پیدا ہوتے تھے کہ "بیچارہ روکھی روٹیاں کیسے کھائے گا؟" ان کے دل میں یہ امنگ پیدا ہوتی تھی کہ ان کے پاس جو کچھ ہے (چاہے وہ "چار ہی پیسے" کیوں نہ ہوں) وہ مستحق کو دے دیں۔ مگر انھیں اپنی بے بضاعتی پر شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی عجیب وغریب ہے کہ پریم چند کو بچپن میں پیسے جمع کرنے کی عادت تھی۔ اور انھیں محفوظ رکھنے میں وہ خوشی محسوس کرتے تھے۔ لیکن بچپن کے ساتھ ہی اس نیک عادت نے بھی منھ موڑا۔ اس کا احساس پریم چند کو بھی تھا چنانچہ اسی افسانے میں وہ اپنے ننھے کردار سے کہلواتے ہیں کہ:۔

"معلوم نہیں اب وہ عادت کیوں تبدیل ہوگئی۔ اب وہی حالت رہتی تو شاید اس قدر فاقہ مست نہ رہتا۔"

پریم چند جی اپنی طفلانہ مسرتوں کا اکثر مواقع پر اظہار کرتے ہیں۔ کہیں جب بوآن نکلتا ہے تو رام چندر جی کے پیچھے بیٹھ کر یہ محسوس کرتے ہیں کہ میں "جنت میں بیٹھا ہوں"۔ کبھی وہ گلی ڈنڈا کھیلنے میں مصروف ہو جاتے ہیں اور بوان نکلتا ہے۔ مگر وہ کھیلنا نہیں چھوڑتے کیونکہ انھیں اپنا داؤں لینا تھا اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ "اپنا داؤں چھوڑنے کے لیے اس سے کہیں زیادہ ایثار کی ضرورت تھی جتنا میں کر سکتا تھا۔" غرض کہ اس طرح کی سیکڑوں باتوں کا وہ جابجا اظہار کرتے ہیں۔ دیہاتی زندگی ایک بچے کے لیے جتنے مسرت کے سامان مہیا کر سکتی ہے وہ سب سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ ان کے دل سے ان باتوں کی یاد نہیں جاتی بلکہ وہ تنہائی کے لمحوں میں ان گذرے ہوئے دنوں کی یاد سے اپنے دل کو خوش کرتے ہیں۔

ممکن ہے کہ سطور بالا پر سرسری نگاہ دوڑانے والے یہ خیال کریں کہ یہ کیوں کر مان لیا جائے کہ ان افسانوں میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا تعلق ان کی زندگی سے ہے؟ یہ سوال بادی النظر میں تو بہت اہم ہے لیکن وہ لوگ جو تصنیف اور مصنف کے گہرے تعلق سے واقف ہیں وہ غالباً اسے قابل اعتنا بھی نہ سمجھیں گے۔ پریم چند کی تصانیف کا بغور مطالعہ کرنے والے اس امر میں میری تائید کریں گے کہ پریم چند کے افسانے ان کے صریع الاثر اور ذکی الحس ہونے کی وجہ سے لکھے جا سکے ہیں۔ ان کے افسانوں کا ایک ایک لفظ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں اسے بے دھڑک الفاظ کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ ان کی کیفیت بالکل اس شاعر کی ہے جس نے کہا ہے کہ۔

حرفے زدرد دل کشم دبر زبان زنم
نبود غرض بہ شعر زاظہار فن مرا

(مولوی نجم مرحوم چریا کوٹی)

یا جیسا کہ نظیری نے کہا ہے کہ۔

ایں دفتر بے ربط کہ دیوان فقیر است
مجموعۂ احوال پریشان فقیر است

ہر بڑے شاعر یا بڑے ادیب کی زندگی اس کی تصنیفات کے پردہ میں صاف طور سے دکھائی دیتی ہے۔ خود شعرا اور ادبا کو بھی اس کا احساس رہتا ہے چنانچہ ایک بڑے ادیب کا قول ہے کہ "اگر مجھے دیکھنا چاہتے ہو تو میرے تصنیفات کے پردے میں دیکھو" پریم چند بھی انھیں بڑے مصنفین میں ہیں۔ پھر وہ جس زور اور یقین اور تمام جزوی تفصیلات کے ساتھ واقعات بیان کرتے ہیں۔ اور بچوں کے خیالات کے تجربہ میں جس احتیاط سے کام لیتے ہیں ان کو حقیقی زندگی کا جو رنگ دیتے ہیں، اور دیہات کی جو مانوس فضا پیدا کرتے ہیں۔ ان سب باتوں سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ ان واقعات میں انھیں کا بچپن منعکس نظر آتا ہے۔ صرف ایک بات رہ جاتی ہے کہ آیا یہ باتیں حرف بحرف صحیح بھی ہیں یا نہیں؟ اس کے لیے ہم کو ایک معیار قائم کرنا پڑے گا۔ ہم کو طفولیت کے واقعات تو زیادہ معلوم نہیں لیکن جوانی اور آخر عمر کے حالات معلوم ہیں۔ میں نے ان واقعات کا اپنی جگہ پر تطابق کیا ہے اور صرف انھیں واقعات یا عادات کا تذکرہ کیا ہے جو ان کی بعد کی زندگی میں بھی اکثر و بیشتر پیش آئے۔ بہر حال اس مضمون میں میں نے اس بات کی امکانی کوشش کی ہے کہ جو کچھ لکھوں وہ صداقت کے راستے سے الگ نہ ہو۔ جہاں مجھے ذرا بھی شک تھا وہاں میں نے صاف لکھ دیا ہے کہ اس میں مصنفانہ اضافے ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ بھی اسی طرح ان کا

مطالعہ کریں گے تو لطف بھی دوبالا ہو جائے گا اور وہ واقعات جو عموماً نگاہوں سے نہاں ہیں نظر کے سامنے آجائیں گے۔ کسی مصنف کی تصنیف سے حقیقی مسرت اور لذت حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے۔ گولڈ اسمتھ کا دکار آف ویک فیلڈ (Vicar of Wakefield) یا ڈزرٹڈ ولج (Deserted Village) دیکھیے، ڈکنس کے مشہور کیریکٹر (Copper Field David) کا مطالعہ کیجیے۔ ایچ۔ جی۔ ویلس کے ناولوں اور افسانوں پر نظر دوڑایئے ہر جگہ مصنفین کی شخصیت اپنے اصلی لباسوں میں نظر آجاتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ فن کی نزاکت قائم رکھنے کے خیال میں کچھ کمی بیشی کردی گئی ہو۔ تھیکرے نے گولڈ اسمتھ یا جوناتھن سوفٹ (Gold Smith یا Jonathan Swift) کی سوانح عمری کے متعلق اپنے لکچر میں اس بات کو نمایاں طور پر ظاہر کیا ہے کہ مصنف کی زندگی اس کے تصانیف پر بہت بڑی حد تک اثر انداز ہوتی ہے۔ بشرطیکہ مصنف کے احساسات شدید ہوں اور اس میں بیان کی پوری قوت بھی ہو۔

منشی پریم نے آٹھ سال تک فارسی اور اردو ادبیات کی تعلیم حاصل کرکے دونوں زبانوں میں اچھی خاصی مہارت بہم پہنچائی تھی۔ انھیں ابتدائے عمر ہی سے ادبیات سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ انھوں نے چودہ برس کے سن میں اردو کا ڈرامہ لکھا تھا جس کا نام بھی لطف سے خالی نہیں ہے۔ غالباً یہ تائید غیبی تھی کہ اس کا نام ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات'' رکھا گیا تھا۔ چار سال بعد ناول ''اسرار محبت'' اخبار ''آواز خلق''[1] میں شائع ہوا جو بنارس سے نکلتا تھا۔ اس طرح اردو اور فارسی میں کافی مہارت بہم پہنچانے کے بعد پریم چند انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ مگر مدرسہ میں داخل ہوتے ہی ان کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ ماں کی ہستی کوئی معمولی ہستی نہیں ہوتی ''باپ'' کی حکومت گھر کے باہر رہتی ہے مگر گھر کے اندر جو کچھ ہے ''ماں'' کا تابع فرمان ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ''ماں'' محبت کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ پریم چند کو اس کا بہت زیادہ احساس ہے۔ چنانچہ وہ اپنے افسانہ ''مندر'' میں ایک جذباتی پیرایہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

''مہر مادری، تجھے آفرین ہے! دنیا میں اور جو کچھ ہے باطل ہے، پیچ ہے، مہر مادری ہی حق ہے، غیر فانی ہے، لازوال ہے۔''

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ پریم چند کو اپنی والدہ کی دائمی مفارقت کس قدر شاق گذری ہوگی۔ ماں کی جو عظمت ان کے دل میں تھی اس کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ پریم چند کے دل پر اس حادثہ کا زبردست اثر پڑے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ''ماں'' کے متعلق اس قسم کے خیالات رکھتا ہو کہ:۔

---

[1] نوٹ:۔ ناول کا نام تھا ''اسرار معابد'' اور ہفت روزہ کا نام تھا ''آوازۂ خلق'' یہ 8 را کتوبر 1903ء سے یکم فروری 1905ء تک قسط وار شائع ہوا تھا۔ (مانک ٹالا)

''ماں، تو دھنیہ ہے! تیری سی عقیدت، تیری سی وفا کا دیوتاؤں میں بھی ہونا امر محال ہے!''

وہ اپنی ماں سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوکر کس قدر پژمردہ اور بے چین نہ ہوا ہوگا۔ مگر ''بدنصیبی کبھی تنہا نہیں آتی۔'' ابھی پریم چند نویں دسویں درجہ ہی میں پہنچے تھے کہ ان کے باپ کا سایہ بھی ان کے سر سے اُٹھ گیا۔ اور پریم چند یتیم ہو گئے۔ خدا جانے ایسا کیوں ہے مگر اکثر دیکھا گیا ہے کہ یتیمی کا داغ شہرت کی پیشانی کا ستارہ بن جاتا ہے۔ دنیا کی بڑی بڑی ہستیوں میں اکثر لوگوں کو اوائل عمر ہی میں اس غم سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ پریم چند کو بھی یہ امتحان دینا پڑا مگر خدا کا شکر ہے کہ اس میں کامیاب ہوئے اور انھوں نے اس مصیبت کا پامردی اور استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا۔ انھوں نے اپنی تعلیم جاری رکھی اور کسی نہ کسی طرح اپنے ادبی ذوق کی تکمیل بھی کرتے رہے۔ یہ تمام باتیں کسی نہ کسی پیرایہ میں ان کی تصانیف میں مذکور ہیں۔ اپنے افسانے ''شکست کی فتح'' میں وہ اپنے مرکزی کردار کی زبانی یہ الفاظ ادا کراتے ہیں:۔

''میں آزاد تھا، میرے والدین مجھے بچپن ہی میں چھوڑ کر رخصت ہو گئے تھے۔''

اسی طرح اپنے افسانے ''نیک بختی کے تازیانے'' میں نتھوا کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ:۔

''نتھوا کے ماں باپ دونوں مر چکے تھے۔''

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے اپنی ہی زندگی سے متعلق لکھ رہے ہیں۔ اور پھر جس لڑکے کے ماں باپ دونوں مر چکے ہوں، کوئی سہارا نہ ہو وہ اگر کیلاش کی بابت مندرجہ ذیل خیالات کا اپنے افسانہ ''ڈگری کے روپے'' میں اظہار کرتا ہے تو کوئی تعجب نہیں۔

''کیلاش کو اپنے ہاتھوں سے کنواں کھود کر پانی پینا تھا جس کے خیال ہی سے اس کا دل پریشان ہو جاتا تھا۔''

بہر نوع پریم چند نے کسی نہ کسی طرح انٹرنس تو پاس کر لیا۔ مگر انگریزی تعلیم اور وہ بھی کالج کی تعلیم کے لیے روپیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ پریم چند کو مالی دشواریاں درپیش تھیں چنانچہ انھوں نے ایک ٹیوشن کر لی۔ جس کا تذکرہ بھی ان کے افسانوں میں ملتا ہے۔ ان کے افسانہ ''شکست کی فتح'' میں لجیاوتی کی زبان سے یہ الفاظ نکلے ہیں:۔

''بابو جی نے محض اپنی محنت اور کوشش سے پرائیویٹ ٹیوشن کر کے یہ درجہ حاصل کیا۔''

ان کے دوسرے افسانہ ''لال فیتے'' کی مندرجہ ذیل سطروں میں ہری بلاس کی جگہ پریم چند کو سمجھ لیجیے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ یہ انھیں کی آپ بیتی ہے:۔

''مگر ہری بلاس کا شوق طلب اس گرمی اور سردی سے مستغنی تھا۔ اس عزم قوی کے ساتھ جو

اکثر نادار طلباء کا مایہ الامتیاز ہے وہ کالج میں داخل ہوگیا اگرچہ وہ ایک رئیس کے لڑکے پڑھا کر تعلیمی مصارف نکال لیا کرتا تھا۔ مگر وقتاً فوقتاً اسے یک مشت رقموں کی ضرورت ہوتی تھی۔"

اس کی تصدیق اس مضمون سے بھی ہوتی ہے جو ناظر کاکوروی نے "کائنات" میں لکھا ہے اور اس مقالے سے بھی جو منشی دیانرائن صاحب نگم نے "زمانہ" میں تحریر فرمایا ہے۔ مدیر زمانہ نے تو اس ٹیوشن کی تعداد بھی لکھ دی ہے کہ یہ پانچ روپیہ ماہوار کی ٹیوشن تھی۔ اس قلیل رقم کو دیکھیے اور اس کو خیال کیجیے کہ نامساعدت زمانہ نے اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ نصف پریم چند کو ملا کرتا تھا اور نصف وہ اپنے متعلقین کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔ جس میں سوتیلی ماں، بھائی اور ننہال کے بعض لوگ شریک تھے۔ ان کا بار کفالت پریم چند ہی کے کاندھوں پر تھا۔ بالآخر مجبور ہو کر انھیں ایک اسکول میں اٹھارہ روپیہ ماہوار کی ملازمت قبول کرنا پڑی۔ اس طرح فکر معاش سے نجات ملی اور حصول تعلیم کی تمنا جو ایک دبی ہوئی چنگاری کی شکل میں ہوگئی تھی یکا یک شعلہ فشاں ہوئی۔ 1905ء میں وہ ٹریننگ کالج میں داخل ہوگئے۔ 30/ جنوری 1905ء اور 20/ فروری 1905ء کے دو خطوط سے جو پریم چند نے مدیر "زمانہ" کو لکھے ہیں ظاہر ہوتا ہے کہ وہ الہ آباد ٹریننگ کالج کے ماتحت ماڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہوگئے تھے اور کچھ دنوں پرتاپ گڑھ میں گورنمنٹ ہائی اسکول سے وابستہ رہے۔ پرتاپ گڑھ سے ان کا تبادلہ کانپور ہوگیا۔ کانپور آنے کے بعد مدیر "زمانہ" اور ان سے برادرانہ تعلقات ہوگئے۔ اور منشی پریم چند مستقل طور سے "زمانہ" کے قلمی معاونین میں شریک ہوگئے۔ ملازمت میں بھی ترقی کی راہیں ان کے لیے مسدود نہ ہوئیں۔ چنانچہ رفتہ رفتہ سب ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ اس زمانہ میں "سوز وطن" کے نام سے ان کا مجموعہ شائع ہوا جس پر گورنمنٹ نے ان کو فہمائش کی اور انھیں "نواب رائے" کا فرضی نام ترک کرنا پڑا اور اس کی پاداش میں ان کا تبادلہ ہمیر پور سے بستی کر دیا۔ سب ڈپٹی انسپکٹر ہونے کے یہ معنی ہیں کہ انسان کی زندگی مسلسل دورہ بن جاتی ہے۔ پریم چند اس سے عاجز آچکے تھے چنانچہ انھوں نے اپنی خدمات نارمل اسکول گورکھپور میں منتقل کرالیں۔ اور اس وقت تک اسی اسکول میں فرائض متعلقہ انجام دیتے رہے جب تک کہ گاندھی جی کی تحریک ترک موالات پر لبیک کہہ کر سرکاری ملازمت سے مستعفی نہ ہوگئے۔

(2)

یہ ان کا تعلیمی دور تھا جس کے اکثر تاثرات ان کے افسانوں میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ان کا افسانہ "توبہ" اس طرح شروع ہوتا ہے:-

(1) "جب میں اسکول میں پڑھتا تھا تو گیند کھیلتا تھا۔ اور ماسٹروں کی دھمکیاں سہتا تھا، یعنی سیر اسپین کا زمانہ تھا۔ نہ عقل کا ظہور ہوا تھا نہ دانائی کی نشو و نما۔"

اس کے بعد اسی افسانہ میں لکھتے ہیں:۔

(2) "میرے کتنے ہی دوست اس قدر مستقل مزاج نہ تھے۔ میرا چال چلن نہایت اعلیٰ سمجھا جاتا تھا۔"

اس کے علاوہ ان کا پورا افسانہ "مایۂ تفریح" کالج کی "خوش فعلیوں" کے ذکر سے بھرا ہوا ہے لڑکے ایک دوسرے کو کس طرح اُلو بناتے ہیں۔ اور جو لوگ ذرا "بدھو" ہوتے ہیں ان کے خلاف کیسی کیسی سازشیں کی جاتی ہیں۔ بقول پریم چند:۔

"وہاں بیشتر طلبا تو معاش کی فکر سے آزاد ہوتے ہیں۔ انھیں خوش وقتی، خوش گپی اور خوش گذاری کے سوا وہاں اور کوئی شغل نہیں رہتا.......... اگر کوئی صاحب دھرم کرم کے پابند ہوں اور پوجا پاٹ کرنے میں منہمک رہتے ہیں۔ بلا ناغہ نمازیں ادا کرتے ہیں تو انھیں مایۂ تفریح بننے میں دیر نہیں لگتی۔ اگر کوئی صاحب کتابوں کے عاشق ہیں۔ مطالعہ میں سعی بلیغ کرتے ہیں تو سمجھ لیجیے ان کی تضحیک کے لیے کسی گوشہ میں سازشیں ہو رہی ہیں۔"

اپنے افسانہ "آخری حیلے" میں لکھتے ہیں:۔

"میرا حافظہ بہت قوی نہیں۔ تاریخ دنیا کی ساری اہم تاریخیں فراموش ہو گئیں۔ وہ ساری تاریخیں جنھیں راتوں کو جاگ کر، جبر ڈال کر یاد کی تھیں۔"

ممکن ہے کہ اس بیان کے جز و اول کو صحیح تسلیم نہ کیا جائے مگر یہ تو صاف ظاہر ہے کہ پریم چند نے تاریخ کے مشہور سنوات، راتوں کو جاگ کر، جبر ڈال کر یاد کیے ہوں گے اور جب تک کوئی شخص غیر معمولی دماغ لے کر نہ آیا ہو۔ ایک ہی نظر میں تاریخ کے ان سنوان کا یاد ہو جانا کوئی ہنسی ٹھٹھا نہیں ہے۔

انھوں نے اسکول کی ملازمت کا نقشہ بھی ناظرین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ پہلے پہل وہ اٹھارہ روپئے پر ملازم ہوئے تھے۔ قلیل تنخواہ والے مدرسین کا حال خود ان کی زبانی ملاحظہ فرمائیے۔

"پنڈت چندر دھر نے ایک پرائمری مدرسہ کی مدرسی کر تو لی تھی مگر ہمیشہ پچھتایا کرتے تھے کہ ناحق اس جنجال میں آ پھنسے۔ اگر کسی اور صیغہ میں ہوتے تو اب تک ہاتھ میں چار پیسے ہوتے، آرام سے زندگی بسر ہوتی۔ یہاں مہینہ بھر کے انتظار کے بعد کہیں پندرہ روپئے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ بھی ادھر آئے اُدھر غائب! نہ کھانے کا سکھ نہ پہننے کا آرام۔"

اس میں پریم چند کی زندگی کے مکمل نقوش موجود ہیں اور ان کے دلی احساسات وجذبات کی پوری عکاسی اس اقتباس میں ہوتی ہے۔

ان کے ایک افسانہ میں ایک سب ڈپٹی انسپکٹر کا بھی تذکرہ ہے جن کی سفارش پر ایک اچھوت اسکول میں داخل ہو گیا تھا۔ مگر نہیں کہا جا سکتا کہ پریم چند کی زندگی میں کبھی ایسا واقعہ پیش آیا تھا یا نہیں۔

جس واقعہ نے ان کی درس وتدریس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ وہ غیر معمولی طور پر اہم ہے۔ اس کے متعلق پریم چند نے کئی جگہ لکھا ہے "فتح چند" کا استعفیٰ اسی بنا پر تھا وہ کسی افسر کے سامنے ذلت گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ گو "لال فیتہ" کے ہیرو ہری بلاس صیغۂ تعلیم میں ملازم نہ تھے لیکن تھے سرکاری ملازم اور ضلع کے انتظامی امور کے ذمہ دار۔ بہر کیف ان کے استعفیٰ کے الفاظ قابل ملاحظہ ہیں:۔

"جناب من! میرا عقیدہ ہے کہ نظام سلطنت مشیت ایزدی کی ظاہری صورت ہے اور اس کے قوانین بھی رحم، حق اور انصاف پر قائم ہیں۔ میں نے پندرہ سال تک سرکار کی خدمت کی اور حتی الامکان اپنے فرائض کو دیانت داری سے انجام دیا۔ ممکن ہے بعض موقعوں پر حکام مجھ سے خوش نہ رہے ہوں اس لیے کہ میں نے شخصی احکام کی اطاعت کو کبھی اپنا فرض نہیں سمجھا۔ جب کبھی میرے احساس قانون اور حکم حاکم میں تناقض ہوا" میں نے قانون کی پیروی کی۔ میں ہمیشہ سرکاری ملازمت کو خدمت ملک کا بہترین ذریعہ سمجھتا رہا لیکن مراسلہ نمبر.......... مورخہ.......... میں جو احکام نافذ کیے گئے ہیں وہ میرے ضمیر اور اصول کے مخالف ہیں۔ اور میرے خیال میں ان میں ناحق پروری کا اتنا دخل ہے کہ میں اپنے تئیں ان کی تعمیل کے لیے کسی حالت میں آمادہ نہیں کر سکتا۔ وہ احکام رعایا کی جائز آزادی میں مخل اور ان کی سیاسی بیداری کے قاتل ہیں۔

ان حالات پر نظر کر کے میرا اس نظام حکومت سے تعلق رکھنا ملک اور قوم کی بیخ کنی کرنا ہے۔ دیگر حقوق کے ساتھ رعایا کو سیاسی جدوجہد کا بھی حق حاصل ہے اور چونکہ گورمنٹ اس حق کو پامال کرنے کے در پے ہے لہٰذا میں ہندوستانی ہونے کے اعتبار سے یہ خدمت انجام دینے سے معذور ہوں اور استدعا کرتا ہوں کہ مجھے بلا مزید تاخیر اس عہدہ سے سبکدوش کیا جائے۔"

احباب نے استعفیٰ کی خبر سنی تو ہری بلاس کو سمجھانے لگے۔"

یہ ہری بلاس صاحب پریم چند اور ان کے خیالات کی شکل جامد کے سوائے اور کون ہو سکتے

ہیں۔ پریم چند نے احباب کی اس نصیحت کا جو جواب دیا ہے ان کے صحیح الفاظ کا تو علم نہیں ہے لیکن عقل مندوں کو اتنا ہی اشارہ کافی ہوگا کہ وہ خط نقل کر دیا جائے جو "وشومبھر" نے "آنند" کو لکھا تھا۔ اور پریم چند کے افسانہ "جیل" میں موجود ہے۔

"پیارے آنند مجھے بخوبی علم ہے کہ میں جو کچھ کرنے والا ہوں وہ میرے لیے فائدہ بخش نہیں ہے۔ لیکن نہ جانے کون سی قوت کھینچے لیے جارہی ہے میں جانا نہیں چاہتا لیکن جاتا ہوں۔ اسی طرح جیسے آدمی مرنا نہیں چاہتا اور مرتا ہے۔ رونا نہیں چاہتا لیکن روتا ہے۔ جب وہ سبھی لوگ جن کی ہمارے دلوں میں عزت ہے اوکھلی میں اپنا سر ڈال چکے تو میرے لیے بھی اب کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے میں اب اور اپنے دل کو دھوکا نہیں دے سکتا............ خدمت وطن کا تختہ اس سے کہیں اچھا ہے۔ یہ میری عزت کا سوال ہے اور عزت کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کر سکتی۔

تمہارا وشومبھر

(3)

ادبی حلقوں میں پریم چند کی عزت اس استعفیٰ کی بنا پر نہیں ہے۔ ترک موالات کے سلسلے میں ہزاروں سرکاری ملازموں نے استعفے داخل کر دیے تھے لیکن وہ اس عزت و احترام کے مستحق قرار نہیں دیے گئے۔ استعفیٰ دینے کا واقعہ تو صرف پریم چند سے ہماری ہمدردیوں کو بڑھاتا ہے۔ ان کی اصلی عظمت اور ان کا اصلی احترام جو ہمارے دلوں میں ہے وہ ان کی افسانہ نویسی کی بدولت ہے۔ ان کی علمی اور ادبی خدمات کی وجہ سے ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس مضمون میں پریم چند کی ادبی حیثیت پر بھی کچھ روشنی ڈالی جائے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پریم چند کی ادبی زندگی کب سے شروع ہوتی ہے؟ 1930ء میں بنارسی داس صاحب چترویدی نے پریم چند سے کئی سوالات کیے تھے منجملہ ان کے ایک سوال یہ بھی تھا کہ آپ نے افسانہ لکھنا کب سے شروع کیا؟ اس کے جواب میں پریم چند نے لکھا تھا:-

"میں نے سب سے پہلے 1907ء میں افسانے لکھے۔ 1908ء میں میرا "سوز وطن"

نوٹ:۔ یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ اس کی تصحیح میں نے ضمیمہ نمبر ا میں کر دی ہے　　(مانک ٹالا)

(جس میں پانچ افسانے تھے) زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا تھا۔ اسے ہمیر پور کے کلکٹر نے مجھ سے لے کر جلا ڈالا تھا کیونکہ ان کے خیال میں وہ انقلاب انگیز تھا۔ حالانکہ اس وقت سے اب تک مختلف رسالوں میں اس کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔"

لیکن منشی پریم چند کی ادبی زندگی اس سے بھی پہلے کی ہے۔ بقول مدیر "زمانہ":۔

"سال بھر کے اندر ہی اندر پریم چند جی سے جن کا اصلی نام دھنپت رائے تھا خط و کتابت شروع ہو گئی۔ جس کا نتیجہ ہوا کہ 1904ء کے آخر تک وہ بھی "زمانہ" کے قلمی معاونین میں شامل ہو گئے۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے آپ نے سب سے پہلے ایک تنقیدی مضمون جنوری 1905ء میں "زمانہ" میں شائع ہونے کے لیے اور ایک ناول کا مسودہ بہ غرض مشورہ بھیجا تھا۔ ناول کے لیے پبلشر کی تلاش تھی چنانچہ اس میں ذرا دیر ہوئی تو ایک شکایت نامہ بھی لکھا تھا.......... دو ہی سال کے بعد آپ کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول کانپور میں ہو گیا۔ ....اس طرح بے ضابطہ حیثیت سے آپ کو "زمانہ" کی اسسٹنٹ ایڈیٹری کی پوزیشن حاصل ہو گئی۔"[1]

اس دو ہی سال کے بعد کا مفہوم وہی 1907ء ہے جب کہ پریم چند نے افسانے لکھنا شروع کیے تھے گویا ان کی ادبی زندگی تو 1905ء سے شروع ہوتی ہے جیسا کہ اوپر دکھایا جا چکا ہے۔ تصنیف و تالیف کی امنگ ان کے دل میں شروع ہی سے موجود تھی۔ کانپور میں مدیر "زمانہ" کی صحبت میں اس ذوق ادب میں زیادتی ہی ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ ملک میں "نواب رائے"، "نواب رائے" کا چرچا ہونے لگا۔ نواب رائے پریم چند کا دوسرا نام نہ تھا۔ بلکہ اس پردہ میں انھوں نے اپنی اصلی شخصیت کو چھپا لیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اہلیت کسی نام کی پروا نہیں کرتی۔ منشی ممتاز حسین عثمانی ایڈیٹر "اودھ پنچ" نے کتنے ہی مضامین اور نظمیں مفروضہ ناموں سے لکھی ہیں۔ لیکن اس کے بعد بھی وہ مضامین اتنے ہی مقبول ہوئے ہیں جن کے وہ مستحق تھے۔ کانپور میں پریم چند کو خداداد صلاحیتوں کے استعمال کے کافی موقعے حاصل ہوئے "آزاد" اور "زمانہ" کے صفحات ہمیشہ ان کے لیے کھلے رہے اور اسی مشق نے انھیں ادارت کے تمام مبادیات اور اصولوں سے واقف کر دیا۔

اس سوال کا جواب کچھ بہت مشکل نہیں ہے کہ پریم چند مضمون نویسی اور تصنیف و تالیف کی

---

[1] "زمانہ" بابت اکتوبر 1936ء۔ "منشی پریم چند اور زمانہ و آزاد" از منشی دیا نراین نگم۔

طرف کیوں مائل ہوئے؟ یہ ضرور ہے کہ ان کی ادبی قوتیں زیادہ عرصہ تک خوابیدہ نہیں رہ سکتی تھیں۔ وہ کبھی نہ کبھی ایک مصنف کی حیثیت سے دنیائے علم وادب میں نمودار ہی ہوتے لیکن اس قدر جلد جو چیز انھیں اس میدان میں گھسیٹ لائی وہ ان کی مالی کشمکش تھی اس کے متعلق کئی مقامات پر اشارتاً یا صاف صاف انھوں نے اپنے ہی پیدا کردہ کرداروں سے یہ بیان کرایا ہے کہ ان کے اس میدان میں فوراً آجانے کی وجہ ان کی مالی دشواریاں تھیں۔ اپنے افسانہ ''ڈگری کے روپئے'' میں لکھتے ہیں کہ

''مجبور ہوکر اُسے اپنے قلم کا سہارا لینا پڑا۔

یا اپنے فسانہ ''فلسفی کی محبت'' میں رقم طراز ہیں:

''لالہ گوپی ناتھ کو اب ضرورتاً تصنیف کا شوق ہو گیا تھا۔''

لیکن اسی کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی نہیں تھا کہ وہ صرف روپیہ پیدا کرنے کے لیے لکھتے ہوں اور یہ ہو ہی کیوں کر سکتا ہے۔ ہندوستان میں عموماً اور اردو داں طبقے میں خصوصاً ابھی اپنے مصنّفین کی صحیح قدر و منزلت کرنے کا احساس ہی پیدا نہیں ہوا ہے اکثر اخبارات و رسائل نقصان پر چلتے ہیں۔ کتابوں کی اشاعت میں عموماً کوئی خاص فائدہ میں مطبع والے یا دوسرے پبلشرز خاطر خواہ رقمیں نہیں دے سکتے۔ جب عالم یہ ہے تو پریم چند کو یہ خیال ہی نہ ہونا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ بجائے خود ان کا یہ خیال تھا کہ ''ہمارے ادب کی تنزّلی کا باعث بھی یہی ہے کہ ہم دولت کی غرض یا ناموری کے لیے لکھتے ہیں[1]۔''

ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد پریم چند کی پریشانیاں اور بڑھ گئیں۔ اردو داں طبقے میں ان کی تصانیف خاطر خواہ فروخت نہیں ہو رہی تھیں۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ چند مشہور ترین مصنفین کو چھوڑ کر ''پریم چند'' کی تصانیف اردو داں طبقے میں سب سے زیادہ فروخت ہوئیں پریم چند انسان تھے۔ وہ فکر معاش سے آزاد نہ تھے۔ اس لیے انھوں نے جب یہ دیکھا کہ ہندی کی طرف رجوع کرنے سے ان کی پریشانیاں کم ہوسکتی ہیں تو وہ ہندی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اسی زمانہ میں منشی بشن نراین بھارگو مالک مطبع نولکشور نے رسالہ ''مادھوری'' کی ادارت ان کے سپرد کر دی۔ اس سے پریم چند کی مالی مشکلات میں بہت بڑی حد تک کمی ہوگئی۔ وہ ذرا اطمینان کی فضا میں سانس لینے لگے۔ بزم ہندی میں شریک ہوتے ہی پریم چند کو یہ احساس ہوا کہ یہاں انھیں مالی فوائد زیادہ حاصل ہیں۔ لہٰذا انھوں نے اپنے کو زیادہ تر ہندی کے لیے وقف کر دیا۔ 1915 سے 1936 تک کوئی

---

[1] یہ جملہ پریم چند کے افسانہ ''ڈمانسٹریشن'' سے ماخوذ ہے جس میں افسانہ نویس نے یہ الفاظ ڈرامیٹسٹ کی زبان سے ادا کرائے ہیں

اکیس برس ہوتے ہیں۔ یہ تمام مدت ہندی کی خدمت کرتے گذری لیکن اس عرصہ میں پریم چند اردو سے غافل نہیں رہے۔ بلکہ ان کے افسانے اور مضامین اکثر اردو رسائل کی زینت بڑھاتے رہے۔ سال گذشتہ جب اردو، ہندی کے قضیہ میں گرما گرم بحثوں کا سلسلہ جاری تھا اس وقت منشی پریم چند مرحوم نے ''زمانہ'' میں اس موضوع پر ایک بالکل غیر جانبدارانہ مضمون لکھا جو سنجیدہ حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ غالباً اسی کی بدولت ان کو سال گذشتہ ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کا صدر منتخب کیا گیا۔ مولوی ظفر الملک علوی مدیر ''الناظر'' کا بیان[1] ہے کہ:

> ''جب معاشی ضرورتوں سے مجبور ہو کر ہندی لکھنا شروع کی تو پہلے وہ اردو میں افسانہ لکھتے تھے اس کے بعد ہندی میں اسے منتقل کرتے۔ رفتہ رفتہ ہندی میں مشاق ہوگئے۔''

بہرکیف یہ پریم چند کے لیے اور بھی قابل فخر بات تھی کیونکہ آخر عمر میں تو پریم چند ہندی کے مسلم الثبوت ادیب تصور کیے جانے لگے تھے اور ہندی والوں نے انھیں ''اپنیاس سمراٹ'' یعنی ''افسانہ نگاری کے بادشاہ'' کا لقب دے دیا ہے۔

مرحوم نے 1930 میں مادھوری کی ادارت ترک کر دی اور خاک وطن نے انھیں اپنے دامن میں کھینچ بلایا اور وہاں جا کر ''ہنس'' نامی ماہوار ہندی رسالہ جاری کیا جس کے متعلق انھوں نے پنڈت بنارسی داس چترویدی کو لکھا تھا کہ وہ ''ہنس'' کو تقریباً دو سو روپیہ ماہوار کے نقصان پر چلا رہے ہیں۔ اگر ذاتی مطبع نہ ہوتا تو پریم چند شاید اسے کسی طرح برداشت نہ کر سکتے۔ انھوں نے 'جاگرن' نامی ایک ہفتہ وار اخبار بھی نکالا مگر وہ ناکامیابی سے دو چار ہو کر بند ہوگیا۔ پریم چند نے افسانوں کے علاوہ ناول اور ڈرامے بھی لکھے ہیں بقول مدیر ''الناظر''

> ''1935 میں وہ سنیما کے لیے قصوں کے لیے بمبئی طلب کیے گئے اور وہاں چھ سات مہینہ رہے اور تقریباً پانچ ہزار روپیہ مل گیا۔''

اجنتا سینی ٹون کمپنی نے ''پریم چند'' کو بمبئی طلب کیا تھا۔ انگریزی رسالہ ''روپ بانی'' کے مدیر نے لکھا ہے کہ گذشتہ موقع پر جب مجھ سے اور پریم چند سے دہلی میں ملاقات ہوئی تھی تو انھوں نے کہا تھا کہ اجنتا سینی ٹون کے ذمہ دو مہینوں کی تنخواہ کے سلسلے میں کئی سو روپے باقی ہیں۔'' جس طرح محمود غزنوی نے فردوسی کے پسماندگان کے پاس رقم موعودہ فردوسی کے مرنے کے بعد بھجوائی۔ اسی طرح ممکن ہے کہ یہ رقم بھی غم رسیدہ پسماندگان کے پاس بھیج دی جائے۔ ان چند مختصر سطروں میں اس مرحوم افسانہ نویس کی ادبی زندگی

---

[1] الناظر اکتوبر و نومبر 1936

کی تبدیلیوں پر ایک ہلکی سی روشنی ڈالی گئی۔ اب ذرا افسانہ نویسی کے متعلق خود افسانہ نویس کے خیالات سنیے:

(۴)

پریم چند نے سب سے پہلے افسانے لکھنا شروع کیے۔ اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ ان کی زبانی پہلے یہ سنیے کہ وہ افسانے کیوں کر لکھتے تھے۔ مدیر "نیرنگ خیال" نے چار افسانہ نویسوں سے دریافت کیا تھا کہ وہ افسانہ کیوں کر لکھتے ہیں۔ ان چاروں نے جو جوابات لکھے وہ مدیر موصوف نے "سالنامہ نیرنگ خیال" میں درج کر دیے۔ منشی پریم چند نے جو جواب دیا تھا۔ وہ بلحاظ طوالت یہاں پر کل نقل نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اس کے ضروری اجزاء یہ ہیں:

> "میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہدے یا تجربے پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر محض کسی واقعہ کے اظہار کے لیے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اس میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک اس قسم کی بنیاد نہیں ملتی۔ میرا قلم اٹھتا ہی نہیں۔ زمین تیار ہونے پر میں کیریکٹروں کی تخلیق کرتا ہوں۔ بعض اوقات تاریخ کے مطالعہ سے بھی پلاٹ مل جاتے ہیں لیکن کوئی واقعہ افسانہ نہیں ہوتا تاوقتیکہ وہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار نہ کرے۔ میں جب تک کوئی افسانہ اول سے آخر تک ذہن میں جما نہ لوں لکھنے نہیں بیٹھتا............ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ افسانے کی بنیاد کسی پرسطوت واقعے پر رکھوں۔ اگر افسانے میں نفسیاتی کلائمکس موجود ہوں تو خواہ وہ کسی طبقے سے تعلق رکھتا ہو میں اس کی پروا نہیں کرتا۔ کبھی کبھی سنے سنائے واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر افسانہ کی بنیاد آسانی سے رکھی جاسکتی ہے۔ میں کلائمکس لازمی چیز سمجھتا ہوں اور وہ بھی نفسیاتی۔ جب کوئی ایسا موقع آجاتا ہے جہاں ذرا طبیعت پر زور ڈال کر ادبی یا شاعرانہ کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے۔ تو میں اس واقعہ سے ضرور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہی کیفیت افسانے کی روح ہے۔ میں بہت سست رفتار ہوں۔ مہینے بھر میں میں نے کبھی دو افسانوں سے زائد نہیں لکھے۔ بعض اوقات تو مہینوں کوئی افسانہ نہیں لکھتا۔ واقعہ اور کیریکٹر تو سب مل جاتے ہیں لیکن نفسیاتی بنیاد بمشکل ملتی ہے۔ یہ مسئلہ حل ہو جانے پر افسانہ لکھنے میں دیر نہیں لگتی۔ شاعری کی طرح اس کے لیے بھی اور ادب کے ہر ایک شعبے کے لیے کچھ فطری

مناسبت ضروری ہے۔ فطرت آپ سے آپ پلاٹ بناتی ہے، ڈرامائی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ تاثیر لاتی ہے، ادبی خوبیاں پیدا کرتی ہے۔ نادانستہ طور پر آپ ہی سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ ہاں قصہ ختم ہو جانے کے بعد میں خود اسے پڑھتا ہوں اگر اس میں کچھ قدرت، کچھ جدت، کچھ حقیقت کی تازگی، کچھ حرکت پیدا کرنے کی قوت کا احساس ہوتا ہے تو میں اسے کامیاب افسانہ سمجھتا ہوں۔ ورنہ سمجھتا ہوں فیل ہو گیا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس افسانے کو میں نے فیل سمجھا تھا اسے احباب نے بہت پسند کیا۔ اس لیے میں اپنے معیار پر زیادہ اعتبار نہیں کرتا۔ پریم چند''

منشی پریم چند اپنے ''ڈانسٹریشن'' میں کبھی مست رام کی زبان سے یہ کلمہ ادا کرتے ہیں کہ:

''ڈرامہ ایسا ہونا چاہیے کہ جو سنے دل ہاتھوں سے تھام لے۔ ایک ایک نکتہ تیر و نشتر کی طرح دل پر اتر جائے۔''

اور کبھی گور پرشاد کی زبان سے ڈرامہ کی اہمیت کو یوں ظاہر کرتے ہیں کہ:۔

''ناٹک لکھنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ خون جگر پینا پڑتا ہے۔ میرے خیال میں ایک ناٹک لکھنے کے لیے پانچ سال کا وقت بھی کافی نہیں ہے۔ بلکہ اچھا ڈرامہ زندگی میں ایک ہی لکھا جا سکتا ہے۔ یوں قلم گھسنا دوسری بات ہے۔ بڑے بڑے بصروں کا قول ہے کہ ڈرامہ زندگی میں ایک ہی لکھا جا سکتا ہے۔ روس، فرانس، جرمنی، تمام زبانوں کے ڈرامے پڑھے مگر کوئی نہ کوئی نقص ہر ایک میں موجود ہے۔''

اپنے افسانہ ''آخری حیلہ'' میں اخبار نویس کی زندگی کی مشکلات کو یوں لکھتے ہیں کہ:۔

''بے انتہا تکلیف دہ کبھی بارہ بجے رات کو سونا نصیب ہوتا ہے کبھی ساری رات لکھنا پڑتا ہے۔ صبح ہوتے ہی وہ دوا دوش۔ وہی ہنگامہ آرائی۔ اس پر طرہ یہ کہ سر پر ایک برہنہ تلوار لٹکتی رہتی ہے۔ نہ جانے کب گرفتار ہو جاؤں۔ کب ضمانت طلب ہو۔''

اپنے افسانہ ''ادیب کی عزت'' میں وہ یوں حقیقت کو بے نقاب کرتے ہیں:۔

(۱) ''ادب کا یہ پجاری دنیا و مافیہا سے بے خبر فکر سخن میں غرق رہتا تھا۔ پر ہندوستان میں سرسوتی کی پوجا لکشمی کی ناراضی کے مترادف ہے۔ دل تو ایک ہی تھا۔ دونوں دیویوں کو ایک ساتھ کیوں کر خوش کرتے۔''

(۲) ''ادبی خدمت اور فربہی میں خدا واسطے کا بیر ہے۔ اگر کوئی ادیب موٹا تازہ ہے تو سمجھ

لیجیے کہ اس میں سوز نہیں۔ لوچ نہیں۔ دل نہیں۔ چراغ کا کام جلنا ہے۔ چراغ وہی لبالب بھرا ہوگا جو جلا نہیں۔"

(۳) میں نے آج سمجھ لیا کہ ادبی خدمت پوری عبادت ہے۔

ان سے زیادہ جو الفاظ سرتاپا حقیقت و واقعیت بن کر سامنے آتے ہیں وہ ان کے افسانہ "ڈگری کے روپے" میں ملیں گے۔ ذیل میں دیکھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ پریم چند کس قدر فرض شناس واقع ہوئے تھے:-

"اخبار کا ایڈیٹر ہمیشہ قاعدوں کے مطابق قوم کا خادم ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے قومی وسیع النظری سے۔ جو کچھ سوچتا ہے اس پر بھی قومیت کی مہر لگی ہوتی ہے۔ ہمیشہ قومی خیالات کی وسیع فضا میں گھومتے رہنے سے شخصی اہمیت کا دائرہ اس کی نگاہوں میں بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ وہ شخص کو ہیچ، حقیر اور نا قابل توجہ خیال کرنے لگتا ہے۔ شخصیت کو قومیت پر قربان کرنا اس کی روش کا مقدم ترین تقتضا ہے حتی کہ وہ اکثر اپنی غرض کو قوم پر نچھاور کر دیتا ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد عظیم اور معیار پاکیزہ ہوتا ہے۔ وہ ان زبردست شخصیتوں کا مقلد ہوتا ہے جنھوں نے قوموں کو بنایا اور سنوارا ہے جن کا نام امر ہو گیا ہے۔ جو مظلوم قوموں کے لیے نجات دہندہ ثابت ہو چکی ہیں۔ وہ حتی الامکان کوئی کام ایسا نہیں کرتا جس سے اس کے پیش رووں کی چمکتی ہوئی شہرت میں داغ لگ جانے کا اندیشہ ہو۔"

اور بھی بہت سے اقتباسات پیش کیے جا سکتے ہیں جن سے اس مسئلہ پر مزید روشنی پڑتی ہے لیکن مضمون طویل ہو رہا ہے۔ اس لیے اسی کو کافی تصور کر لینا مناسب ہوگا۔

منشی پریم چند کا تذکرۂ زندگی نامکمل رہ جائے گا اگر ان کی خانگی زندگی میں مندرجہ ذیل چند باتوں کا ذکر نہ کیا جائے۔ ان کی دو شادیاں ہوئی تھیں۔ پہلی بیوی سے انھیں آرام کے بجائے رنج ہی پہنچتا رہا۔ اس کے تاثرات کا اظہار ان کے ایسے مکالموں سے اکثر ہوتا ہے جو زن و شو کے درمیان (ان کے لکھے ہوئے افسانوں میں) ہوتے ہیں۔ دوسری بیوی شیورانی دیوی جی خود بھی ادیبہ ہیں اور ہندی کے اہل قلم میں ایک مستقل جگہ پانے کی مستحق ہیں۔ ان سے پریم چند بہت زیادہ خوش رہے۔ زندگی کا یہ انقلاب بھی ان کے افسانوں سے نمایاں ہے۔ پریم چند نے دو لڑکے چھوڑے ہیں۔ شریمتی شیورانی ایک کمسن بیوہ تھیں۔ پریم چند نے ان سے شادی کر لی تھی۔

منشی پریم چند کی عادات واطوار کے متعلق دوایک لفظوں میں کچھ لکھنا ناممکن ہے۔ وہ اوصاف کا مجموعہ تھے اور گو وہ فارغ البالی کی زندگی بسر نہ کر سکے۔ تاہم غالب کی طرح یہ کہتے تھے کہ ع

''اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے'' چنانچہ اپنے افسانہ ''توبہ'' میں لکھتے ہیں کہ:-

''ایسی زندگی کو بامزہ بنانے کے لیے صرف ایک ہی تدبیر ہے۔ خود فراموشی جو ایک لمحے کے لیے مجھے دنیاوی تفکرات سے چھٹکارا دے میں اپنے گردوپیش کے حالات کو بھول جاؤں۔ اپنے کو بھول جاؤں۔ ذرا ہنسوں، ذرا قہقہے لگاؤں۔ ذرا دل میں تازگی پیدا ہو۔''

یہی تمام زندگی ان کا معمول رہا۔ اسی وجہ سے ان کے بے تکلف احباب انھیں ''بمبوق'' کہنے لگے تھے۔ ایڈیٹر صاحب ''زمانہ'' لکھتے ہیں کہ:-

''ایسی شگفتہ طبیعت پائی تھی کہ ہر وقت اور ہر بات میں ہنسی کا پہلو نکال کر خوب زور سے قہقہے لگایا کرتے۔ چنانچہ یاران بے تکلف انھیں ''بمبوق'' کہا کرتے تھے۔''

پریم چند اصول کے فدائی تھے۔ سچے محب وطن تھے۔ ان کا دل وطن کی محبت سے لبریز تھا۔ وہ ہندو مسلم، عیسائی وغیرہ کی تفریقوں کے قائل نہ تھے اور اپنے ابنائے وطن کو اس کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ ان کے افسانوں میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ وہ نوجوانوں کے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے وہ نوجوانوں کے سامنے معاشرتی، سیاسی اور مذہبی واخلاقی مسائل پیش کرتے تھے ان پر بحث کرتے تھے۔ حریت فکر کے خاص موید تھے۔ یہ سب باتیں کسی شخص میں یکجا کم جمع ہوا کرتی ہیں۔ ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ وضع کی پابندی ان کا خاص شیوہ تھا۔ ان کے احباب میں ہندو مسلم اور عیسائی سبھی تھے، اور ایک سچے ہندوستانی کی طرح وہ سب سے یکساں طور پر ملتے تھے۔'' انھیں اس خودغرض دنیا میں گندم نما جو فروشوں سے بھی سابقہ پڑا جو چھوٹی چھوٹی رقمیں لے کر روپوش ہو گئے لیکن اس مرد پاک باطن کی پیشانی پر بل نہ آیا۔ آہ۔ ایسی ہستیاں اب چراغ لے کر ڈھونڈنے پر بھی مشکل سے ملتی ہیں۔

(۵)

ان کی تصانیف کے متعلق مجمل تبصرہ سے پہلے میں وہ تین سوال درج کر رہا ہوں جو پنڈت بنارسی داس چترویدی نے پریم چند سے کیے تھے وہ سوالات یہ تھے:-

(۱) آپ کے سب سے بہتر پندرہ افسانے کون ہیں؟
(۲) آپ پر کس مصنف کے طرز تحریر کا اثر پڑا ہے؟
(۳) آپ کو اپنی تصنیفات سے کتنی آمدنی ہوئی؟

ان سوالات کے جو جوابات منشی پریم چند نے دیے ہیں وہ ذیل درج ہیں:-

(۱) اس سوال کا جواب ذرا مشکل ہے۔ دو سو سے زیادہ افسانوں میں کہاں تک انتخاب کروں لیکن یاد سے کام لے کر لکھتا ہوں۔

(۱) بڑے گھر کی بیٹی (۲) رانی سارندھا (۳) نمک کا داروغہ (۴) سوت (۵) آبھوشن (۶) پرائشچت (۷) کامنا (۸) مندر اور مسجد (۹) گھاس والی (۱۰) مہاتیرتھ (۱۱) ستیاگرہ (۱۲) لانچھن (۱۳) ستی (۱۴) لیلیٰ (۱۵) منتر

(۲) میرے طرز تحریر پر کسی دوسرے مصنف کے اسلوب بیان کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا ہے لیکن پنڈت بشن نراین در اور ڈاکٹر رابندر ناتھ کا طرز کچھ کچھ اثر انداز ہوا ہے۔

(۳) آمدنی کی کچھ نہ پوچھیے۔ کچھ ابتدائی کتابوں کا حق طباعت پبلشرز کو دے دیا۔ "سیوا سدن" "پریم آشرم" سپت سروج سنگرام کے لیے ہندی پستک ایجنسی نے ایک مشت تین ہزار روپے دیے تھے اور نو ندھ کے لیے شاید اب تک دو سو روپے ملے ہیں۔ دولارے لال جی نے رنگ بھومی کے لیے اٹھارہ سو روپے دیے تھے اور دوسرے مجموعوں کے لیے سو دو سو روپے مل گئے ہوں گے۔ کایا کلپ۔ آزاد کتھا، پریم تیرتھ، پریم پرتیا، پرتگیا میں نے خود چھاپی ہیں۔ لیکن ابھی تک مشکل سے چھ سو روپے وصول ہوئے ہیں۔ تصانیف سے متفرق آمدنی پچیس روپے ماہوار ہو جاتی ہے مگر کبھی کبھی اتنی بھی نہیں اور ترجموں میں شاید دو ہزار سے زائد نہیں ملا۔ آٹھ سو روپے میں رنگ بھومی اور پریم آشرم دونوں کے ترجموں کا معاملہ ہو گیا۔ "ہنس" اور جاگرن کی اشاعت میں تقریباً دو سو روپیہ ماہوار کا نقصان ہو رہا ہے۔"

پریم چند کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تقریباً دو سو افسانے لکھے۔ لیکن جناب ناظر کاکوری اپنے مضمون میں ان کے افسانوں کی تعداد 350 بتلاتے ہیں مسٹر ٹنڈن[۱] نے بھی اپنے ایک مضمون میں جو لیڈر میں شائع ہوا تھا لکھا ہے کہ ان کے افسانوں کی تعداد تین سو سے زیادہ ہے۔ اس لیے ان دو شہادتوں کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ خود مصنف کا تخمینہ صحیح نہیں ہے۔ ان کی کہانیوں کی تعداد دو سو نہیں بلکہ

[۱] مسٹر ٹنڈن ایڈیٹر ہندوستانی (ہندی ایڈیشن) الہ آباد

تین سو سے بھی زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ناول بھی لکھے ہیں جن کی تعداد دس بارہ تک پہنچتی ہے۔ ڈرامہ بھی غالباً دو یا تین لکھے ہیں۔ ناولوں میں "رنگ بھومی" اور ڈراموں میں "کربلا" بہت زیادہ مقبول ہوئے۔

(ب) یہ منشی پریم چند نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ان پر کسی مصنف کے طرز تحریر کا اثر نہیں پڑا ہے کسی بڑے ادیب کے لیے یہ خیال کرنا کہ وہ کسی دوسرے مصنف کی نقل کرتا ہے۔ ادیب کی توہین ہے، تعریف نہیں ہے۔ جتنے بڑے بڑے لکھنے والے ہیں۔ وہ سب اس کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ایک انفرادی حیثیت حاصل کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر منشی پریم چند کی تصانیف کو اس نقطۂ نظر سے نہ دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوگا کہ یہ تمام افسانے کسی ایک ہی شخص کے لکھے ہوئے نہیں بلکہ مختلف مصنفین کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ کہیں سرشار کا رنگ نظر آئے گا تو کہیں بشن نراین در کا اور کہیں رابندر ناتھ ٹیگور کا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پریم چند کا یہ عقیدہ تھا کہ عبارت اور خیالات میں حتی الوسع ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ جس قسم کے خیالات کا وہ اظہار کرنا چاہتے تھے اس کے لیے ویسے ہی طرز ادا کا انتخاب بھی کرتے تھے۔ یہی وہ چیز ہے جو پریم چند کی ہندوستان گیر شہرت کی ضامن ہوئی ہے۔ اگر پریم چند نے اپنے قصہ کا پلاٹ مذاحیہ رکھا ہے تو اس کے لیے انھوں نے طرز ادا کو بہترین مزاحیہ نگاروں کے بیان سے ملا دینے کی کوشش کی اور اس طریقہ سے اثر وروانی بڑھانے میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ اس طرح سنجیدہ مضامین یا افسانے لکھتے وقت اُن کا طرز بیان اتنا سلجھا ہوا اور سنجیدہ ہو جاتا ہے کہ وہ اچھے اچھے سنجیدہ مضامین اور افسانے لکھنے والوں کے مقابلے میں بآسانی پیش کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر ٹیگور کے طرز تحریر کا اثر پریم چند کے چھوٹے چھوٹے جملوں اور اُن کی نفسیاتی تخیل سے ظاہر ہے۔ پریم چند نے اپنے ایک افسانے میں ایک جگہ اپنے ہیرو کے متعلق لکھا ہے کہ "اس کے مضامین میں طول کم اور تفتیش زیادہ ہوتی ہے۔ یہی حرف بحرف پریم چند کے لیے بھی صحیح ہے۔ وہ ہندوستان کے ذرّے ذرّے پر نگاہ تحقیق ڈالتے ہیں۔ وہ تمام جسمانی، روحانی نسلی اور صنعتی خصوصیات کا بنظر غائر مطالعہ کرتے ہیں اور اُن کو کم سے کم الفاظ میں بیان کر دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ پریم چند کی یہ خاص کوشش ہوتی ہے کہ ان کے افسانوں میں کوئی لفظ بیکار استعمال نہ ہونے پائے۔ وہ ہر ہر لفظ میں معانی واسرار کے سمندر بھر دیتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگر "دریا بکوزہ" کی کوئی اصلیت مانی جا سکتی ہے تو اسی طرح سے کہ الفاظ کے محدود کوزے میں مطالب ومعارف کا دریا موجزن نظر آتا ہے یا دل کے ظرف میں جو بظاہر تنگ معلوم ہوتا ہے تمام کائنات کی وسعت نظر آتی ہے۔ ان سب باتوں میں پریم چند ڈاکٹر ٹیگور سے ملتے جلتے ہیں۔ لیکن ان سب کے علاوہ جو چیز پریم چند کے طرز بیان کو ٹیگور کے

طرز بیان سے قریب تر لانے والی ہے وہ ان کے افسانوں کا مقامی رنگ ہے۔ میرا خیال ہے کہ ٹیگور کے بعد پریم چند کے سوائے کسی دوسرے افسانہ نویس نے مقامی رنگ سے اتنا فائدہ نہیں اٹھایا ہے جتنا کہ پریم چند نے۔

(ج) پریم چند کو جو آمدنی ان کی تصنیفات سے ہوئی اس کا تذکرہ کرتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے۔ اگر مغربی ممالک میں جا کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ پریم چند نے مکمل بیس برس تک جتنا روپیہ اپنی تصانیف کے صلے میں پایا وہ انگلستان وغیرہ میں ایک ایک کتاب کے بدلے مل جایا کرتا ہے۔ دور کیوں جایئے ''آل کوائٹ آن دی وسٹرن فرنٹ (All Quiet on the western front) کے مصنف کو محض اسی ایک تصنیف کے معاوضہ میں اتنی کثیر رقم مل گئی تھی کہ جب اس سے کہا گیا کہ ایسی ہی دوسری تصنیف اشاعت کے لیے دو تو اس نے کہا کہ مجھے پہلے ہی ناول کی اشاعت کے بعد اتنا روپیہ مل گیا ہے کہ اب مزید تصنیف و تالیف کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ ع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

جناب اعجاز لکچرار الہ آبادی یونیورسٹی اپنی ''مختصر تاریخ ادب اردو'' میں لکھتے ہیں کہ:-
''معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے منشی پریم چند کے دل و دماغ کو خاص طور سے افسانہ کے لیے بنایا تھا جس کا صرف منشی جی نے اس خوبی سے کیا کہ ابھی تک میدان افسانہ نویسی میں کوئی ان سے آگے قدم نہیں رکھ سکا۔''

پریم چند کے متعلق یہ رائے انتہائی صداقت شعاری اور کثرت مطالعہ پر مبنی ہے اور اپنی جگہ اس قدر جامع و مانع ہے کہ مزید اظہار رائے کی ضرورت نہیں۔ جیسا کہ پریم چند کا خود ہی خیال تھا کہ افسانہ نویسی بھی شاعری کی طرح بہت کچھ عطیات فطرت کی محتاج ہے۔ بقول سعدی ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

پریم چند فطری طور پر افسانہ نویسی کے لیے موزوں تھے۔ اور غالباً ہر میدان میں قسمت آزمائی کے بعد وہ خود بھی اس نتیجہ پر پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ سیاسی و تحقیقی مضامین لکھنے کے بجائے انھوں نے اپنی عنان توجہ افسانہ نویسی ہی کی طرح مبذول کی۔ فن افسانہ نویسی پر انھوں نے متعدد کتابیں پڑھیں۔ مختلف زبانوں کے افسانوں کا مطالعہ کیا۔ ملکی حالات کا بغور مشاہدہ کیا اس کے بعد انھوں نے قلم اٹھایا۔ اس کوشش کا جو نتیجہ ہوا اس سے آپ ناواقف نہیں اور کیوں نہ ہو جب کسبی اور وہبی قوتیں یکجا ہو جائیں تو ایسی

عظیم المرتبت ہستی کا افقِ شہرت پر جلوہ گر ہونا ذرا بھی حیرت انگیز نہیں ہے۔

برانڈر میتھوز (Brander Matthews) نے اپنے شہرۂ آفاق مضمون "فلسفۂ افسانہ" (جس کا اصلی نام انگریزی میں Philosophy of short story ہے) لکھا ہے کہ:-

"ایک مختصر افسانہ اس کہانی سے جو صرف مختصر ہو مختلف اور زیادہ اہم چیز ہے۔ ایک سچا افسانہ ناول سے اپنی مشہور خصوصیت اتحاد اثر (Unity of impression) کی بناء پر جداگانہ حیثیت اختیار کرتا ہے۔ چونکہ مختصر افسانوں میں الفاظ کا صحیح اور بالکل حسب محل استعمال کیا جاتا ہے اس لیے تمام افسانے میں وہ فنی اتحاد پیدا ہو جاتا ہے جو ناول میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ اکثر مختصر افسانوں میں فرانسیسی زبان کے کلاسک ڈرامہ کے تینوں اتحاد یکجا ہو جاتے ہیں یعنی اتحادِ عمل و مکان و زمان۔"

اب اس تعریف کی روشنی میں پریم چند کے افسانوں کو دیکھیے تو یہ محسوس ہوگا کہ اتحادِ اثر پیدا کرنا پریم چند کا اولین مقصد تھا وہ مرکزیت خیال پر خاص طور سے زور دیتے تھے۔ ابتدا سے انتہا تک ان کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ افسانہ میں اتحادِ عمل بھی ہو، اتحادِ مکان بھی ہو اور اتحادِ زمان بھی۔ اگر ایک لفظ یا ایک جملہ پریم چند کے اکثر و بیشتر افسانوں سے کم کر دیا جائے تو نگاہِ آشنا اس کی کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔

جیسا کہ پریم چند نے لکھا ہے کہ وہ ہمیشہ کسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر افسانے لکھا کرتے تھے۔ ابتدا سے آخر تک وہی مقصد افسانہ پر چھایا ہوا رہتا ہے۔ اس لیے کوئی تغیر یا تبدل تمام افسانہ کی تبدیلی کے مترادف ہوگا۔ "سر سڈنی کالون" نے ایک مرتبہ اسٹونسن کو ایک خط لکھا تھا جس میں اسٹونسن کو یہ رائے دی تھی کہ وہ اپنے افسانوں میں سے کسی ایک خاص افسانہ کا خاتمہ تبدیل کر دیں۔ اس کے جواب میں اسٹونسن نے لکھا کہ:-

"اس کا دوسرا خاکہ لکھوں؟ او ہو! لیکن یہ میرے لکھنے کا طریقہ نہیں ہے اور اختتام کے تبدیل کر دینے کے معنی یہ ہیں کہ ابتداء کو بالکل غلط کر دوں...... ابتداء اور تمام پلاٹ معہ اختتام کے ایک ہی استخوان و خون کا مجموعہ سے بنی ہیں۔"

منشی پریم چند کے افسانوں کے متعلق بھی بجنسہ یہی کہا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پریم چند کے افسانے فن کی مکمل تصویریں ہیں۔ فن کی تمام نزاکتوں کا مجموعہ ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ کثیر المطالعہ بھی تھے اور اپنے مطالعہ کا صحیح مصرف جانتے تھے۔ ان کے یہاں مختلف النوع افسانے ملیں گے کسی میں اسکاٹ (Scott) کا رنگ، کسی میں ڈکنز (Dickens) کا اسلوب بیان ہے کہیں پو (Poe) یا

موساپاں (Mapaussant) کے طرز بیان کی جھلک ہے اور کچھ افسانے (Bret Harte) (H.G. Wells) اور "Kipling O Henry, G.W.Cable w.cable" کے اسالیب تحریر کے عکس بردار ہیں لیکن ہر جگہ پریم چند کی انفرادیت نمایاں ہے ان کے قلم سے بیک وقت مختلف افسانے مختلف انداز بیان میں صفحۂ قرطاس پر نمایاں ہوتے ہیں لیکن پریم چند چونکہ خـذما صفی و دع ماکدر کے مقولے پر عامل ہیں اس لیے دربار افسانہ نویسی کے ان مشہور رتنوں میں ہر ایک کا انداز ایک خاص امتزاج کے ساتھ ان کے یہاں نظر آتا ہے یہ ایسی تقلید ہے جس پر تقلید کا گماں بھی نہیں ہوسکتا۔ جہاں انسان اپنی قوت ممیزہ سے کام لیتا ہے اور نظر انتخاب ڈالتا ہے وہاں تقلید پر بھی نہیں مار سکتی۔ پریم چند کے متعلق اسی لیے یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ حقیقت پسند یعنی (Realist) ہیں یا مثالیت پسند یعنی (Idealist) ہیں۔ ان کے افسانوں کی اچھی خاصی تعداد (Idealism)[1] کی اچھی مثال ہے لیکن زیادہ تر افسانوں میں پریم چند نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ وہ انسانی زندگی کی حقیقت کو بے نقاب کردیں اس لیے ان کے افسانے زیادہ تر "ریلزم" (Realism) کے بہترین نمونے ہیں۔ بہر کیف بہ حیثیت مجموعی پریم چند کو Idealist (آئیڈیلسٹ) نہیں کہہ سکتے۔ ان کی زندگی کا خاص مشن یہ تھا کہ وہ حیات انسانی کے ہو بہو نقشے ہمارے سامنے پیش کردیں۔

عموماً افسانہ اور حقیقت کے درمیان ایک وسیع خلیج نظر آتی ہے لیکن جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ غلط سلط واقعات پر افسانوں کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ انھوں نے افسانہ کی موجودہ ترقی کو نہیں دیکھا ہے۔ دوسری طرف حقیقت پسند کا یہ حال ہے کہ وہ رومانیت اور تخیل کو دور از کار سمجھتا ہے لیکن حقیقی افسانہ نہ تو حقیقت سے بے نیاز ہوسکتا ہے اور نہ ایسی حقیقت کا پابند جس میں نہ تو رومان کی گلگونی ہو اور نہ تخیلات کی رنگینی۔ افسانہ در حقیقت ان چیزوں کے ایسے امتزاج کا نام ہے جو تفریح کے ساتھ ہی ساتھ انسانی دماغ کو پست اور سطحی خیالات سے بلند کرکے ایک بلند معیار زندگی سے روشناس کرائے۔ ہمارے افسانہ کو تحریک میں لانے والی وہ چیزیں ہونا چاہیے جو ہمارے مشاہدات زندگی پر مبنی ہوں۔ مگر ان میں ایسے لطیف عناصر کی چاشنی بھی ہو۔ جو تلخ اور ناخوشگوار حقیقتوں کو دلچسپ اور نظر فریب بنادے۔ افسانہ نویس کا فرض ہے کہ وہ زہر ہلاہل کو بھی شہد کی حلاوت عطا کرے۔ پریم چند کا بھی یہی نقطہ نظر ہے۔ وہ ہر چیز کو ایک حقیقت پسند کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس کے بعد اسے اپنے مخصوص انداز میں رنگ کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ تیر اثر کا نشانہ کبھی خطا نہیں کرتا۔ کبھی کبھی پریم چند صرف اپنی تخیل سے کام لیتے ہیں اور جو چیزیں ہم نے کبھی نہیں

---

[1] معیار پسندی۔ مثالیت

دیکھی ہیں، اسے وہ افسانہ کی شکل میں پیش کر دیتے ہیں۔ لیکن ان میں بھی امکان مثالی Ideal) (Probability موجود نہیں رہتا ہے یعنی گو وہ چیزیں ہمارے مشاہدے میں نہیں آئی ہیں۔ مگر ان کا امکان ضرور ہوتا ہے۔ ہڈسن (Hudson) نے لکھا ہے کہ حقیقت کو حدود فن میں لانے کے لیے ہمیں مثالیت سے کام لینا پڑتا ہے۔ پریم چند حرف بحرف اس کی عملی تقلید کرتے ہیں اسی وجہ سے ان کی اخلاقی تعلیمات میں کبھی واعظانہ خشکی نہیں آنے پاتی۔ مثلاً ان کے افسانہ "توبہ" کو لیجیے۔ "اس میں شراب نوشی کے مضر اثرات اس طرح دکھائے گئے ہیں کہ پڑھنے والے کو خود بخود شراب سے نفرت ہونے لگتی ہے مگر مصنف نے کہیں بھی واعظانہ رنگ اختیار نہیں کیا ہے البتہ اس میں امکان مثالی موجود ہے۔ ان کے دوسرے افسانہ "نیک بختی کے تازیانے" کو دیکھیے یا "ڈگری کے روپئے" کا مطالعہ کیجئے۔ سب میں پریم چند اپنے فرائض سے بحسن وخوبی عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

پریم چند پر سیاسی تحریکوں کا زبردست اثر پڑا تھا۔ وہ ملک کی سیاسی تحریکوں سے اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ سرکاری ملازمت بھی ترک کر دی تھی۔ اس طرح ملکی تحریکوں کا اثر ان کی تحریروں میں صاف طور سے نمایاں ہے۔ اس سلسلے میں ان کے افسانے "بھاڑے کا ٹٹو" کا ایک اقتباس خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ جس میں پریم چند نے تحریک دہشت انگیزی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس تحریک کا زور شور بنگال میں بہت زیادہ ہوا۔ اس کا ایک خاص سبب تھا جسے پہلے خود پریم چند ہی کی زبانی سنئے:

> "اجتماعی ذہنیت ہمیشہ انتہا کی طرف مائل ہوتی ہے۔ وہ سب کچھ کر گزرتی ہے جو افراد کے لیے ناقابل خیال ہے۔ سیلاب اگر آبادیوں کو غرقاب کرتا ہے تو زمین کو زرخیز بھی کر دیتا ہے۔ دریائے تہ نشیں کے سکون میں یہ قوت عمل کہاں اس مجمع میں ستم ناروا کے خلاف احتجاج کا ایک سیلاب سا آ گیا۔ خون بیداد انتقام کے لیے مشتعل ہو گیا۔ قانون پر تصرف اس ذہنیت کی خصوصیت ہے۔ صدہا آدمی ایک اندھے جنون کے عالم میں موٹر کی طرف دوڑے" (ماخوذ از افسانہ "برات")

گذشتہ سیاسی بدنظمی کے دور میں ایسی ہی اجتماعی ذہنیت انقلاب کی طرف مائل تھی۔ ملک میں غربت اور افلاس جس حد تک کو پہنچ چکے تھے۔ اس کا ردعمل لازمی تھا۔ چنانچہ ہوا۔ اب اسے بھی آپ پریم چند کی زبانی سنئے:

> "رمیش جیل سے نکل کر پکا انقلاب پسند بن گیا۔ جیل کی تاریک کوٹھری میں تمام دن کی سخت محنت کے بعد وہ غریبوں کی فلاح اور اصلاح کے منصوبے باندھا کرتا تھا۔ سوچتا کہ انسان

کیوں گناہ کرتا ہے۔ اس لیے نا کہ دنیا میں اس قدر افتراق ہے۔ کوئی تو عالی شان محلوں میں رہتا ہے اور کسی کو درخت کا سایہ بھی میسر نہیں۔ کوئی ریشم و جواہرات سے منڈھا ہوا ہے کسی کو پھٹا کپڑا بھی نصیب نہیں ہے۔ ایسی بے انصاف دنیا میں اگر چوری، ہتیا اور ادھرم ہے تو یہ کس کا قصور ہے؟ وہ ایک ایسی انجمن قائم کرنے کا خواب دیکھتا تھا جس کا کام دنیا سے اس افتراق کو ناپید کر دینا ہو۔ دنیا سب کے لیے ہے اور اس میں سب کو راحت و آرام سے بسر کرنے کا مساوی حق ہے۔ نہ ڈاکہ ڈاکہ ہے نہ چوری! چوری! دولت مند اگر اپنی دولت کو خوشی سے نہیں بانٹ دیتا تو اس کی مرضی کے خلاف تقسیم کر لینے میں کیا گناہ ہے؟ دولت مند اسے گناہ کہتا ہے تو کہے۔ اس کا بنایا ہوا قانون اگر سزا دینا چاہتا ہے تو دے۔ ہماری عدالت بھی علاحدہ ہوگی۔ اس کے سامنے وہ سبھی ملزم ہوں گے جن کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت ہے...... جیل سے نکلتے ہی اس نے اسی جماعتی انقلاب کا اعلان کر دیا۔ خفیہ انجمن قائم ہونے لگی۔ ہتھیار جمع کیے جانے لگے۔'' (ماخوذ از ''بھاڑے کا ٹٹو'')

پریم چند نے اپنے افسانہ ''قاتل'' میں اس سبھا کا تذکرہ کیا ہے۔ دھرم ویر اور اس کی ماں کے درمیان جو مکالمہ ہوا ہے وہ حقائق سے مملو ہے۔ ملک میں ایسے دو گروہ یقیناً پیدا ہو گئے ہیں جن میں سے دونوں کا مقصد حصول آزادی ہے مگر ایک ستیہ گرہ کا قائل ہے۔ وہ عدم تشدد کے اصول پر کاربند رہنا چاہتا ہے۔ دوسرا گروہ اشترا کیت کے نشے میں مست ہو کر دہشت انگیزی پر اُتر آیا ہے۔ ان گروہوں کے خیالات منشی پریم چند کے الفاظ میں یہ ہیں:-

''دھرم ویر! مجھے امید نہیں کہ پکٹنگ اور جلسوں سے ہمیں آزادی حاصل ہو سکے۔ یہ تو اپنی کمزوری اور معذوری کا صریحی اعلان ہے۔ جھنڈیاں نکال کر اور گیت گا کر قومیں آزاد نہیں ہوا کرتیں۔ مجھے تو یہ طرز عمل بچوں کا سا کھیل معلوم ہوتا ہے۔ لڑکوں کو رونے دھونے اور مچلنے پر کھلونے اور مٹھائیاں ملا کرتی ہیں وہی ان لوگوں کو مل جائے گا۔ اصلی چیز جبھی ملے گی جب ہم اس کی قیمت دینے کو تیار ہوں گے۔

ماں: اس کی قیمت کیا ہم نہیں دے رہے ہیں۔ ہمارے لاکھوں آدمی جیل نہیں گئے؟ ہم نے ڈنڈے نہیں کھائے؟ ہم نے اپنی جائدادیں نہیں ضبط کرائیں؟

دھرم ویر: اس سے انگریزوں کا کیا نقصان ہوا؟ وہ ہندوستان اس وقت چھوڑیں گے جب انھیں یقین ہو جائے گا کہ اب ہم یہاں ایک لمحہ بھی بھر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اگر آج ہندوستان

کے ایک ہزار انگریز قتل کر دیے جائیں تو آج سوراجیہ مل جائے۔ روس اسی طرح آزاد ہوا۔
آئرلینڈ اسی طرح آزاد ہوا اور ہندوستان بھی اس طرح آزاد ہوگا......
ماں: کیا تم سمجھتے ہو کہ انگریزوں کے قتل کر دینے سے ہم آزاد ہو جائیں گے۔ ہم انگریزوں
کے دشمن نہیں۔ ہم اس طرز حکومت کے دشمن ہیں......

اس عبارت سے نہ صرف پریم چند کی قوت استدلال کا سراغ ملتا ہے بلکہ ان کی سیاست دانی اور بیدار مغزی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ملک کے سیاسی حالات پر کتنا عبور رکھتے تھے۔

یہ حقیقت محتاج بیان بھی نہیں کہ آج کل ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جو روحانیت اور مادیت کی جنگ میں گذر رہا ہے۔ روحانیت کا اثر ونفوذ روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے اور مادیت اپنا جال ہر طرف پھیلاتی جا رہی ہے۔ ہماری تمام تحریکیں، ہمارے تمام اعمال اور ہمارے تمام خیالات مادی اشیاء کے تابع ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اور خالص مشرقی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو ہم بجائے بلندی کے پستی کی طرف مائل ہیں۔ روحانیت ہمیشہ مشرق کا طرہ امتیاز رہی ہے۔ مگر دنیا کے ذہنی انقلابات ہماری ذہنیتوں کو بھی برباد کرتے چلے جاتے ہیں۔ پریم چند اسے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ اسی لیے وہ ہمیں ہندوستان کی عظمت گذشتہ کے افسانے سناتے ہیں۔ وہ راجپوتوں کی بہادری، وطن پروری اور آن بان کو ایسے پیرایہ میں بیان کرتے ہیں جن سے ہمارے دلوں میں روحانیت کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے اور یہی پریم چند کا مقصد ہے۔ بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ پریم چند نے راجپوتی عظمتوں کا تذکرہ محض ہندوؤں کے مردہ جذبات کو حیات نو بخشنے کے لیے کیا ہے مگر مجھے اس سے قطعی اختلاف ہے۔ پریم چند کا اصلی مقصد ہندوستان کی روحانیت کو اجاگر کر کے پیش کرنا ہے وہ چاہتے ہیں کہ ہمارے دلوں میں بھی وہی جذبات پیدا کر دیں جن پر ہم کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ راجپوتوں کی شجاعت اور بہادری ہندوستان کی بہادری اور شجاعت کے مرادف ہے اسے فرقہ وارانہ رنگ دینا کسی حیثیت سے مناسب نہیں ہے۔ ان کا ہر افسانہ زبان حال سے کہہ رہا ہے۔

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را

پریم چند اگر کچھ چاہتے ہیں تو صرف اس قدر کہ لوگ ان کے افسانوں کو پیام زندگی سمجھ کر ان کے بتائے

ہوئے راستوں پر چلیں تا کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کر سکیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستانی غم کدے ایک نئی روشنی سے جگمگا اٹھیں۔ اور ان کی حیات کی رگوں میں ایک برقی لہر دوڑ جائے۔ وہ عورتوں کو بھی دعوت عمل دیتے ہیں۔ راجپوت عورتوں کے ایثار، قربانی، وطن پرستی اور جانبازی کے افسانوں کے سنانے کا اس کے سوا اور مقصد ہی کیا ہو سکتا ہے ''وکرمادت'' 'رانی سارندھا'' راجہ ہردول'' گناہ کا اگن کنڈ'' وغیرہ افسانے کیوں لکھے گئے؟ محض اسی مقصد کے حصول کے لیے کہ ہندوستانیوں کو'' خود شناسی'' آ جائے۔ وہ اسلاف کے کارنامے اس لیے سنانا چاہتے ہیں کہ وہ یہ امر اچھی طرح ذہن نشین کر دیں کہ تم پہلے کیا تھے اور اب کیا ہو گئے ہو۔''

اس قسم کے افسانوں میں پریم چند نے بعض جگہ حقیقت کے ساتھ ساتھ شعریت سے بھی کام لیا ہے اس سے جوش، روانی اور اثر تو ضرور بڑھ گیا ہے مگر ان مقامات میں شعریت حقیقت پر غالب آ گئی ہے۔ پھر بھی ان کی عبارت یا ان کا پلاٹ غیر فطری نہیں ہونے پایا۔ آپ اسے چاہے ان کی کمزوری سمجھے یا کمال۔ بہر حال پریم چند کوئی خدائی کے دعویدار نہیں تھے اور خطا ونسیاں مقتضائے بشریت ہے۔ پھر پریم چند سے کبھی ایسی فروگذاشت ہوگئی ہو تو چنداں نکتہ چینی کے قابل نہیں۔

پریم چند کے یہاں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں حیثیت رکھتی ہے وہ دیہاتی زندگی کی صحیح اور ہو بہو مرقع کشی ہے۔ ان کے افسانوں کو پڑھتے وقت یہ کبھی خیال بھی نہیں ہونے پاتا کہ ہم انھیں لوگوں کے حرکات و سکنات کا مطالعہ نہیں کر رہے ہیں جو ہمیں میں سے ہیں۔ جن سے آئے دن ہم سے سابقہ پڑا کرتا ہے۔ مگر فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ جس زندگی میں ہمارے لیے دل کشی کا کوئی سامان نہیں ہے، وہی پریم چند کے قلم کی ادنیٰ سی جنبش کی بدولت اتنی لطیف اور پر کیف بن جاتی ہے کہ اس میں ہم ایک لذت محسوس کرنے لگے ہیں گو یہ لذت ایک جذبۂ غم کے پہلو بہ پہلو پیدا ہوتی ہے۔ کسانوں کی زبوں حالی، زمینداروں پولیس والوں اور سرمایہ داروں کی چیرہ دستیوں کا حال پڑھ پڑھ کے بے اختیار آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔

پریم چند دیہاتی زندگی سے متعلق افسانے لکھتے وقت اتنی احتیاط ضرور برتتے ہیں کہ وہ دکھ اور درد بھری داستانیں سناتے وقت اکثر و بیشتر دیہاتی زندگی کے چند ایسے دلچسپ مناظر بھی پیش کر دیں کہ تھوڑی دیر کے لیے فضائے دل پر چھائے ہوئے غم کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور خوشی کی ایک بجلی چمک جاتی ہے۔ اس سے ہمارے مضطرب جذبات میں اشتعال کی جگہ مفکرانہ سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ کبھی سکون

علم النفس کے مسائل بیان کر دینے سے بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ایسے موقع کو پریم چند کبھی ہاتھوں سے جانے نہیں دیتے۔ وہ عالمگیر نفسیاتی حقائق بیان کرتے ہیں۔مثلاً رنج والم وعیش و مسرت، حسد و بغض وغیرہ کے جذبات صرف کسی مخصوص طبقے کی ملکیت نہیں ہیں۔ وہ امیر وغریب، کالے اور گورے میں یکساں طور پر موجود ہوتے ہیں۔ ایسے جذبات کے بیان کر دینے سے، دیہاتی زندگی کی خشک داستان اور بھی پُر اثر اور نتیجہ خیز ہو جایا کرتی ہے۔

پریم چند کے کردار عموماً مثالی ہوتے ہیں جنھیں انسان مشعل راہ ہدایت بنا سکتا ہے۔ وہ عموماً یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ہر انسان میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور بُرائیاں بھی لیکن پریم چند خوبیوں کو زیادہ نمایاں کر کے بیان کرتے ہیں جس کی وجہ سے بُرائیاں خود بخود دب جاتی ہیں۔ ان کے تمام کردار آہستہ آہستہ ارتقائی منزلیں طے کرتے ہیں۔ اسی باعث ان میں ہمواری اور یک رنگی موجود رہتی ہے۔کوئی کردار کبھی کوئی ایسا کام نہیں کرتا جس کے لیے وہ ابتداء ہی سے تیاریاں نہ کر رہا ہو۔ پریم چند کو یہ بات بہت پسند ہے کہ وہ اپنے کرداروں کو کشش و پیچ اور گو مگو کی حالت میں مبتلا کر دیں۔ ان کے کردار دو مختلف جذبات سے برسر پیکار نظر آتے ہیں۔ ان کے سامنے دو راستے ہیں جن میں وہ ایک کو اختیار کرتے ہیں اور دوسرے کو ترک کر دیتے ہیں۔ اور اپنے اس انتخاب کی وجہ وہ کبھی پوشیدہ نہیں رکھتے بلکہ بتا دیتے ہیں۔ یہ وجہ بھی ایک نہ ایک زاویہ نظر سے معقول ضرور ہوتی ہے۔

پریم چند کرداروں کے نام ان کی نسلی خصوصیات، ان کی مالی حالت اور ان کے ماحول کے بیان کرنے میں خاص کوشش سے کام لیتے ہیں۔ سوائے چند ناموں کے جتنے نام بھی ہیں ان سے کرداروں، عادات واطوار کا پتہ چلتا ہے اور ان کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ کرداروں میں جسمانی اور دماغی خوبیاں وہ یکجا کر دینے کی کوشش کرتے ہیں اور جسمانی کیفیتوں کا ذکر ضروری سا خیال کرتے ہیں۔

پریم چند کے افسانوں میں بوڑھوں، بچوں، جوانوں، مردوں، عورتوں، عالموں، جاہلوں، پنڈتوں، مولویوں، پروفیسروں، کلرکوں، ججوں، اخبار نویسوں سب کو جگہ ملی ہے۔ لیکن سب علاحدہ علاحدہ خصوصیات اور عادات واطوار کے مالک ہیں۔ اس بات نے ایک امتیازی شان پیدا کر کے مختلف طبقوں اور صنفوں کی عادات میں ایک خط فاصل کھینچ دیا ہے۔

ان کرداروں کے مکالمے عموماً نہایت مہتم بالشان اور پُر معنی ہوتے ہیں۔ باتوں ہی باتوں میں

ہر ایک کا کردار ادا ہو جاتا ہے اور مافی الضمیر بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ پریم چند کو کردار نگاری میں ید طولیٰ حاصل ہے۔

حیاتِ انسانی

''شباب انسانی زندگی کی معراج ہے۔ طفل میں اگر ہم سنہرے خواب دیکھتے ہیں تو شباب اُن خوابوں کی تفسیر ہے۔''

''عہد طفلی کے بعد ایسا زمانہ آتا ہے جب ایک بیجا جنون سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ اس میں شباب کا مستقبل ارادہ نہیں ہوتا بلکہ ایک زبردست امید آفرینی جو مشکل کو آسان اور ناممکن کو ممکن سمجھتی ہے۔''

(پردۂ مجاز)

''بچپن کا دوسرا نام سیلانی پن ہے'' (گوشہ عافیت)

فطرتِ انسانی

''انسان کا دل لاکھ کی مانند ہے۔ اس کے نشانات مٹانا یوں تو ناممکن ہے اسے گرم کر کے ہم اس کی جگہ نئے نشانات مرتسم کر سکتے ہیں۔'' (خواب و خیال)

''انسانی فطرت نہ بالکل سیاہ ہوتی ہے نہ سفید۔ ان میں دونوں رنگوں کا ایک عجیب اتصال ہوتا ہے۔'' (گوشہ عافیت)

منشی پریم چند کے ناول

از سید طالب علی صاحب، طالبؔ ایم اے۔ الہٰ آبادی

میں یہ کہنے کو ہرگز تیار نہیں ہوں کہ پریم چند کے سبھی ناول باقی رہنے والے ہیں، آگے چل کر کیا ہوگا یہ تو کوئی پورے بھروسے کے ساتھ نہیں کہہ سکتا لیکن، ستاروں کی چال سے، فصل وموسم کی تبدیلیاں، سیاسی مطالعہ سے انقلاب کی خبر، انسانی عادات سے واقعات کی پیشین گوئی اور سبب واثر سے عناصر کی روش حیات کا پتہ چل سکتا ہے تو پریم چند کے ناول، پڑھنے کی طرح پڑھ کے بے بتائے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس لڑی کے کچھ موتی ایسے بھی ہیں جن کو کسی زمانہ اور کسی بھیس میں خریداروں کی کمی محسوس نہ ہوگی۔

مکرمی دیا نرائن نگم صاحب کی پیہم یاددہانیوں کا ممنون ہوں کہ میں کامل ایک مہینہ تک پریم چند کے ناول ہی پڑھتا رہا۔ ورنہ اس خزانے کی نہ جانے کب سیر ہوتی اور میری آتما کی پیاس جو اردو ناولوں کی ترسی ہوئی تھی خدا معلوم کب تک بجھتی۔

میں نے دو ڈھائی سو سے زیادہ اردو ناول نہیں دیکھے انگریزی ناول بہت دیکھے ہیں، اب دل میں پھر ایک لہری اٹھی ہے، دیکھوں کیا انجام ہو۔

اس تشریح سے ناظرین کو صرف یہ بتانا منظور ہے کہ میں کتنے پانی میں ہوں، نہ تو میں نقاد ہوں، نہ محسن ادب اور نہ ماہرفن۔ میری صرف اسی قدر تمنا ہے کہ پریم چند کے ناولوں کے متعلق جو کچھ میرے خیالات ہیں، ان کو پوری سچائی کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کردوں، آپ بھی اس مضمون کو مانگے کی عینک سے نہ پڑھیں اور قیاس کی دوربین سے موشگافیوں پر آمادہ نہ ہو جائیں، ہمہ دانی کو مطالعہ سے بڑا بیر ہے، ذرا سی زحمت ضرور ہے مگر خود کتابیں پڑھیے اور رائے قائم کیجیے۔ میری مسرت صرف اسی بات پر منحصر ہے کہ آپ ایک نظر پریم چند کے ناول خود دیکھ ڈالیے پھر آپ کی جو رائے ہوگی خواہ وہ بالکل وہی ہو جو

میری ہے یا اس کے سراسر خلاف مجھے پروا نہیں۔ میرے دماغ کا ہر دروازہ آپ کے خیالات کے لیے آغوش محبت کی طرح کھلا رہے گا۔

مجھے یہ اندیشہ صرف اس لیے ستاتا ہے کہ میں دیکھتا ہوں کہ زندگی کے ہر شعبے میں ہماری غلامانہ زندگی کے اثرات نمایاں ہیں، اردو سے ہماری بے توجہی کا عالم ناگفتہ بہ ہے صرف اتنا سمجھ لیجیے کہ مجھے پریم چند جیسے مقبول مصنف کے اردو ناولوں کی ضرورت ہوئی تو سارا شہر الٰہ آباد چھان مارا۔ ہندوستانی اکیڈمی، الٰہ آباد یونیورسٹی پبلک لائبریری اور الٰہ آباد کے دوسرے پبلک کتب خانوں کی آستان بوسی کی اردو کے محسنین اور پرستاروں کی خدمت گرامی میں حاضر ہوا مگر کہیں ان کا مکمل سٹ نہ ملا، خدا بھلا کرے اردو ڈیپارٹمنٹ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کا جنھوں نے جامعہ دہلی سے ان کا مکمل سٹ منگا لیا ورنہ خدا جانے کب تک مجھے ان کے مطالعہ کی مسرت نصیب ہوتی۔

پریم چند نہ اوتار تھے نہ مافوق الفطرت انسان، البتہ وہ کامیاب ناول نویس ضرور تھے اور ان کے یہاں زبان، بیان، فن اور تخیل کی دنیا میں دوسرے کامل افسانہ نگاروں کی طرح بلندیاں اور پستیاں دونوں ہیں۔ پریم چند سچے مگر انتہاپسند تھے۔ ان کی بلندیاں ستاروں سے باتیں کرتی ہیں اور ان کی پستیاں بھی گہری ہیں۔

اس مضمون میں پریم چند کے ناولوں کے دوسرے ناولوں سے موازنہ کرنے کا خیال نہیں ہے کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ

وہ ''وہاں'' ہیں جہاں سے ان کو بھی آپ اپنی خبر نہیں آتی

اس مضمون میں، تفصیل واقتباسات بھی بہ خوف طوالت نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔

بہر حال میں نے پریم چند کے جتنے ناول پڑھے ہیں ان کا میرے دل پر جو اثر ہوا ہے وہ حاضر ہے۔

(۱) جلوۂ ایثار

یہ طویل فسانہ منشی جی کی پہلی یا دوسری کوشش ہے غالباً پہلی مرتبہ 1910ء میں شائع ہوا۔ اس میں اس زمانہ کی فسانہ نگاری کا رنگ غالب ہے، ابتداء، بیانیہ ہے۔ کیونکہ ان دنوں کسی نہ کسی فطری منظر کی تصویر سے داغ بیل ڈالنا فن اور اصول کی پابندی کا ثبوت سمجھا جاتا تھا۔ مگر اس نئے کھلاڑی نے پرانے

ل جلوۂ ایثار 1912 میں انڈین پریس الٰہ آباد سے شائع ہوا تھا۔ (مانک ٹالا)

میدان اور کھیل کے قدیم طریقے برتنے پر بھی ایسے ٹھاٹھ دکھائے ہیں اور ایسے تیور سے قلم اٹھایا ہے اور اس خوبی سے تشبیہ واستعارات کا صرف کیا ہے، کہیں بھی فرسودہ ترکیبیں اور رعایت کی موقلمی نہیں، بلکہ اس ناول میں ہر جگہ جدت طبع اور زور فکر کا ثبوت ملتا ہے، پہلا باب ڈرامائی خصوصیات سے مالا مال ہے، تشبیہوں میں بھی ندرت اور البیلا پن ہے۔ پریم چند کی ایک ادا مجھے بہت پسند ہے۔ جب کبھی وہ مادی چیزوں کی تصویر کشی کرتے ہیں ایسی بے جوڑ ہی روحانی ادا کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں کہ دماغ کا توازن نہیں بگڑنے پاتا۔ بلکہ ان کی نکتہ دانی کے بدولت تصویر میں چار چاند لگ جاتے ہیں اور ایک عجیب پُر لطف کشمکش پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی اور اس کا الٹا۔ نفسیات اور روحانیت کا دریا موجیں لے رہا ہے اور اس میں لکڑی کی ایک ناؤ لہروں میں ڈوبتی ابھرتی نظر آتی ہے۔ ایسے نظارے کے وقت ناظرین پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے وہ بیان نہیں کی جاسکتی۔ پورے ناول کا خلاصہ پہلے ہی باب میں موجود ہے، پریم چند کبھی دیر تک ناظرین کو انتظار میں نہیں رکھتے۔

سپوت بیٹا وہی ہے جو دیس کا اپکار کرے، پریم چند وطن کے سچے پوجاری تھے اس لیے ان کے سبھی سورما دیش بھگت ہیں، خواہ ان کا تعلق کسی ذات، طبقے یا جماعت سے ہو، دراصل وہ آدمی کی خلقت اور اس کی زندگی کی صرف یہی غرض سمجھتے ہیں کہ عموماً خلقت کی اور خصوصاً اپنے وطن کی خدمت کرے۔ اگر آپ ان کے ہیرو سے یہ جوہر چھین لیں تو ان میں کچھ بھی نہ رہ جائے گا۔

پریم چند کے سورما عمل سے زیادہ آئیڈیل رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں یعنی بعض مقامات پر وہ اپنے ہیرو کے ہاتھ سے ایسے ایسے کام کرا دیتے ہیں، جو ناول کے صفحوں پر سچے اور سنیما کے پردوں پر فطری معلوم ہوں گے مگر روزمرہ زندگی اور اصلی مسافرخانہ دنیا میں وہی کام، فلسفی یا شاعر کے دماغ کی چلتی پھرتی تصویریں ہوں گے تاہم مجموعی حیثیت سے ان کا ہر "ہیرو" سچائی کا پتلا انصاف پسند، تیاگ اور ترک کا نمونہ، کامیاب فاتح اور گوشت پوست کا رہنما معلوم ہوتا ہے۔

کبھی کبھی وہ اپنے "ہیرو" کو آواگون کی برکت اور سنیاس کے معجزوں کے ہتھیار بھی دے دیتے ہیں۔ آپ ان چیزوں سے اتفاق نہ کریں مگر یہ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ پریم چند کوئی گڑھی ہوئی بات بیان کر رہے ہیں۔ ان کی تعلیم، فضا، یا نشوونما کا اثر کہئے یا ان کے مطالعے اور مشاہدے کا نتیجہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو بات پریم چند بیان کرتے ہیں وہ دل سے نکلتی اور سننے والے کے دل پر اثر کرتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ پریم چند سے بالکل مختلف سوچنے والوں پر وہ اثر کم یا زیادہ دیر تک قائم نہ رہے۔ لیکن جب تک آپ پریم چند کی افسانوی دنیا میں سانس لیتے رہتے ہیں ان کی ہر بات کا آپ پر اثر ہونا لازمی ہے۔

اس ناول میں نئی روشنی اور پرانی روشنی اس لطافت سے سموئی گئی ہے کہ جہاں کہیں طبیعت پر کوئی ادا بار ہوئی فوراً دوسری امید افزا شان سامنے آ گئی۔ ایک چیز البتہ مجھے کھٹکتی ہے۔ پریم چند نفیس ایجاز و اختصار کی جگہ ہمیشہ جزئیات اور تفصیلات سے کام لیتے ہیں اسی لیے طول میں آمد نہیں آورد ہوتی ہے اور بعض اوقات دم گھبرا جاتا ہے۔

پریم چند بیانیہ اور نفسیہ کے بہت دلدادہ ہیں۔ ثالث یا مصنف کی حیثیت سے ہر معاملہ پر رائے زنی کرتے رہتے ہیں اور اس کا پڑھنے والا محتاج رہتا ہے کہ اس کا پورا مفہوم سمجھنے کے لیے پریم چند ہی کی جادو بھری زبان کے سامنے آخر تک اپنا دست سوال دراز رکھے۔ اب زمانہ بہت آگے نکل گیا ہے۔ مہذب زبانوں کے تمام ناول نگار، بیانیہ اور نفسیہ (Narration & soliloquy) کا کام صرف مکالمے سے نکال لیتے ہیں۔

پریم چند کے بعض مکالمے بہت زیادہ دلکش نہیں ہیں، جب کبھی وہ اپنے اطراف کی زبان میں گفتگو لکھتے ہیں تو واقعی خاص مزہ آجاتا ہے، مقامی زبان (بنارس اور نواح بنارس کی) پوربی زبان پر آپ کو پورا ملکہ ہے اور غریب یا متوسط طبقہ کے جذبات کی پوری ترجمانی ان کی زبان سے ہو جاتی ہے۔ مگر ان کے مکالموں میں احتیاط نہیں ہے، وہ دو مردوں کا مکالمہ بھی لکھتے ہیں اور عورتوں کا بھی مگر ان میں جنسی امتیازات نہیں برتتے جس سے ان کے ناول واقعات کے لحاظ سے کئی جگہ غیر فطری سے ہو گئے ہیں مگر ان کی تصانیف میں تصوف، ترک علایق، تیاگ اور تپسیا کے برقی مشعل اتنے تیز ہیں کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں۔

ان کا شاعرانہ تخیل ہر جگہ نمایاں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جذبات کا سمندر ہے کہ امنڈا چلا آتا ہے اور اپنی رو میں ہر چیز کو بہائے لیے جاتا ہے۔ پریم چند کا مشاہدہ خواہ کتنا ہی نامکمل اور محدود ہو مگر وہ ہندوستان کی بہت سی مہلک اور تباہ کن رسوم سے بخوبی واقف تھے اور قریب قریب ہر جگہ انھوں نے انتہائی کوشش کی ہے کہ شراب، جوا، سرمایہ داری، شادی اور بیاہ کے مضر رسوم اور سوسائٹی کی برائیوں کی اصلاح ہوتی ہے۔

یہی ان کی قلمی کاوش کی معراج ہے جب وہ دیکھتے ہیں کہ آئے دن کے واقعات سے بھی لوگوں کی آنکھیں نہیں کھلتیں اور لوگ تیلی کے بیل اور گڈریے کی بھیڑ کی طرح لکیر کے فقیر بنے ہوئے آنکھیں بند کیے چلے جا رہے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ بھلا افسانوی واقعات میں تازیانہ کی شان کون پسند کرے گا۔ لوگ مزے مزے سے پڑھ تو لیں گے لیکن پھر جلد ہی بھول جائیں گے۔ اس لیے وہ مجبور ہو کر صاف گوئی اور

نصیحتوں پر اتر آتے ہیں۔ دکھا ہوا دل ابل پڑتا ہے۔ چوٹ کھائی ہوئی آتما سے آہیں نکل پڑتی ہیں خواہ ان کی کھری کھری باتوں کا وہ اثر نہ ہو جو پردہ میں کہہ جانے کا ہوتا ہے۔

بالا جی اس ناول کے ہیرو ہیں ان کا کیریکٹر نہ مکمل اور نہ کچھ ایسا کیف آور ہے کہ ہم بھی بالا جی بن جانے کی آرزو کریں وہ صرف ایک معمولی قومی لیڈر معلوم ہوتے ہیں جنھیں عام ذہنیت کی مدد اور واقعات کی سازگاری نے کچھ دنوں کے لیے معراج شہرت پر پہنچا دیا مگر ہمارے یہاں ایسے سورما روز ہی اسٹیج پر آتے جاتے رہتے ہیں۔

اس ناول کی دوسری میرتیں برائے بیت معلوم ہوتی ہیں یا پہیلیاں بن کر رہ گئی ہیں۔ بالا جی مرکز نور ہیں اور تمام کیریکٹر صرف پس منظر کا کام دیتے ہیں۔ کسی کی کوئی خاص وقعت نہیں۔

پریم چند کے دیگر ناولوں میں آپ کو مکمل اور اثر انگیز سیرت نگاری کا اتنا صاف نمونہ مشکل سے کہیں ملے گا۔ مجھے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند کسی ناول کا پورا پلاٹ پہلے سے اپنے دماغ میں طے نہ کر لیتے تھے بلکہ دوران تصنیف ہی ان کے افراد کے کیریکٹر کا نشو ونما ہوتا رہتا تھا۔ اس لیے ان کے اکثر ناولوں میں پلاٹ اور ضمنی پلاٹ کا سلسلہ نہیں ہے۔ بلکہ متعدد پلاٹ پوری حیثیت اور شان کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ زبردستی نتھی کر دیے گئے ہیں۔ آپ چاہیں تو ان کے بیشتر ناولوں کو تقسیم کر سکتے ہیں، ہر پلاٹ ایک مکمل فسانہ بن سکتا ہے۔ میں یہ نہیں جانتا کہ پلاٹ کا اتحاد اور تسلسل ناول کے لیے لازی ہے یا نہیں مگر میرا جی یہی چاہتا ہے کہ ایک دریا ہو جس میں بہت سی ندیاں آ کر ملی ہوں تا کہ ہماری توجہ مرکزی شے سے ہٹنے نہ پائے۔

پریم چند کے یہاں دوسری کمی اس چیز کی ہے کہ تدریجی ترقی سے جذبات کا اپنی انتہا پر پہنچنا اور وہاں سے پھر سہولت کے ساتھ واپس ہونا۔ بہر حال ہم پورے طور پر حادثات اور انقلابات کے لیے تیار نہیں ہونے پاتے اور شاید اسی کی بدولت ذہن میں کوئی وقفہ یا تعطل Suspenc محسوس نہیں ہونے پاتا اور ہم اس لطف سے محروم رہ جاتے ہیں جو کیف کشمکش سے حاصل ہوتا ہے

بالا جی خاص کر اپنی اس زندگی میں فوق بشر یا تحت بشر نظر آتے ہیں جب ان کی انقلابی تیاریاں ایک جنگل میں ہوتی ہیں تو اعتقاد اور جذبات سے الگ ہو کر ان کو نظر بھر کر دیکھنے کی ہمت ہی نہیں پڑتی۔

اس ناول میں ایک چیز ایسی بھی ہے جس کی مثال شاید ہی اور کہیں مل سکے Telepathy ٹیلیپیتھی کہیے یا اثر اندازی۔ بالا جی کے والد (جواب رشی ہو گئے ہیں) چاہتے ہیں کہ بالا جی کو پہاڑوں کی گود سے رخصت کرنے سے پہلے ان کی قوت تحمل کا امتحان لے لیں مگر یہ امتحان کاغذ اور قلم یا زبان سے نہیں لیا جاتا

بلکہ مسمریزم کی طرح معمول پر ایک خاص دماغی کیفیت طاری کر کے نفسیاتی ہیجان کی زہد شکن تصویریں بالا جی کو دکھائی جاتی ہیں جن کو دیکھ کر انھیں ایک طرف بہشت معلوم ہوتا ہے اور دوسری طرف اتھاہ غار اس نفسیاتی امتحان کی تشکیل اور اس کو ترغیب کی چلتی پھرتی زندہ تصویروں سے ایسا سجایا گیا ہے کہ جب تک ایک ہی سانس میں آپ پورے تین صفحہ نہ پڑھ لیں آپ کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ یہ امتحان اصلی تھا یا ذہنی۔

افسانہ کا خاتمہ پریم چند کے یہاں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ کملا کا انجام بالکل افسانوی انجام ہے اور بے ربط۔ وہ زبردستی مار ڈالا گیا ہے۔ اس نظارے سے نہ تسکین ہی ہوتی ہے اور نہ عبرت ہی حاصل ہوتی ہے بہرحال پریم چند ہر جگہ اپنے (Villain) کی سیرت سے ملی مشترک کمزوریوں کے سہارے ناظرین کے دلوں میں ایک جذبہ ہمدردی پیدا کر دیتے ہیں۔

بہرکیف اس ناول میں سرشاریت، شرریت، چترجیت اور رسوائیت کا عجیب میل جول ہے ایثار کے معنے صرف تیاگ کے ہیں اور سیوت بیٹے کی پوری تفسیر بالا جی میں محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

اس کی زبان بھی ناہموار، ثقیل اور مغلق ہے جا بجا فارسی، عربی الفاظ اور ترکیبوں کے ساتھ ساتھ ہندی سنسکرت کے اَمَل اور بے جوڑ الفاظ بھی ہیں بعض جگہ ایک ہی صفحے اور ایک ہی پیرا میں اور کہیں کہیں ایک ہی جملے میں یہ ہنگامہ نظر آتا ہے۔

(۲) غبن

اس کی زبان بھی کم ناہموار نہیں ہے۔ طوالت بھی ہے مگر اتنی نہیں کہ نگاہ یا ہوش پر بار ہو۔ مکالمہ میں سادہ گفتگو سے کام لیا گیا ہے جس میں مصنف کے جذبات اور اعتقادات کا جلوہ پوری تابانی سے نمایاں ہے۔ تعارف یا نفس شناسی کا کوئی پہلو باقی نہیں ہے۔ عورتوں کی خالص گفتگو میں وہ لہجہ وہ لوچ اور مزہ نہیں جو فسانہ نگار عورتوں کے یہاں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ واقعات گو غیر فطری نہیں اور روزمرہ کے بھی نہیں مگر بہت دلچسپ بنائے گئے ہیں گویا کسی نے کٹھ پتلیوں کو جادو کی چھڑی سے رقاصۂ فلک بنا دیا ہے مگر کہیں کہیں توازن کی کمی محسوس ہوتی ہے جیسے بوڑھے وکیل کے بعد رتن کی حالت وارفتگیٔ شباب ایک ہی ٹھوکر میں رشک شیب بن گئی ہے۔ اُما کا یکا یک بھاگ نا یا جالپا کی بعض حالتیں معمہ ہیں۔

تسلسل سے بھی گہرا تعلق نہیں۔ صاف نظر آتا ہے کہ بہت سے مختصر افسانے ایک ساتھ پرو دیے گئے ہیں اور ناول آپ سے آپ تیار ہو گیا ہے۔

پریم چند کی ایک خصوصیت مجھے اور نظر آتی ہے کہ ان کی کسی ناول میں نہ رموز جنسی کے فلسفہ کی

چھاؤں ہے اور نہ کہیں عریانی۔ دراصل فحش اور سوقیانہ انداز تحریر سے ان کا دامن قلم کبھی آلودہ نہیں ہوا۔ اسی کے ساتھ یہ کمی بھی محسوس ہوتی ہے کہ کہیں کوئی میاں بیوی مکمل طور پر مسرور نہیں دکھلائے گئے ہیں۔ شاید ان کی رائے میں زندگی کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے کہ جس میں صرف پھولوں کی کیاریاں ہوں اور کانٹوں کی روش نہ ہو۔

پریم چند کے یہاں قانون اور ضوابط و رسوم بھی بعض جگہ ادب اور شاعری کے شکنجے میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ ان کی ناولوں کا انجام بھی پینٹنٹ سا ہے۔ جیسے آج کل اکثر پردہ سیمیں پر ہر بدمعاش یکا یک کسی دیوی دیوتا یا واقعہ کے اثر سے بالکل فرشتہ بن جاتا ہے وہی حال پریم چند کے ناولوں کا ہے۔ اُما کو دیکھیے یا زہرہ کو کوئی پہچانا نہیں جاتا۔

(۳) گوشۂ عافیت حصہ اول

زبان نہایت ہموار، پیاری، نکیلی اور اتنی ستھری اور میٹھی ہے کہ فارسی خط میں اردو اور ناگری حرفوں میں ہندی معلوم ہوتی ہے، ادھر چار پانچ برس سے پریم چند کی تمنا تھی کہ اردو اور ہندی کے میل جول سے ہندوستانی زبان پیدا ہو، وہ دونوں زبانوں کے کامیاب لکھنے والے تھے اور سیکڑوں صفحے ایسے لکھ جاتے تھے جن میں کوئی کٹھن بات آتی ہی نہ تھی۔ ابھی عموماً ہم کو ایسی زبان لکھنے میں ذرا محنت سے کام لینا پڑتا ہے پر تھوڑے ہی دنوں میں عادت ہو جائے گی ہم چاہیں تو ہندوستانی ہی میں سوچیں گے اور اسی میں لکھیں گے۔

جو لوگ اردو ہندی کو دو ہوا بنڈ بے سمجھتے ہیں وہ خطرناک راستے پر چل رہے ہیں۔ اصل میں دونوں ایک ہیں، ہماری باہمی جنگ و جدل کی ایک یہ بھی چال اور ہماری غلامی کی ایک یہ بھی ادا ہے کہ ایک طرف فارسی عربی ٹھونس کر اردو کو اجنبی بنایا جا رہا ہے دوسری طرف سنسکرت کے بھرمار سے ہندی بھول بھلیاں ہو رہی ہے مگر اتنی اونچی اردو اور اتنی پوتر ہندی دونوں زبانیں مٹ جائیں گی۔ باقی رہے گی تو یہی ہندوستانی، جس کو ہندو مسلمان دونوں محبت سے گلے لگا سکیں گے اور جس کی آؤ بھگت وہ سب قومیں کر سکیں جو ہندوستان میں بستی ہیں۔

گوشۂ عافیت کے مقابلے میں ان کمزوریوں کی چھاؤں بھی نہیں ملتی جو دوسرے ناولوں میں نمایاں ہیں۔ خاص کر دیہاتی لہجہ اتنا سچا اور ایسا دلکش ہے کہ لکھنے والا معلوم ہوتا ہے عمر بھر انھیں لوگوں میں رہا ہے۔

سیرت نگاری بھی کہیں سے تشنۂ تکمیل نہیں، ہر سیرت اپنی جگہ مکمل ہے اور جیسے گفتگو میں نئی سیرتوں سے ملاقات بھی ہوتی ہے اور اُن کا کچا چٹھا بھی معلوم ہوتا ہے ویسے ہی سیرتوں سے واقعات کا ربط و تسلسل قائم رکھا گیا ہے اور حادثات کے لیے بیانیہ اور نفسیہ کی وہ بھرمار نہیں ہے مگر واقعات کے سلسلے میں ایک بات قابل ذکر ہے۔ پریم چند کا مشاہدہ کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو اور ان کی نظر کتنی ہی لامحدود ہو لیکن بعض واقعات وہ اس طرح لکھ جاتے ہیں جن میں نہ مادی سچائی ہوتی ہے نہ افسانوی۔ مثلاً بالا جی کا ایک کرکٹ میچ میں کھیلنا، میچ کے بیان سے کچھ تو ہنسی آتی ہے اور کچھ غصہ حالانکہ مصنف نہایت متانت سے تصویر کھینچتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ پڑھنے والے بالا جی کو براڈ مین سے کم نہ سمجھیں۔

گوشہ عافیت میں اس قسم کے ناہموار اور بے جوڑ واقعات نہیں ہیں تمام باتیں ایسی ہیں جو روز مرہ ہماری زندگی میں ہوتی رہتی ہیں اور اسی شان سے ہوتی رہتی ہیں جس شان سے دکھائی گئی ہیں۔

پریم چند نے رشوت ستانی اور جبریہ رسوم کی بے لاگ تنقید کی ہے مگر وہ متعصب اور طرفدار نہیں ہیں۔ دونوں پارٹیوں کی کمزوریاں، تصویر کے دونوں پہلو اور معاملات کے دونوں رخ اس صفائی سے دکھائے ہیں کہ کہیں انصاف کا خون نہیں ہونے پاتا۔ کہیں جذبات کا بے جا جوش و خروش ہے اور نہ تخریب کی دھن۔

مشرقی وضعداری اور مغربی دنیاداری کا موازنہ بھی محض قوت بیان سے نہیں بلکہ واقعات سے کیا ہے اور ایسا کہ جگہ جگہ دونوں کی برتری نظر آتی ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ پریم چند کو وطن اور وطن کی ہر چیز سے عشق ہے۔ یہاں کی تہذیب تعلیم، معاشرت سب کو وہ بے داغ ہی نہیں سمجھتے بلکہ عربوں کی طرح یا قدیم لوگوں کی طرح وہ اپنی تہذیب اور مدنیت کو ساری دنیا سے بہتر جانتے ہیں اور بہتر منوانا چاہتے ہیں اسی میں کہیں اعتدال قائم نہیں رہتا۔

اس ناول میں انسانی نفسیات کا ایسا پاکیزہ مطالعہ ہے کہ سارا افسانہ علم النفس کا ایک دریا معلوم ہوتا ہے۔ جذبات کے توازن میں وہی شان جو رومن رولینڈ کی خصوصیات میں داخل ہے میری رائے میں اس حصہ کا ترجمہ یوروپین زبانوں میں ہو تو بہت مقبول ہوگا۔

اپنے اصول کے خلاف پریم چند نے ودھوا گاتری اور گیان شنکر کو گھوڑا گاڑی میں گھر لوٹتے وقت جنسی افراد کی شان سے پیش کرنا چاہا ہے مگر یہاں وہ صرف شاعر اور جذبات نگار ہو کر رہ گئے ہیں۔

گوشۂ عافیت حصہ دوم

حصہ اول جتنا بلند ہے دوسرا حصہ اتنا ہی پست ہے جیسے بعض اوقات شعر کے ایک ہی مصرعہ میں

پورا مفہوم ختم ہو جاتا ہے اور دوسرا مصرعہ محض تکمیل ضابطہ معلوم ہوتا ہے یا یوں سمجھیے کہ کوئی آتش کدہ ٹھنڈا ہو چکے اور ایک دبی دبائی چنگاری پھونک پھونک کر بھڑکائی جائے۔ اقبال کے جواب شکوہ میں پھر بھی جان ہے، بہرحال ہم کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند ایک ہی نشست میں جو کچھ سوچ کر لکھ لیتے ہیں وہ تو نہایت نفیس ہوتا ہے اور باقی یوں ہی بھرتی کے واسطے ہوتا ہے یا یوں سمجھیے کہ مختصر افسانوں میں وہ نہایت کامیاب رہتے ہیں اس لیے کہ ان میں شروع سے آخر تک ایک ہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے مگر ان کے طویل ناولوں میں ہم آہنگی اتحاد اور روانی نہیں پائی جاتی۔

بھوت، پریت، فرشتوں اور روحانی ہستیوں کو پریم چند کے ناولوں میں اگر کہیں جگہ ملتی ہے تو توہمات کے گوشہ میں، ان تمام باتوں کو وہ، ہم سمجھتے اور مٹا دینا چاہتے ہیں مگر حیرت ہوتی ہے کہ جب وہ کسی معمولی انسان کو بھی گیان اور دھیان کے زیور سے سج دیتے ہیں تو ان سے ایسی کرامات ظاہر کرتے ہیں جو معجزوں سے کم نہیں اور جن کی مانگ اس سائنس کے زمانے میں ہو ہی نہیں سکتی۔ سکھو چودھری کرتار کے ایمان کا امتحان لیتے ہیں تو کرتار کے چھوتے ہی روپیوں سے بھری ہوئی تھیلی ٹھیکریوں کی تھیلی ہو جاتی ہے۔

اس حصے کے واقعات میں بھی تنقید نے فضول، بکواس کا لباس پہن رکھا ہے۔ شوہر نے جیل میں خودکشی کی کرلی تو سارے عمال پر قیامت آگئی!

وکیلوں کی بے اعتنائی اور بے اصولی کا مضحکہ بھی اصلیت سے دور ہے۔ اس حصے کے مکالمے بھی کمزور اور روکھے پھیکے ہیں۔ مسلمانوں کی سیرت نگاری بھی ایسی ہے جیسے بنگال میں ساری عمر بسر کر دینے والا آدمی، حجاز، قسطنطنیہ، عراق یا ایران کے چشم دید حالات لکھے۔

بھیرو کا جادو جگایا جاتا ہے اور امتحان عمل کے وقت سگا بھائی ایک ہی وار میں اپنے بھائی کا سر اڑا دیتا ہے اور پھر خودکشی کر لیتا ہے۔ اس حصہ پر نہ ہنسی آتی ہے نہ رنج ہوتا ہے۔

گائتری، رائے صاحب اور گیان شنکر کی اکثر تصویریں یا تو عقیدت کے نغمے ہیں یا نفرت کے مرقعے ایسی ہستیاں صرف فسانہ نگار کے دماغ میں پیدا ہو سکتی ہیں وہیں زندگی کے دن بسر کرتی اور وہیں فنا بھی ہو جاتی ہیں ہماری دنیا کے لیے وہ عجائبات سے کم نہیں ہیں۔

اس ناول کا انجام نہ تو Artistic (ادبی شان والا) ہے نہ اثر انگیز۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ناول کو المیہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بہرحال گائتری کا انجام بالکل اجنبی سا ہے اور شردھا کی ضدیں بھی مناسبت سے بے نیاز ہیں۔

پہلے اور دوسرے حصہ میں کوئی ربط نہیں معلوم ہوتا، پہلا حصہ ادبی جواہر ریزوں سے مالا مال ہے۔

گوشۂ عافیت کے پہلے حصہ کے متعلق بعض نکات رہ گئے ہیں جن کا نہ لکھنا نقادانہ ایمانداری کے خلاف ہوگا۔

معلوم نہیں منشی پریم چند مالیات اور اقتصادیات کے ماہر تھے یا نہیں مگر جب کبھی وہ کارخانوں۔ گھریلو مصنوعات اور درآمد و برآمد کی جزوی باتیں لکھتے ہیں تو اس قدرت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ اصابت رائے اور وسعت مطالعہ کے سکے بٹھا دیتے ہیں۔

پریم چند شنکر امریکہ سے واپس ہوتے ہیں تو دیش سیوک ہو جاتے ہیں، بیوی سے محبت کے باوجود اجتناب کرتے ہیں اور وہ بھی صرف خاندانی رسم و رواج پر اپنی بے پایاں الفت کو ایک زمانے تک برباد کرتی رہتی ہے۔

مگر پریم شنکر کی سیرت سے جوش عمل بھی پیدا ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ نفس کشی غار میں بیٹھنے کا نام نہیں بلکہ ترغیبات کا مقابلہ کرنا اور اس پر فتح پانا ہے۔ اس میں نام نہاد لیڈروں کا تبصرہ بھی نہایت پیارا ہے۔

ڈپٹ سنگھ کی موت میں ایسا دردانگیز پہلو ہے کہ دل بھر آتا ہے۔ بھگت کا مایوسی کے عالم میں بڑ بڑانا مورتی کو توڑنا اور پوجا کا سامان بکھیر دینا عبرت اور نصیحت کے لاجواب مرقعے ہیں۔

پریم چند کے یہاں دیہات کی مقامی گفتگو ہر جگہ مزیدار ہے اور گاؤں کے ذہنی حدود سے کہیں آگے نہیں بڑھنے پاتی اور ایسا کہیں نہیں ہے کہ لہجہ گنواروں کا ہو اور باتیں مصنف کی۔ معلوم نہیں کیوں مگر پریم چند کے یہاں ظرافت کی چاشنی بہت کم ملتی ہے۔ قہقہہ درکنار انبساطی کیفیت بھی نہ دل میں پیدا ہوتی ہے اور نہ دماغ میں۔ ان کے طنزیات زہر میں بجھے ہوئے نشتر ہوتے ہیں اور تمسخر اور استہزا سے نفرت سی پیدا ہوتی ہے۔

ہاں کہیں کہیں خوش مزاجی کی ہلکی ہلکی پیار لہریں دکھائی دیتی ہیں جو گرد و پیش کی متین و مہذب تاریکیوں میں سما کر رہ جاتی ہیں اور گدگدی درکنار طبیعت میں لہر بھی پیدا نہیں کرتیں۔

شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ خود منشی صاحب کی زندگی کانٹوں کی کیاری تھی یا تو ہمیشہ مصائب کا شکار رہے یا اتنے بلند ہو گئے کہ مسرت و غم کے جذبات سے بالاتر اور بے نیاز ٹھہرے[1]

(۴) پردہ مجاز

اس میں Suspense (ذہنی کشمکش) نہایت پاکیزہ ہے، مکالمہ بھی زیادہ تر فطرت سے ہم

[1] ہمارے دوست کی یہ تشخیص درست نہیں کیونکہ حلقہ احباب میں منشی پریم چند ہمیشہ بات بات پر ہنستے ہنساتے رہتے تھے۔

آغوش ہے۔ واقعات البتہ بعض جگہ عجیب سے ہیں، گجردھر ایسے استاد کا منور ما سی کمسن لڑکی سے روپیہ لے لینا، اور پھر جگدیش کی رانی کا اسی وقت وہاں سے گزرنا ایک فسانوی اتفاق سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

ترک دنیا اور ترک علایق کی تعلیم سے پریم چند کا جی کبھی نہیں بھرتا، اعلیٰ اخلاقی معیار صرف سیرتوں اور حالتوں میں محدود نہیں ہیں ان کے لیے علاحدہ لکچر بھی دیے جاتے ہیں۔

Villain اور ہیرو (بدمعاش اور سورما) کی سیرتیں بعض جگہ نقطۂ تضاد سے اس قدر الگ ہو گئی ہیں کہ اکثر عناصر مشترک ہو گئے ہیں ورنہ عام طور پر پیٹنٹ قسم کے ہیں جن کی فطرتیں ایک دوسرے سے اتنی برعکس ہیں کہ پناہ نہیں ملتی۔ تکرار کہیے یا یکسانیت، ہر جگہ نمایاں ہے۔

پریم چند ایسے فطرت نگار کے قلم سے جب اوا گون کے ثبوت میں نامانوس اور عجیب واقعات نکلتے ہیں تو حیرت کی آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں جگدیش پور کے راجہ کے تین جنم اور ہر جنم کی پوری یادداشت عجیب ہے اور اس سے زیادہ عجیب پہاڑیوں کی تاریک گھاٹی میں وہ محل ہے جہاں چار ہزار برس آگے والے سائنس کے آلات اور مشینیں کثرت سے ہیں ایک ہوائی جہاز بھی ہے جس پر بیٹھ کر عاشق و معشوق چاند کی سیر کے لیے جاتے ہیں۔ بیوی کا دو مرتبہ اعادۂ شباب بھی ڈاکٹر وروناف کے تجربات پر چشمک زنی کرتا ہے مگر ان تمام واقعات کی تہہ میں نفسیات کی تصویر کشی اور تشنہ کام شباب کا سیراب نہ ہونا نہایت کیف انگیز ہے۔

منورما کی سیرت گرگٹ کے مشابہ ہے۔ قربانی کے ہر پہلو نے اس کی کایا پلٹ کر دی ہے خود ہیرو چکردھر کی سیرت نگاری ایسی پاکیزہ نہیں ہے کہ لوگوں کی انگلیاں نہ اٹھ سکیں۔

ربط و روانی پہلے حصہ میں کچھ زیادہ ہے مگر رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے غائب ہو گئی۔ رانی دیو پریا کا کیریکٹر صرف انسان نما فرشتے سمجھ سکتے ہیں ہم جیسے سادہ انسانوں کے بس سے باہر ہے۔ خاتمہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ابھی بہت کچھ لکھنا تھا مگر مصنف نے گھبرا کر ختم کر دیا۔

(۵) بازارِ حُسن

سیوا سدن اس کا بڑا پیارا نام ہے۔ معلوم نہیں ایک ننھی منی سی کہانی میں کہاں سے اتنی سمائی آ گئی اس کے کیریکٹر زیادہ تر مرصع ہیں۔ دنیائے دل اور جہانِ دماغ کی مخلوق معلوم ہوتے ہیں۔ زبان زیادہ ناہموار نہیں ہے۔ مگر اثر بہت خوشگوار ہے اور دلچسپی اتنی زیادہ ہے کہ گاروں کچے اور سزا رو کی تصویریں نگاہوں میں پھرنے لگتی ہیں۔

سیوا کا جلال، شکوہ عظمت اور آل دیکھ کر بے ساختہ امنگ اٹھتی ہے کہ کاش ہم بھی ایسے ہی ہو جاتے۔ ناصحانہ رنگ کہیں کہیں بہت شوخ اور مذاق فہمائش نہایت خشک ہو گیا ہے۔ مکالمہ اور نفسیہ میں دوسرے کا پلہ کافی سنگین ہے۔

خود مصنف بھی کہیں کہیں ثالث بن گئے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہم خاموش سنیما کے پردوں پر آج سے دس برس پہلے والے بڑے بڑے تشریحی بورڈ دیکھ رہے ہیں۔

(۶) نرملا

پریم چند کی بلندیوں کے سامنے عرش بھی پست نظر آتا ہے اسی طرح ان کی پستی کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں۔ نرملا اور نرملا کے خاندان کی ساری مفروضہ ٹریجڈی ایسی انہونی مصیبتوں کا مجموعہ ہے جس کی مثال حیات انسانی کی تاریخ میں ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہستیاں چند سادہ نقوش تھیں جو ابھریں تو ایسی کہ سطح سے بلند نہ ہوئیں اور مٹیں تو یوں کہ کہیں کوئی چھاؤں بھی باقی نہیں۔ اس حریم سادہ میں ہمدردی اور دکھ کا کہیں پتہ نہیں ہے۔

ممکن ہے کہ جمنا بائی (اداکار) کی سادہ صورت کی ایک تصویر یہ بھی ہو جس کا اصلی حسن یہ سمجھا جاتا ہے کہ چہرے مہرے اور خد و خال پر جذبات و محسوسات کا کوئی اثر ظاہر ہی نہ ہو اور یہ شاہد ادب بھی سادگی کی جان ہو جس کے بگاڑ میں ہزار رنگ کی سنوار چھپی ہوئی ہو مگر جو آنکھیں برقی قمقموں کی تیز روشنی کی عادی ہوں اور یکا یک دھندلکے کی طرف دیکھیں تو سپیدی کی ہلکی ملاوٹ بھی اندھیرے کو نپت اندھیاری بنا دیتی ہے۔

اس کا مکالمہ بھی کہیں کہیں بے نمک اور طویل ہے اور شوخی اور حلاوت کی جگہ بے نمکی اور بے مزگی ہے۔

(۷) بیوہ

ناول نہیں ہے ایک طویل سا مختصر فسانہ ہے، فن اور اصول والے صرف طوالت کی بنیاد پر اسے ناول نہ کہیں گے مگر اس کی نفسی خوبیوں کے سامنے بڑے سے بڑا نکتہ چیں بھی اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہوگا۔

اس قصے کا کوئی واقعہ اور کوئی پہلو ایسا نہیں جو روزانہ کی زندگی سے الگ تھلگ ہو، ہاں فسانہ نویس

کی سحر نگاری نے ذرا ذرا سی بات میں کوٹ کوٹ کر موثنی بھر دی ہے۔

دان ناتھ اور پریما کی زندگی وہی ہے جس کا نقشہ کم وبیش ہندوستان کے ہر تیسرے گھر میں آسانی سے نظر آئے گا۔ خلش پر حیات کا دارومدار ہے ورنہ انسان مشین بن کر رہ جائے۔ جیسے نمک کے بعد چینی اور چینی کے بعد نمک کا مزہ کچھ اور ہو جاتا ہے ویسے ہی شادی شدہ زندگی میں ذرا سی کھچاوٹ اور ذرا سی لگاوٹ بھی حیات کے آئینہ کو نئی جلا دیتی ہے۔

پورنا کے پتی کا گنگا میں تیرتے ہوئے ڈوب جانا کوئی نئی بات نہیں ہے نہ اس میں کوئی انوکھا پن ہے لیکن کنول کی لاگ بیوی کی محبت اور جستجوئے مہلک کی وہ پاکیزہ تصویر کشی کی گئی ہے کہ ہم یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اپنی آنکھوں سے گنگا کے کنارے کھڑے ہوئے یہ سارا ماجرا دیکھ رہے ہیں اور ایک جوش سا پیدا ہو جاتا ہے کہ غضبناک لہروں میں کود کر ڈوبنے والے کو بچالیں مگر امرت رائے کے بدھوا بیاہ سے متفق ہوتے ہی اس واقعہ کا ہو جانا اپنے دامن میں افسانوی آمد کی نہیں آورد کی سی شان پیدا کر دیتا ہے۔ پورنا خود بھی وہ رسمی بیوہ نہیں ہے جو اکثر مکرر شادی کے فدائیوں کے صفحوں میں جلوہ ریز نظر آتی ہے۔

حیرت یہ ہے کہ بیوہ فسانے کا نام بھی ہے اور بیوگی کا بیان بھی طوالت کے ساتھ ہے، دوسری شادی کی تحریک بھی ہے مگر خود بیوہ ہیروئن نہیں ہے۔

امرت رائے تیاگی اور مجرد نوجوان ہیں اور ہیرو پرستی کی پوری شان سے آراستہ نظر آتے ہیں۔

بیوہ کا خاتمہ البتہ ''موتیوں کے جزیزے'' کی طرح نہایت ادیبانہ شوخ، کیف افزا ہے اگر ایک طرف یہ کمی محسوس ہوتی ہے کہ کیف و سرور مکمل نہیں اور خدا جانے امرت رائے اور پورنا کا کیا حشر ہوتو اسی کے ساتھ اس خیال سے تسکین ہو جاتی ہے کہ کم سے کم واقعات کی بھنور سے دونوں کی کشتی نکل گئی۔

ناول کا حاصل صرف اتنا ہے کہ آدمی سچا اور دھن کا پکا ہو تو ہزاروں مصیبتیں جھیل کر بھی تنہا قوت بازو سے ایک چھوٹا موٹا سا انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔

بدھوا آشرم یہی چیز ہے جو بیوہ کے صفحوں میں جلوہ افروز ہے تو اس قسم کے ادارے ہندوستان کے لیے نہایت ضروری اور مفید ثابت ہوں گے۔ پریم چند کی انصاف پسندی کی ایک جھلک اس سے بھی ملتی ہے کہ ''گنڈوں'' سے پست اخلاق رکھنے والے مرد بھی فطری خوبیوں سے بالکل عاری نہیں ہوتے۔ چھپے ہوئے جواہر ریزوں کی نمائش اس خوبی سی کی گئی ہے کہ مشاہدہ انسانی قلم کے بوسے لیتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

زبان بہت کمل اور پاکیزہ ہے، ہندی کے شبد اور فارسی کے الفاظ دونوں کثرت سے مگر بڑے

حسن سے استعمال ہوئے ہیں۔

(۸) چوگانِ ہستی

اگر پریم چند نے اپنی ساری عمر میں صرف یہی ایک ناول لکھا ہوتا تو بھی ان کو دنیا کے کامیاب افسانہ نویسوں کی صف میں عزت کی جگہ مل جاتی۔ برنرڈ کی جسارت، رسل کی آزادی، ڈکنس کی غربت نگاری، گالزوردی کا ساطنزیہ تبسم، ڈوما کی نقشہ کشی، راشد کی ٹیسیں، نظامی کی سادگی، نفیسی کی عظمت، شرر کا جوش، رسوا کی معنویت اور ٹیگور کی لطافتیں اگر ایک جگہ اور پورے تناسب کے ساتھ دیکھنی ہوں تو اس ناول کی سیر کیجیے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ چینی، جاپانی، مرہٹی، جرمنی اور ہندی سبھی زبانوں میں اس کے ترجمے یکساں مقبول ہیں۔

"Life is a stage" اور "World is a theare" ایسے کامیاب ناول بھی اس کے ساتھ تولے جائیں تو شاید ہلکے ٹھہریں۔

اندھا سورداس، جاہل ناکارہ بھکاری، بے بس، کیا کچھ نہیں مگر ہزار صفحے کے ناول کا ہیرو ہے اور ایسا کامیاب ہیرو کہ مقبول ناولوں کے مختلف ہیرو اس کے سامنے نہیں جچتے، اردو ناول کا یہ پہلا قدم ہے جہاں فطرت اور اخلاق نے رسمی شان وشکوہ کو ٹھکرادیا ہے اور جہاں ''درد'' اور ''خدمت'' کو اس کی اصلی جگہ ملی ہے۔

اس ناول میں نفسیاتی خوبیاں بھی ہیں اور زورِ بیان کا لطف بھی ہے۔ اس کی ہر چیز اثر سے بھری ہوئی ہے۔ طوالت ضرور ہے لیکن ایسی نہیں کہ ناظرین کا کہیں سے دم گھبرانے پائے۔ لفظ یہی ہیں جو ہم آپ ہر وقت بولتے ہیں پر جوہری کے ہاتھوں میں ان کا رنگ کچھ اور ہی ہے۔ ایسے نگینے بن گئے ہیں جن کے ہر رُوے سے نور کی جوت نکلتی ہے۔

(۹) میدانِ عمل

عدم تشدد، ترکِ موالات اور ستیاگرہ کی پوری تاریخ اس کے صفحوں میں بند کر دی گئی ہے۔ ناول کیا ہے 1921ء سے 1923ء تک کے ہندوستان کی تمام تحریکوں کی ایک پُر کیف داستان ہے جس نے وہ زمانہ دیکھا ہے اس کے لیے قند مکرر کا لطف ہے اور جس نے دیکھا ہی نہیں اس کے لیے اس زمانہ کے تاریخ و تمدن کا زندہ مرقع ہے۔

اس ناول کی جادو بیانی بالکل ویسی ہی ہے جیسے اسٹیج پر کھیل یا کسی بازیگر کا تماشہ، وہ جوش وہ زور اور وہ اثر نہیں جو گوکھلے، لاجپت رائے، محمد علی، گاندھی یا جواہر لال کی تحریر و تقریر میں ہوتا ہے۔

اس کی سیرت نگاری تشنہ ہے۔ امر کا کیریکٹر کہیں کہیں بہت پاکیزہ ہے لیکن محرکِ تقلید نہیں سلیم، سکینہ، اور کالے خاں کی سیرتیں نسائی نزاکتوں اور شاعرانہ طاقتوں سے مالا مال ہیں۔

بہ حیثیت مجموعی کتاب دلچسپ اور نظر فروز ضرور ہے۔ زبان اتنی اچھوتی ہے کہ دل میں اتر جاتی ہے۔

سیرت نگاری، آغاز، انجام، اتحاد، ربط، پلاٹ کی عمدگی، ذہنی تعطل، ظرافت، ہنگامہ آرائیاں، ملتجیا تدریجی ترقیاں، جذبات کا توازن، اعتدالی نزاکتیں سب کچھ اتنی نفاست کے ساتھ اس میں موجود ہیں کہ اگر ذرا بھی تفصیل سے کام لوں تو شاید جتنے صفحے اب تک لکھ چکا ہوں اتنے ہی صفحے اور لکھنا پڑیں اور پھر بھی تسلی نہ ہو۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اردو ناول سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کو کم سے کم اسے ایک مرتبہ ضرور پڑھنا چاہیے۔ درحقیقت اس کی زبان، طرز بیان، فنی خوبیاں اور اثر انگیزی اس قابل ہیں کہ ہر چیز پر تفصیلی نظر ڈالی جائے، مگر اس وقت یہ مزید طوالت کا باعث ہوگا۔

منشی پریم چند کا اُپدیش

(از سید مقبول حسین صاحب احمد پوری، بی۔اے، ایل ایل بی)

ہندوستان کی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں جس میں مصلحان قوم کا وجود نہ ہوا ہو۔ اس ملک کی ہر زبان شاعری، قصص اور اخلاقیات سے مالا مال رہی۔ ڈراما اور ناول لکھنے والوں کی بھی کمی نہیں رہی، مگر اردو زبان اور خصوصاً ہندی بھاشا میں تو ان کی بڑی کمی ہے۔ اردو میں سرشار، اور نذیر احمد کے بعد شرر پر نظر پڑتی ہے۔ ہندی میں یہ بھی نہیں۔ ایک منشی پریم چند البتہ اخلاقیات کے حامل اور ذہنی ارتقا کے پیام بر نظر آتے ہیں اور حقیقت میں ان کا وجود اس دور خلفشار کے لیے اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی پریم دھاراؤں کا سنگم تھا۔

منشی صاحب ناول اور افسانہ نگاری میں جو مہارت رکھتے تھے اس کا مقابلہ اردو یا ہندی میں بہت کم لوگ کر سکے۔ اخبار پانیر میں ایک نقاد فن نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ان کے متعدد ناول انگریزی زبان کے کامیاب ناولوں کے ہم پلہ ہیں۔

سطور ذیل میں مقابلہ و موازنہ سے اس کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک کامیاب ناولسٹ کے آہنگ و انداز سے متعلق رائے زنی کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کر دینا چاہیے کہ افسانہ دراصل ناول کا ایک دلچسپ خاکہ ہے اگر محاورۂ زبان اجازت دے تو اس کو ''اچھی ناول'' کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً منشی صاحب کا افسانہ ''نیک بختی کے تازیانے'' جو ان کی تصنیف فردوس[1] خیال'' کی ایک کڑی ہے۔ تھوڑی سی وسعت کے ساتھ ایک کامیاب ناول بنایا جا سکتا ہے۔ اس کے پلاٹ کا طربیہ پہلو حزنیہ انجام کا ذریعہ ہو کر ایک دلچسپ ٹریجڈی بہم پہنچا سکتا ہے افسانہ کا خاکہ بھی نہایت امید افزا اور دلچسپ ہے مثلاً رائے بھولا ناتھ نامی ایک دولت مند آدمی ہیں۔ ان کا نوکر نتھوا نامی ایک لڑکا تھا۔ رائے صاحب کی بھولی بالی لڑکی

---

[1] یہ مجموعہ گیارہ دلچسپ افسانوں کا مجموعہ ہے۔

رتنا کے کمرے کی صفائی کیا کرتا اور کبھی کبھی اس کے ساتھ کھیلا کرتا۔ ایک دن نتھوا کے جی میں کچھ ایسی سمائی کہ رتنا کے پلنگ پر چادر تان کے سو گیا۔ رائے صاحب نے کہیں اس حرکت کو دیکھ لیا۔ مارے کوڑوں کے غریب نتھوا کا کچومر نکال دیا۔ بچارے نے بھاگ جانے کی ٹھان لی۔ رتنا کی میم صاحبہ نے جو اس کی ٹیوٹرس تھیں۔ اس کو مسیحی مشن میں چلنے کی ترغیب دی۔ مگر وہ کرسٹان ہو جانے کے خوف سے نہ گیا۔ بھنگیوں میں جا کر گانا بجانا سیکھنے لگا۔ کسی استاد نے اسے پکا کر دیا، گوالیار میں کوئی موسیقی کانفرنس ہونے والی تھی۔ نتھوا نے وہاں جا کر اپنے جوہر دکھائے اور مدرسہ میں داخل ہو گیا۔ سب سے اونچی سند حاصل کی حتیٰ کہ اپنے استاد کے ساتھ یورپ کا سفر بھی کیا اور مغربی علم موسیقی پر بھی تھوڑا بہت عبور حاصل کر لیا۔ اب کیا تھا بابو ناتھو رام سوسائٹی کا زیور ہو گئے۔ ہندوستان کے بڑے شہروں کا دورہ کیا۔ لکھنؤ بھی آئے' یہاں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ رتنا نے پھول مالا پہنائی، رائے بھولا ناتھ سے بھی ملاقات ہوئی اور رائے صاحب نے اپنی صاحبزادی کا عقد استاد ناتھو رام میوزک ماسٹر سے کر دیا۔ قدرت نے رتنا کے پلنگ پر لیٹنے سے تازیانے بھی لگوائے اور پھر رتنا ہی کو ان کی لونڈی بھی بنا دیا۔ شادی کے ایک مہینہ بعد استاد ناتھو رام نے رتنا سے کہا کہ اگر تم میری حقیقت سے آگاہ ہو جاؤ تو ابھی شرمندگی اور غم سے نڈھال ہو کر رونے لگو۔ رتنا نے کہا ''میں سب جانتی ہوں لیکن رائے صاحب سے نہ کہیے گا ورنہ زہر کھالیں گے، میں نے تو جان بوجھ کر تمھیں اپنایا ہے۔''

مندرجہ بالا افسانہ کو وسعت دینے کے دو طریقے ہیں۔

اول یہ کہ ناتھوا کو مشن بھیج دیا جائے اور وہاں کسی لڑکی کو نتھوا کی بچھڑی ہوئی بہن وغیرہ ثابت کر کے ناول کا رخ ہی بدل دیا جائے یا اس کی ٹریجڈی بنا کر نتھوا کا حال رائے بھولا ناتھ پر رتنا کی شادی کے بعد ظاہر کر دیا جائے۔ اس طرح نئے واقعات کا اضافہ ہو سکتا ہے اور ناول کو کامیڈی سے ایک کامیاب ٹریجڈی کی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

منشی صاحب چاہتے تو انھیں افسانوں کو ناول کر دیتے مگر حیات مستعار پر کسے اعتبار وہ خلاصہ لکھ گئے تا کہ آنے والے نقادان معاشرت کو آسانی ہو۔

ناولسٹ یا افسانہ نگار کی حیثیت سے منشی صاحب مرحوم کا مطمح نظر مندرجہ ذیل صورتوں میں پیش کیا جا سکتا ہے، یعنی:-

۱۔ حسن اعمال اور حسن اخلاق کو مجاز سے حقیقت کی طرف لے جانا اور اس طرح کرم یا اعمال کو دھرم یا ایمان سے ہم رشتہ کرنا۔

2- معیار انسانیت کے کمال تک پہنچانے والے ارتقائی مدارج پر روشنی ڈالنا۔
3- محبت وطن اور آزادی کے پیام سے مذہبی اور معاشری تعلیم بہم پہنچانا۔

مرحوم نے مندرجہ بالا مطمح نظر کو جس انداز سے ظاہر کیا ہے، اس کے رنگ و آہنگ میں بڑے مزے کا اختلاف ہے۔ کہیں ویدانت کی تعلیم ہے، کہیں بھگتی کی، کہیں اخلاقیات کی زیادتی ہے۔ کہیں علم النفس کی، کہیں رنگ فطرت کا غلبہ ہے۔ کہیں حقیقت و مجاز کا امتیازی پہلو، کہیں یگانگت و اتحاد کے گیت ہیں، کہیں فرقہ وارانہ نوک جھونک اور بات بات میں تضاد طبیع نے دھوپ چھاؤں کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے اردو ہندی نے شیر و شکر ہو کر وہ لطف پیدا کر دیا ہے جو اردوئے معلی اور ٹھیٹھ بھاشا کو کبھی نصیب نہیں ہو سکتا اور لطف یہ کہ ظرافت کے تبسم کے ساتھ موسیقی کی ملاحت بھی ہے اور نغمہ روح کا لحن بھی ناول سے قطع نظر کر کے ایک ناکامیاب ڈرامے کے متعلق خود منشی صاحب کا یہ خیال ہے کہ اس میں:

''کہیں جذبات ہیں تو زبان نہیں، زبان ہے تو جذبات نہیں، ظرافت ہے تو گانے نہیں اور گانے ہیں تو ظرافت نہیں، جب تک یہ چاروں ارکان پورے نہ ہوں اسے ڈرامہ کہنا ہی بیکار ہے۔''[1]

ذیل میں ہم منشی صاحب کے چند ناولوں اور افسانوں پر ایک سرسری نظر ڈال کر ان کا مقابلہ انگریزی وغیرہ کے ناولوں سے کرتے ہیں۔ اس بحث سے متعلق ہمارے کئی عنوانات ہوں گے یعنی (۱) روحانی پہلو، (۲) اصلاحی پہلو، (۳) عملی پہلو (۴) فرقہ وارانہ پہلو، (۵) فنی موشگافیاں اور (۶) انتخاب

(۱) روحانی پہلو۔ روحانیت کا علم آج کل خارج از قیاس ہوتا جاتا ہے۔ اب لوگوں کو یہ کہنے میں بہت کم پس و پیش ہوتا ہے کہ روح میں نہ کوئی قوت ہے نہ تاثر، خیال سے اس کا کوئی تعلق نہیں، یہ تو برائے نام ایک نظریہ ہے لیکن درحقیقت اس قسم کی تشکیک ہی روح کی حقیقی پہچان کا ذریعہ ہے، روح کو حساس ماننے کے لیے صرف یہ دلیل ہی کافی ہے کہ جسمانی تکالیف کی طرح روحانی تکالیف بھی ہوا کرتی ہیں۔ روحانی تکلیف کا احساس انسان کے دل کی وہ ندامت ہے جو ارتکاب معصیت کے بعد محسوس ہوتی ہے اور یہ موخر الذکر تکلیف کبھی کبھی اس قدر شدید ہوتی ہے کہ انسان رو پڑتا ہے۔ جسمانی تکلیف کا علاج تو دوا سے ہو جاتا ہے مگر اس روحانی تکلیف کے علاج کو بڑے ریاض اور تپسیا کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہاں ضمیر کی آواز لعنت ملامت کر کے اپنی نوائے لاہوتی سے ایک طرح کی ڈھارس ضرور باندھ دیتی ہے کہ ''باز آ''

---

[1] ڈیڈ یکیشن ''ہمایوں'' جنوری 1932ء

ہر وہ شخص جو دنیا میں پاک زندگی اور عمل نیک کا خواہاں ہو، اس کی آزمائش کارکنان قضا و قدر بڑی سختی سے کرتے ہیں۔ قرآن شریف میں لکھا ہے کہ خدا اپنے بندوں کو بھوک پیاس کی تکلیف میں مبتلا کر کے اور ان کے جان و مال کو خطرے میں ڈال کے آزماتا ہے کہ آیا تکالیف کی حالت میں وہ خدا کو بھول جاتے ہیں یا یاد رکھتے ہیں۔ اس کی تمثیل حضرت ایوبؑ پیغمبر کے قصے کا پلاٹ ہے۔ آزمائش کا سب سے بڑا ذریعہ جس کا اکثر جگہ ذکر کیا گیا ہے شہوانی جذبات ہیں۔ ان جذبات کو قابو میں رکھنے کا انعام مصر کی سلطنت اور آل عمران میں ابن مریمؑ ہیں۔ قرآن شریف کا وہ دلچسپ افسانہ جو یوسفؑ و زلیخا کی طرف منسوب ہے اسی آزائش کی تشریح ہے۔

دنیا میں بہت کم ایسے افسانے یا ناول ہوں گے جن کے پلاٹ کا مقصد شہوانی جذبات کو قابو میں رکھنے سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ آزمائشی اسباب سے ہی آدم اور ابلیس کی داستان شروع ہوئی اور آزمائش ہی ہمارے وجود کی غرض و غایت ہے۔ مغربی ناولسٹ میری کوریلی کے متعدد ناول اسی غرض و غایت کی تفسیر ہیں۔ اس کا ایک ناول ''شیطان کا غم والم''[1] اس آزمائشی پہلو کی ایک دلچسپ تمثیل ہے جس کا خاکہ مختصر الفاظ میں اس طرح ہے۔

''ایک مفلس ادیب' اپنی تصانیف کی اشاعت کے لیے اپنی مالی حالت مضبوط کرنا چاہتا ہے۔ وہ دولت کا متلاشی ہے' اپنے نزدیک اس نے دل کا مخلصانہ پیام اپنی کتاب کے ذریعہ سے سب کو پہونچایا ہے لیکن خدا اور اس کے وجود کا وہ قائل نہیں۔ اس کے پیام کی طرف کوئی التفات نہیں کرتا کیونکہ بوجہ ناداری وہ اپنی تصانیف کو عوام تک نہیں پہونچا سکتا۔ ایک نامعلوم شخص جو خود کو شہزادہ کہتا ہے، مالی امداد پر آمادہ ہو کر اسے اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ یہ ادیب اسی دوران میں اپنے کسی دولت مند رشتہ دار کی جائداد ترکے میں پاتا ہے۔ مختصر یہ کہ حضرتِ زرا سے حسن و عشق کی طرف لے آتے ہیں اور لکھ پتی ادیب ایک عالی خاندان مگر مفلس لارڈ کی لڑکی سے شادی کرتا ہے، مگر وہ لڑکی مذکورہ بالا شہزادہ پر جان دیتی ہے۔ یہ راز ادیب پر ظاہر ہو جاتا ہے اور وہ شہزادہ سے جواب طلب کرتا ہے۔ زمیندار کی لڑکی اس بات پر خودکشی کر لیتی ہے۔ لکھ پتی ادیب بھی روحانی اور دماغی خلفشار میں مبتلا ہو کر خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ شہزادہ ادیب کو ایک کمرے میں جو جہاز پر ہے بند کر دیتا ہے۔ سمندر طوفانی ہواؤں کی کشتم پچھاڑ سے ہانپ رہا ہے۔ لکھ پتی ادیب زور لگا کر کمرہ کھول دیتا ہے شہزادہ کو

---

[1] ناول Sorrows of Satan

سر سے پیر تک دیکھ کر کہتا ہے کہ میں تو تمھیں اپنا دوست سمجھتا تھا۔ شہزادہ صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ نہیں میں تمھارا دشمن ہوں، تم مجھ سے کتنی ہی دوستی کرو، میں دشمنی سے باز نہ آؤں گا۔ ایسی حالت میں لکھ پتی ادیب کو خدا یاد آتا ہے، شہزادہ اپنے آپ کو ظاہر کر کے کہتا ہے کہ پہچانو میں وہی ہوں جس نے آدم کو جنت سے نکلوایا تھا۔ اسی روپ میں شہزادہ (یا شیطان) اس لکھ پتی ادیب کو عالم ناسوت کی سیر کراتا ہے۔ وہاں جہاز ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا ہے۔ لکھ پتی ادیب ایک بہتے ہوئے تختے پر سمندر کے آغوش میں موجوں کے تھپیڑے کھاتا ہوا بہتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اسے ایک غیبی آواز یہ کہتی ہوئی سنائی دیتی ہے کہ "اسے دوبارہ دنیا کی اندھیر نگری میں چھوڑ دو تاکہ نئے سرے سے ظلمت میں خدا کے نور کو تلاش کر سکے۔"

منشی صاحب نے میری کوریلی کے اس آزمائشی پیام کو کوئی جگہ تسلیم کیا ہے۔ اپنے ایک ہندی افسانہ "پالا گن[1]" میں وہ لکھتے ہیں کہ "لابھ کی ترشنا کبھی شانت نہیں ہوتی، پرنتو اس ترشنا میں شانتی چھپی ہوتی ہے" اس کا ثبوت منشی صاحب نے اپنے ناول "پردۂ مجاز" میں دیا ہے۔ جس میں تین کیریکٹر قابلِ غور ہیں۔ منورما، جاہ و حشم پر جان دیتی ہے۔ رانی دیوپریا ابدی جوانی اور حسن پر دیوانی ہے، اور ہرش پور کے راجکمار اندر بکرم سنگھ جو محبت کی آرزو سے چھٹکارا پا سکے محبت کے سمندر میں غوطے کھا رہے ہیں۔

معلوم ہوا کہ کھری مکتی اور کامل نجات کے لیے محبت کو بھی تج دینے کی ضرورت ہے۔ "پردۂ مجاز" کی دو جلدیں ہیں، پہلی جلد تو ایک معمولی سی تمہید ہے، دوسری جلد میں وہ سب کچھ ہے جس کے لیے اصل میں مسئلہ تناسخ پر ایک دلچسپ تبصرہ ہے۔ منشی صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ اگر واقعی پریم سے مکتی حاصل ہو سکتی ہے تو اس کا ذریعہ شہوت کشی ہی ہے۔ ناول کے مطالعہ سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ منشی صاحب ویدانت فلاسفی پر کافی عبور رکھتے تھے۔ اور اُپنشدوں کی حکایتیں ان کے دماغ میں محفوظ تھیں۔ ناول کے پلاٹ کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ حقیقی اور مجازی، روح اور جسم کی طرح یہ دونوں پہلو ساتھ ساتھ رکھے گئے ہیں۔ ناول کا مجازی رخ دنیاوی جاہ و حشم سے متعلق ہے، اس کا حقیقی رخ پریم کی راجدھانی سے تعلق رکھتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس ناول کے پلاٹ کی بنیاد میر صاحب کے اس شعر پر ہے ؂

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا تم کو
وگرنہ تم خدا تھے گر دل بے مدعا ہوتے

ذیل میں ہم پلاٹ کے صرف حقیقی رخ کا خاکہ پیش کرتے ہیں کیونکہ یہی ناول کی جان ہے۔

---

[1] دیکھئے "مادھوری" لکھنؤ

دوسرا رُخ تو محض جسم ہے۔

''جگدیش پور کی رانی دیو پریا کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا مگر رانی کی ہوس یا آرزو یہ تھی کہ ایک بار پھر جوانی کے مزے اڑاتی' کیونکہ دیوتا بھی یہی بروان مانگتے ہیں کہ پیری کی بلا کبھی ان کے سر نہ آئے۔ بھادوں کے مہینے میں ہرش پور کے راجکمار اندر بکرم سنگھ کی دعوت تھی۔ دیو پریا کو اپنے بڑھاپے پر بڑا افسوس ہوا' اس نے مصنوعی روغنیات سے خود کو آراستہ کیا اور تھوڑی سی اکسیر پی لی جس سے آنکھوں میں شباب اور سرخی دوڑ گئی۔ راجکمار سے ملاقات ہونے پر بڑے ناز و انداز دکھائے۔ دیر تک آنکھوں کے ذریعہ سے پیام عشق کا تبادلہ ہوتا رہا یہاں تک کہ رانی نے محسوس کیا کہ اکسیر کا اثر زائل ہو رہا ہے۔ جب پیری کے ضعف کا بہت غلبہ ہوا تو رانی رو پڑی اور شرم سے منھ چھپا لیا۔ راجکمار نے کہا کہ دیوی مجھے تمھاری اسی صورت سے محبت ہے۔ میں وہ چیز چاہتا ہوں جو اس صورت کے پردے میں چھپی ہے' ذرا مجھے غور سے دیکھو۔ مجھے پہچانتی ہو' کبھی دیکھا ہے۔ رانی نے حیرت میں آکر راجکمار کے چہرے پر نظر ڈالی۔ آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔ ایک وارفتگی کے عالم میں دیو پریا نے کہا' 'پران ناتھ کیا تم اس شکل میں؟'' کیا کوئی انسان بھی مجاز کی اتھاہ تاریکی کو یوں چیر سکتا ہے۔ زندگی اور موت کی درمیانی خلیج کا پار کرنا تو دیوتاؤں کا کام ہے۔ راجکمار نے کہا کہ رانی کچھ دنوں کے لیے موت نے مجھے تم سے جدا کر دیا تھا۔ میں فضائے بسیط کے لا متناہی خلا میں اڑتا رہا۔ دفعتاً ایک دن غائب ہو گیا جب ہوش آیا تو راجہ ہرشپور کا نوزائیدہ لخت جگر تھا۔ مجھے مانسرور تال پر ایک مہاتما کے درشن ہو گئے۔ ان کی تعلیم سے ہستی کے وہ اسرار جن پر اب تک پردہ پڑا ہوا تھا مجھ پر کھل گئے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ میری بیوی جگدیشپور میں ہنوز زندہ ہے۔ چنانچہ تمھارے پاس جگدیش پور آخر میں آ ہی گیا' گو ہمارے سوامی جی نے منع کیا تھا۔ غرض راجہ اپنی رانی دیو پریا کے عشق کو نہ چھوڑ سکا باوجودیکہ اس کو رشیوں کا بردان حاصل تھا اور وہ علم غیب جو اسے تھا اس علم سے دوسرے محروم تھے۔ راجہ کی محبت نفس کی آلائشوں سے پاک نہ تھی۔ وہ حتی المقدور ان آلائشوں سے دور رہنا اور بھاگنا چاہتا تھا۔ مگر یاس کی پیاس اور ترشنا کی تیزی اسے بار بار آزمائشی دنیا میں کھینچ لاتی تھی۔ ناول میں اس قسم کے دو آزمائشی دور دکھائے گئے ہیں' ہر دور میں راجہ نیا برن لیتا ہے اور اپنی غیبی قوت سے رانی کی عمر کو تبدیل کر کے حسن و شباب کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے مگر خود

کو اس سے دور رکھتا ہے۔ پہلا آزمائشی منظر ایک کوہستانی غار کی چٹان پر ہے۔ راجہ مہندر (یعنی راجکمار) رانی دیو پریا کے ساتھ یہاں یوگ کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے' رانی بھی ریاضت و خدمت اپنا شعار بناتی ہے۔ راجہ کی کشیدگی سے رانی کو الجھن ضرور ہے کیونکہ وہ شباب کی نعمت پانے کے بعد اس پھول کے پھل کی بھی متلاشی ہے' لیکن راجہ کا مقصد محض خوشبو کو برقرار رکھنا ہے' لیکن مایا کے سمندر میں تختہ بند ہونے کے بعد تر دامنی سے بچ کر نکل جانا تو آزمائش کی بڑی دشوار منزل ہے۔ راجہ مہندر رات کو یوگ ابھیاس کرتے ہیں' نہ جانے کب اور کہاں جاتے ہیں اور کیسے اچانک چلے آتے ہیں۔ آخر ایک دن رانی دیو پریا نے کہا کہ تم نے میرا ظاہر بدلا تھا تو باطن بھی بدل دیا ہوتا۔ راجہ بولے یہی تو میں بھی چاہتا ہوں ۔ رانی چپ ہوگئی۔ سمجھی کہ پہلی فروگذاشتوں کی وجہ سے وہ پرہیز کرتے ہیں۔ ایک دن راجہ کی طبیعت میں ولولہ پیدا ہوا۔ جی میں جوانی کی امنگ ہچکولے کھانے لگی۔ راجہ نے کہا کہ دیوی چلو آج عالم بالا کی سیر کریں۔ راجہ صاحب رانی دیو پریا کو ایک بمان پر بٹھا کے بلند ہوئے' جو تارے زمین پر ٹمٹماتے نظر آتے تھے۔ وہ اب چندر ماں ہو گئے تھے اور چندر ماں اپنی وسعت سے دس گنا بڑا نظر آتا تھا۔ کائنات پر کامل سکون تھا' نور کی سنہری بارش ہو رہی تھی' دیو پریا کے کان میں ایک لاہوتی نغمے کی آواز سنائی دی۔ راجہ نے کہا کہ ہمارے سوامی ایشور کی مدح میں گانا گا رہے ہیں۔ راجہ نے دیو پریا سے ایک گیت گانے کی فرمائش کی۔ دیو پریا نے بینا اٹھائی اور نہایت سہانے سر میں گیت گایا۔

''پریا ملن ہے کٹھن باوری''

راجہ کے دل میں ایک بیتاب خواہش جس میں جنوں کی شدت تھی بیدار ہوگئی' راجہ نے کہا

جوانی سے صبر کی سخت جانی جو صبر آزما ہو نہیں وہ جوانی

اور اس کے پھڑکتے ہوئے ہونٹ دیو پریا کے رخساروں پر آگئے۔ بمان مائل بہ پستی ہوا، تحت الثریٰ کو گرنے لگا' راجہ کے قابو سے باہر تھا' ایک دھماکے کی آواز آئی۔ راجہ پھر موت کے چنگل میں گرفتار کرلیا گیا اور عالم نزع میں راجہ نے کہا:

''دیوی! ہم تم پھر ملیں گے۔ یہ تشنہ آرزو مجھے تمھارے پاس پھر کھینچ لائے گی۔ غیب کے بیدرد ہاتھ اسے نہیں روک سکتے۔''

تیسری مرگ و زیست کی منزل آزمائش نمبر دو ہے۔ اس مرتبہ راجہ کا نام سنگھدر ہے۔ اپنے باپ

چکر دھر سے مل کر رلعبہ گھر واپس ہو رہا تھا۔ ہرش پور کے اسٹیشن پر ایک اضطراری کیفیت طاری ہوئی' اتر پڑا' ہرش پور کی بیوہ رانی کملا دیوی عبادت و ریاضت میں زندگی کے آخری ایام کاٹتی تھی' رلعبہ جوگی کے بھیس میں رانی سے ملا' یاد دلائی اور اس کے اجڑے ہوئے شباب کو پھر حسن و جمال کے آغوش میں دے دیا۔ یکا یک کملا کو اپنی قلب ماہیت یاد آئی' ایسی ایسی آرزوئیں اور ایسی ایسی امنگیں بیدار ہو گئیں جنھیں رانی نے اپنی تپسیا اور برت سے دفن کر دیا تھا۔ لیکن نفس مرا نہیں تھا۔ محض سو گیا تھا۔ لٹے ہوئے سہاگ نے نیا چولا بدل کر نفس پروری کی مکروہ صورت سامنے کھڑی کر دی۔ رلعبہ سنکھدر کملا سے مطلق ملتفت نہیں ہوتا تھا' کملا اس کے پاس بار بار جاتی اور دعوت حسن دے کر لوٹ آتی۔ شاید رلعبہ کا بار بار ہرن لے کر رانی کو تعلیم دینا ہی مقصود تھا۔ ایک دن کملا نے جوگیا روپ بھرا سنکھدر کملا کے فطری روپ کو دیکھ کر وجد میں آ گیا۔ کملا اس کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ ایک بار پھر کملا مجازی محبت کے آغوش میں پہنچ گئی۔ رلعبہ کے پہلو میں جا کر اس نے پھر روحانیت کی دولت پر ڈاکہ ڈالا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ زمین دھنستی جاتی ہے اور آسمان اُڑا جاتا ہے۔ سنکھدر پر مرگ کی بیہوشی پھر طاری ہو گئی اور اس نے دم توڑتے ہوئے کہا:

''دیوی رخصت' ہم آزمائش میں پھرنا کام رہے' مرگ و زیست کے دور اس وقت تک چلتے رہیں گے جب تک محبت نفس کی آلائشوں سے پاک نہ ہو گی۔ ہماری زندگی اسی آزمائش کے لیے مخصوص ہے۔''

منشی صاحب نے اس ناول یعنی ''پردہ مجاز'' میں فلسفہ ویدانت سے متعلق اُپنشدوں کی اس حکایت کو نہایت خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے جو ایک سنیاسی کی آخری حسرتوں کے انجام سے تعلق رکھتی ہے۔ تارک الدنیا ہو کر یہ سنیاسی ایک ندی کے کنارے تپسیا کیا کرتا تھا' اس نے ایک ہرن کا بچہ پالا تھا اس بچے سے اس کو بڑا پریم تھا اس بھولی بھالی جنگلی نرم سنکمار ننھے' جذبات سے بھری رسیلی مگر وحشی آنکھیں سنیاسی کے دل کو قابو میں کیے ہوئے تھیں' آخر موت کے فرشتے نے آ کر سنیاسی کو یم کی بارگاہ کا پروانہ پہنچایا۔ سنیاسی نے پران تج دیے لیکن ہرن کی محبت نے اس کی آتما کا ساتھ نہ چھوڑا۔ انجام کار دوسرے جنم میں سنیاسی ہرن بنا کر دنیا میں پھر بھیجا گیا اور جنگلوں میں چھلانگیں بھرنے لگا[1] اس کا دھیان ایشور کی طرف نہ تھا بلکہ اس کے من کے مندر میں ہرن کی پوجا ہوتی تھی۔ افسوس ان لوگوں پر جو پتھروں کے دس سیر کے پوجتے ہیں' کبیر نے اسی کا رونا رویا ہے۔

کوئی پوجے پاتھر کوئی پوجے ڈھیلا ہری کا کوئی نہ جھنیلا رے بابا

[1] اپنشد ھ

ان مثالوں کو دیکھ کر کم از کم یہ بات ضرور تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ فلسفۂ تناسخ روحانی تعلیم کے لیے نہایت ہی دلچسپ چیز ہے، اگر چہ مسلمان اس کے قائل نہیں ہیں۔ یہاں پر طوالت کے خوف سے حضرت ابراہیمؑ کی بیٹے کو قربان کرنے والی آزمائش کا ذکر، اور حضرت مولانا رومؒ کی مثنوی سے سوداگر اور طوطی والی حکایت کا خلاصہ نظر انداز کیا جاتا ہے۔

ناول پردۂ مجاز کے پلاٹ کا دوسرا رُخ بالکل ایسا ہے جیسا کہ عام ناولوں میں ہوتا ہے۔ اس مجازی پہلو کو قلم انداز کرنے کے بعد یہ لکھنا ضروری ہے کہ پردۂ مجاز میں جنم بدلنے والے راجہ کی طرح اور بار بار آغوشِ شباب میں کھیلنے والی رانی کی طرح جو اپنی حقیقت سے آگاہ ہونے کے باوجود نفس امارہ سے نجات نہ حاصل کر سکے، منشی صاحب نے ایسے کیرکٹر بھی آزمایشی اکھاڑے میں بُلائے ہیں جو کارکنان قضا وقدر کے ہاتھوں میں کٹ پتلی کی طرح بے بس تھے۔ اس اعتبار سے منشی صاحب کو مشہور انگریزی ناولسٹ ٹامس ہارڈی سے اتفاق ہے۔

منشی صاحب کا ناول ''چوگان ہستی'' جو غالباً بہترین تصنیف ہے کسی انگریزی ناول سے کم مرتبہ نہیں معلوم ہوتا۔ اس میں مسیحی خاتون صوفیہ کا مقابلہ ہارڈی کے ناول ''دیسیونگی ریٹ وا پسی'' میں Eustacia Vye سے کیا جا سکتا ہے۔ شرّر کے ناول ''فلورا اور فلورنڈا'' میں غریب فلورا تارک الدنیا رہ کر پاک مسیحی زندگی بسر کرنا چاہتی تھی، اُسی کے لگ بھگ صوفیہ بھی اپنے مذہب کی پابندیوں سے نجات حاصل کر کے سچائی کی متلاشی تھی۔ فلورا کے لیے مسیحی پادری ''اخوان الشیاطین'' ثابت ہوئے صوفیہ کو خود اُس کے دل نے مجبور کیا۔ Eustacia Vye ستم ظریفیوں کا شکار ہو کر انجام کار خدا کی شکایت کرنے پر مجبور ہوئی۔ اگر دیوتا ابتدا ہی سے اُسے پختہ کار بنا دیتے تو کوئی شیطان اُسے بہکا نہ سکتا، بالآخر اُس نے کہا کہ:

''اے وہ خدا جس نے مجھے اس دنیا میں لا ڈالا، میں کیا کچھ نہ کر سکتی تھی، لیکن مجھے اُن اسباب نے ہلاک کیا، جو میرے قابو سے باہر تھے، یہ ہلاکت آمیز آزمایش کیا میرے ہی لیے تجویز ہوئی تھی، میں تو ایک ناچیز ہستی ہوں، جس نے تیرا کچھ نہیں بگاڑا۔''

منشی پریم چند کے ناول ''گوشۂ عافیت'' میں گائتری کی زبان سے بھی اسی قسم کے الفاظ نکلتے ہیں، وہ خدا کی طرف جا رہی تھی مگر شیطان نے اُسے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ پاپی گیان شنکر نے مایا لوبھ کے نشے میں آ کر اُس کی عصمت کو لُوٹ لیا، اُس نے بھی کہا کہ ''ایشور میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا'' اور یہ کہ ''جو کچھ ہو میں اس سے (گیان شنکر سے) اپنی عصمت کے خون کا بدلہ ضرور لوں گی اور اس کا سر اس طرح

1۔ اُپنشد 2۔ شناسا 3۔ the Return of Native 4۔ گوشۂ عافیت جلد دوم

کچلوں گی جیسے سانپ کا سر کچلا جاتا ہے"۔

آخر وہ خود اپنے آپ سے روٹھنے کے بعد دنیا والوں سے بھی روٹھ گئی۔

ہندوستان کی شریف زادیاں تریا چرتر کے فن کو تو جانتی نہیں، اس لیے وہ دوسروں کے اطوار و کردار کا بہت جلد نشانہ بن جاتی ہیں۔ اگلے زمانہ میں شریف نوجوانوں کو آداب مجلس سیکھنے کے لیے شاہدان بازاری سے بھی سبق دلوایا جاتا تھا۔ منشی پریم چند بھی ایک مخالف کیرکٹر کی زبانی یہ کہتے ہیں کہ "جب تک انسان مدرسہ حسن میں شاگردی نہ کر لے اُس کے مزاج میں نفاست و لطافت نہیں آتی۔" بہر حال جس طرح ٹامس ہارڈی کے بھولے بھالے دیہاتی کیرکٹر شہر میں کھینچ کر لائے گئے ہیں، اسی طرح منشی پریم چند کی پردہ نشیں دیویاں بھی آزمائشوں کی تعلیم کے لیے پردے سے نکال کر بازار حسن میں تیزی و طراری سیکھنے کے لیے لائی گئی ہیں۔

انگریزی ناولسٹ ہال کین[۲] کی ہیروئن میری[۳] کی مصیبت سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ میری جو اپنے محبوب مارٹن سے جدا ہو کر لارڈ را کے ساتھ زبردستی بیاہ دی گئی تھی۔ ایک دن لارڈ را کے محل سے پوشیدہ بھاگ نکلی اور لندن پہنچی۔ وہاں اس کے لڑکی پیدا ہوئی لیکن آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس نے مختلف مقامات پر ملازمت کی اور اس سلسلے میں شاہدان بازاری سے بھی اس کی راہ و رسم ہو گئی۔ ان معشوقان عاشق نواز سے بڑھ کر تریا چرتر کا فن کون جان سکتا ہے چنانچہ میری کو وہاں ایک عجیب سبق حاصل ہوا۔ اسی طرح شرر کی ناول "بدالنسا کی مصیبت" میں سادگی اور پردہ نشینی سے جو نتائج پیدا ہوئے ان کا انجام تریا چرتر کے فن کی سفارش کرنے میں سب سے پیش پیش ہے۔ اندازہ کرنے کی بات ہے کہ دو جگہوں سے دلہنیں رخصت ہو کر آ رہی ہوں اور دونوں بدل جائیں ایک سیدانی پٹھان کے یہاں پہنچی اور پٹھانی سید صاحب کے یہاں آئے اور اس قسم کی غلطی سے جو بدنامی اور تباہی دونوں گھرانوں میں پھیل سکتی ہے اس کا ذکر فضول ہے۔

مولوی نذیر احمد صاحب کے افسانے بنات النعش اور مرأۃ العروس بھی اس حقیقت کے شاہد ہیں۔ مرآۃ العروس کی پھوہڑ اکبری بیگم کو کٹنیوں نے کیسا ٹھگا مگر اس طرح تباہ ہونے کے بعد آخر وہ بھی ہوش میں آ گئی۔ خود پریم چند کی ہیروئن سمن[۴] بائی نے شاہدان بازاری ہی سے انسانیت سیکھی۔ پڑوس میں بھولی بائی رقاصہ رہتی تھی اس نے اپنی صحبت میں رکھ کر سمن بائی کو عقل کی دیوی بنا دیا۔ یہ مانا کہ ہر جگہ اس

---

[۱] بازار حسن جلد دوم [۲] Hall Cane [۳] The Woman thow hast given me

[۴] بازار حسن جلد دوم

قسم کی تعلیم کا انجام ٹریجڈی ہے مگر مرد اس سے دیوتا اور عورتیں دیویاں ہو گئی ہیں۔ ''گوشہ عافیت'' کی ہیروئن گائتری کی بابت خود منشی صاحب نے لکھا ہے کہ گیان شنکر کی شیطانی صحبت نے اسے پکی دیوی سے پکی دیوی کر دیا تھا اور یہ واقعہ ہے کہ جب تک حضرت آدم اور حضرت حوا کو شیطان نے پٹی نہیں پڑھائی وہ آدمی نہیں بنے اگرچہ فرشتہ بنے رہے۔ اسی اعتبار سے بقول علامہ اقبال شیطان کا یہ دعویٰ سچائی سے خالی نہیں کہ آدمی کا معلم شیطان ہے۔ بال جبرئیل میں شیطان خدا کے ایک مقرب فرشتے سے کہتا ہے کہ میرے لہو سے انسان کی داستان رنگین ہو گئی[1] میں نے اسے انسانیت سکھائی اور میری ہی وجہ سے اس نے خدا کو پہچانا۔

(۲) منشی پریم چند کا اصلاحی پہلو

متوسط طبقے کی طرز معاشرت کو مدنظر رکھتے ہوئے منشی صاحب کا اصلاحی پیام زیادہ تر اسی طبقے سے متعلق ہے۔ یوں تو راجے مہاراجے ان کی ناولوں میں بھرے پڑے ہیں' تاہم اصلاحی پہلو زیادہ تر کلرکوں' دیہاتیوں اور متوسط گھرانوں سے وابستہ کیا گیا ہے۔ تعلیم عبرت دینے اور آزمائشی مرحلے طے کرنے کے لیے راجہ مہاراجہ لائے گئے ہیں۔

ان کا مضمون نوک جھونک[2] اصلاحی پہلو کی نمایاں تمثیل ہے۔ نوک جھونک میں قومی اور معاشی رواداری اور اس کے مناسب محل عمل پر بحث کی گئی ہے۔ افسانہ نیک بختی کے تازیانے[3] میں بیجا غرور اور ظلم کی حد تک پہنچنے والے احساس شرافت کا تماشا دکھایا گیا ہے۔ ''آہ بیکس''[4] میں ظاہر کیا گیا ہے کہ اگر دنیاوی عدل و انصاف کی مشینری جرائم کی تحقیق سے قاصر رہے تو صرف دل کی آہ ہر قسم کی سیہ کاریوں اور ظلم کو مٹانے کے لیے کافی ہے منشی صاحب حکام وقت کی رعونت سے نالاں ہیں' جس کا ثبوت ان کے افسانہ ''بڑے بابو[5]'' سے ملتا ہے۔

زبردست کی زیردست پر خواہ مخواہ کی دھونس انھیں ناپسند تھی' ہریجنوں کے ساتھ انھیں خاص ہمدردی تھی۔ افسانہ ''تالیف[6] قلوب'' میں ان لوگوں کے ظرف کو وسعت دینے کی کوشش کی گئی ہے جو منہ سے ہریجنوں کی ہمدردی کا دم بھرتے ہیں مگر ان کے دل ان سے موافقت کرنے پر تیار

---

[1] اقبال: داستاں انساں کی رنگیں کر گیا میرا لہو: تو فقط اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو۔ یہ شعر شیطان نے بطور طنز فرشتے سے کہا ہے۔ (بال جبریل) [2] خواب و خیال [3] فردوسِ خیال [4] پریم پچیسی حصہ اول [5] خاک پروانہ
[6] خواب و خیال

نہیں۔

محض دنیاوی اغراض کو مدنظر رکھ کر وہ تبدیلی مذہب کے خلاف تھے جس کا اظہار ''شدھی[1] '' میں کیا گیا ہے۔

روحانی اصلاح کے متعلق اوپر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے' افسانہ نغمہ روح[2]' میں انسان کے حسن و خیال کو نغمہ لاہوتی کہا گیا ہے۔

متوسط طبقے کی طرز معاشرت کو مدنظر رکھتے ہوئے مذہبی اعتبار سے منشی صاحب قدامت پسند تھے مگر لبرل خیالات سے انھیں بیر نہ تھا۔ جس کا اظہار ان کے ناول ''بازار حسن'' اور ''چوگان ہستی'' میں کیا گیا ہے۔ البتہ سیاسی اعتبار سے منشی صاحب انتہا پسند کانگریسی تھے اور اس کا ثبوت انھوں نے اپنے ناول ''میدان عمل'' اور افسانہ ستیا گرہ[2] میں دیا ہے۔

زبردست کی زیردست پر زیادتی ان کے لیے سوہان روح تھیں (آہ بیکس[3]) اور وہ اس بات کے قائل تھے کہ ظلم و ستم ایک نہ ایک دن اپنی خودکشی آپ ہی کرلے گا (افسانہ ''فکر دنیا'') اور مظلوموں کا انتقام ایسا سخت گیر ہوتا کہ بڑے بڑے راجے مہاراجے اس سے زیر ہو جاتے ہیں۔ (افسانہ ''ذکر ماءت کا تیغہ[4] اور گناہ کا اگن کنڈ[5]

کسانوں سے منشی صاحب کو بڑی ہمدردی تھی ان کا ناول ''گوشۂ عافیت'' مخصوص طور پر کسانوں کے حقوق کی نگہداشت کا پرچار کرتا ہے۔

ناول ''میدان عمل'' میں دیہات کی اصلاح کے لیے حاکمان وقت کو آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے کہ منشی صاحب سیاسی اعتبار سے کانگریس کے ہوا خواہ تھے' ان کا ناول ''میدان عمل'' تو گویا پنڈت جواہر لال نہرو کی خودنوشت سوانح عمری ''میری کہانی'' کی تفسیر ہے۔ ''میری کہانی'' کے دو حصے ہیں۔ میدان عمل کے چھوٹے چھوٹے پانچ حصے ہیں۔ دونوں کا پلاٹ ایک ہی معلوم ہوتا ہے۔ دونوں میں حکومت سے جنگ چھڑی ہوئی ہے' دونوں دیہاتی اصلاح اور کامل آزادی کے گیت گا رہی ہیں، دونوں میں ہندو مسلمان دوش بدوش چل رہے ہیں۔ دونوں میں ہندو فدایان قوم حکومت پرست مسلمانوں کی آنکھیں کھولنے اور ان کو دنیا کی اصلی حالت سے آگاہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور دونوں میں پکڑ دھکڑ' لاٹھی چارج' جیل خانہ شورش' فساد اور بلوے اپنی اپنی جگہ انقلابی مناظر پیش کر کے ایک

---

[1] خاک پروانہ [2] خاک پروانہ [3] پریم پچیسی [4] پریم پچیسی حصہ اول [5] پریم پچیسی حصہ اول

نئی منزل اور نئے دور کی پیشین گوئی کررہے ہیں۔ ''میدان عمل'' کے پلاٹ کا خاکہ لکھنا ہم اس لیے مناسب نہیں سمجھتے کہ اس کا مطالعہ جانی بوجھی بات ہو جانے کے بعد اپنی دلچسپی قائم نہ رکھ سکے گا۔ بطور مقابلہ وموازنہ یہاں چند نمایاں خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ ''ایک دولت مند ساہوکار کا فرزند امرکانت اور اس کے دوست مسٹر سلیم دونوں ایک ہی کالج میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ امرکانت فارغ التحصیل ہوکر خدمت قوم کی طرف جاتا ہے اور سلیم صاحب سرکار میں ایک معزز عہدہ دار ہو جاتے ہیں اور جنٹ صاحب کہلاتے ہیں' امرکانت کے اصلاحی مضامین اس کی دلی شورش اور اس کے دماغی خلفشار کا پیش خیمہ ہیں۔ وہ کسان سدھار اور دیہاتی اصلاح کے لیے دیہات میں بودوباش اختیار کرتا ہے اور اس طرح ایک پہلو سے کانگریس کی خدمت کررہا ہے۔ اس کی بیوی سکھدا بھی قومی کاموں میں حصہ لینے لگی اور اس کا انہماک اس قدر بڑھا کہ شورشوں کے سلسلے میں اسے جیل خانہ جانا پڑا۔ امرکانت بھی گرفتار ہوا اور سزایابی میاں سلیم ہی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ امرکانت جیل میں تھا' اس کے والد سمرکانت نے مسٹر سلیم سے ملاقات کی اور اپنی گفتگو سے سلیم کے خیالات کو بالکل بدل دیا۔ اب سلیم جو رپورٹ مرتب کرتا اس میں رعایا کی بہبودی مدنظر رکھ کر دیہاتیوں کی فلاح کا سب سے زیادہ خیال رکھا جاتا۔ وہ اس بات کا قائل ہو گیا تھا کہ سرکاری ملازمت میں رعایا کی فلاح کا خیال سب سے زیادہ اہم فرض ہے لیکن ہر افسر کا یہ اعتقاد نہیں ہوتا۔ ایک بنگالی بابو جو سرکاری عہدہ دار تھے اس معاملہ پر سلیم سے جھگڑ بیٹھے' سلیم نے انھیں دھر پٹخا' ان کے چوٹ آ گئی سلیم جیل خانے بھیجا گیا۔ وہاں امرکانت وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔ بالآخر عارضی سزا کے بعد سب کے سب چھوڑ دیے گئے۔ اس طرح یہ ڈراما کامیڈی کی صورت میں تمام ہوا۔ ''میری کہانی'' کا خاکہ بھی ایسا ہی ہے۔ پنڈت جواہر لال ایک دولت مند وکیل کے صاحبزادے ہیں۔ آپ نے باپ کے قدم بقدم قومی خدمت کا بیڑا اٹھایا کسانوں میں بیداری آپ ہی کی ذات سے پیدا ہوئی کیونکہ خود دیہات کا دورہ کیا۔ آپ کی شریک زندگی کملا نہرو نے بھی قومی خدمات کی بنا پر پبلک لائف میں حصہ لیا اور شورشوں کے سلسلے میں جیل خانہ جانا پڑا۔ لبرل پارٹی کے ممبروں سے جواہر لال کو ایک خاص عناد ہے۔ وہ انھیں اکثر تھالی کا بینگن اور ابن الوقت وغیرہ کہہ کر یاد کیا کرتے ہیں۔

میدان عمل کا مقابلہ ہال کین کے ناول ''ایٹرنل سٹی''[1] سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ البتہ ''ایٹرنل سٹی'' کا ہیرو ''روسی (Rossi) اپنی ابتدائی زندگی کے مراحل بڑی مصیبتوں میں طے کرتا ہے' اس کا بچپن تو ابراہام لنکن کے بچپن سے بھی زیادہ مفلسی میں گزرا تھا اور نہ امرکانت سے اس کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور

---

[1] Eternal Ciy

سلیم کا مقابلہ ہال کین کے بیرن بونیلی[1] سے ہوسکتا ہے۔ البتہ سلیم نے اپنی حالت تبدیل کر لی تھی اور بیرن بونیلی کا آخری انجام ظلم واستبداد کے لباس ہی میں نمایاں ہوا۔ جس طرح امرکانت کو ایک مسلم لڑکی سے محبت تھی۔ اسی طرح ''روسی'' کو ایک اطالوی خاتون سے۔ سلیم کا عقد اس خان زادی کے ساتھ ہوا اور ''روسی'' کا اطالوی خاتون سے۔ بیرن کو ''روسی'' نے مارڈالا' سلیم اپنے دوستوں میں آملا اور خود امرکانت اس کی شادی کا محرک ہوا۔ اٹیرنل سٹی کا مختصر سا پلاٹ یہ ہے۔

''ایک لڑکا موسم سرما کی شام کو گلہری کا پنجرا لیے جارہا ہے۔ لندن اس کے لیے کرۂ زمہریر ہے۔ ایک ڈاکٹر نے اس کی پرورش کی۔ لڑکے کا نام ڈیوڈ لیون(David leon) ہے۔ ڈاکٹر کی لڑکی اس کو منہ بولا بھائی بنالیتی ہے۔ اب منظر شہر روم(Rome) کو منتقل ہوجاتا ہے' پوپ کی سالگرہ کا دن ہے' جشن کی تیاریاں ہورہی ہیں لیکن شہر کے باشندے دولت کے اس بیجا اسراف سے ناخوش ہیں۔ ایک عام شورش پھیلی رہی ہے۔ اسی اثنا میں ایک نوجوان اس شورش کا سرغنہ ہوجاتا ہے۔ بیرن بونیلی(Baron Bonelle) شاہ اٹلی کا وزیر اعظم ہے' ایک خاتون کو جس کا نام روما(Roma) ہے اور جو وزیر اعظم کی مرغوب نظر ہے اس اجنبی شخص سے جو شورش کا سرغنہ ہے اور کا نام روسی (Rossi) ہے۔ محبت ہوجاتی ہے۔ روسی اٹلی کی حکومت کو تہہ وبالا کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اسی دھن میں وہ پارلیمنٹ کا ممبر ہوجاتا ہے۔ مگر وزیر اعظم کی ریشہ دوانیاں اسے بھاگنے پر مجبور کرتی ہیں۔ بھاگتے وقت وہ روما سے شادی کر لیتا ہے۔ روسی کے خلاف بغاوت کا مقدمہ چلتا ہے' پوپ' روما کو مجبور کرتا ہے کہ روسی کو چھوڑ دے۔ روسی گرفتار کیا جاتا ہے' اس اثنا میں وزیر اعظم صاحب روما کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ روما' وزیر کو پستول کا نشانہ بنانے ہی والی تھی کہ روسی پولیس سے چھوٹ کر آجاتا ہے' وزیر نے روما سے پستول چھین لی اور وہی پستول روسی کی طرف کردی' روسی نے حفاظت خود اختیاری میں وزیر کا ہاتھ قابو میں کر لیا۔ پستول چھوٹ گئی اور وزیر اعظم ڈھیر ہوگیا۔ روسی وہاں سے چلا گیا۔ روما پکڑی گئی۔ اس نے روسی کی جان بچانے کے لیے اقبال جرم کر لیا' اس کو سزائے حبس دوام ہوگئی۔ روسی پوپ کے پاس اقبال جرم کرنے آیا اور اس سلسلے میں اپنی زندگی کے تمام واقعات بیان کر دیے۔

واقعات کا سلسلہ کچھ ایسا ثابت ہوا کہ روسی خود پوپ کا گمشدہ فرزند نکلا اور روما وہی ڈاکٹر کی

---

1. Baron Bonelle

لڑکی تھی جس نے روسی کو جس کا نام ڈیوڈ لیون (David leon) تھا۔ اپنا منہ بولا بھائی بنایا تھا۔"

یہ ناول نصف حزنیہ اور نصف طربیہ ہے مگر انجام کامیڈی ہے۔ اسی طرح میدان عمل بھی حزنیہ اور طربیہ پہلو لیے ہوئے ہے اور اس کا انجام بھی کامیڈی ہے۔

ان تمام خصوصیات کے علاوہ منشی پریم چند کو سماجی اصلاح کی بڑی فکر تھی۔ بچپن کی شادیوں سے منشی صاحب کو عناد تھا ہی مگر وہ بوڑھے جوان کے میل کو ناپسند کرتے تھے۔ خورد سال بچوں کی موجودگی میں دوسری شادی کے بھی خلاف تھے مگر اپنے افسانہ میں سوتیلی ماں کی محبت کا اعتراف کیا ہے۔ یہ افسانہ یعنی "سوتیلی ماں"[1] ابتدائی درجوں کے تعلیمی کورس میں بھی داخل ہو گیا ہے۔

بوڑھے جوان کے میل پر منشی صاحب کا ہندی افسانہ "نیا بیاہ" نہایت دلچسپ ہے۔ یہ افسانہ رسالہ "سرسوتی" الہ آباد میں شائع ہوا ہے۔ پلاٹ کا خاکہ یہ ہے۔

"پہلی بی بی لیلا سے سیٹھ جی کی طبیعت نہ بھری دوسری بیاہ لائے کمسن آشا ان کو دادا جان سے کم نہ سمجھتی تھی۔ وہ انھیں "آپ" کہہ کر خطاب کرتی اور سیٹھ جی کا اصرار تھا کہ "تم" کہا کرو۔ وہ کہتے ہیں۔

"تم مجھے "آپ" کیوں کہتی ہو میں اپنے گھر میں دیوتا نہیں چنچل بالک بنا چاہتا ہوں۔ آشا نے جیسے بھیتر سے زور لگا کر کہا "تم" اور اس کا مکھ منڈل لجا سے آرت ہو گیا۔"

بعض وقت آشا کے "کٹھور شبدوں سے وہ نراش ہو جاتے اور دوستوں سے شکایت کرتے۔ دوست اور بھی دون کی ہانکتے اور کہتے کہ وہ نازک ہیں۔ تم زبردست ہو۔ لالہ جی چاہتے تھے کہ ان کے دوست اس سونے کی رانی کے درشن سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں۔ ریشہ خطمی ہو کر بول اٹھتے کہ "بھائی میں تو بڑی بپت میں پھنس گیا" کچھ بدھی کام نہیں کرتی۔" یار لوگ کہتے کہ "وہ ہیں کمسن اور آپ ٹھہرے پرانے لٹھیت دنگل کے پہلوان بس اگر یہ بات نہ ہو تو مونچھیں منڈوا ڈالیے۔" یہ سن کر سیٹھ جی کی آنکھیں جگمگا اٹھتیں۔

انجام کار آشا کے دل پر گھر کے مہراج نے اپنا قبضہ جمالیا۔ آشا کی اس سے باتیں ہوا کرتیں۔ ٹیپ کا بند یہی ہوتا کہ "لالہ بھوجن کر کے چلے جائیں تب آنا"

اس قسم کے بیاہ پر خود منشی صاحب اپنے ہندی الفاظ میں اس طرح فرماتے ہیں:

---

[1] پریم بتیسی حصہ دوم

"بیاہ کیا ہے جیون کا آنند اٹھانے کے لیے جھلملاتے ہوئے دیپک (چراغ) میں تیل ڈال کرا سے اور چنک (تیز) کرنا ہے۔ اگر دیپک کا پرکاش (نور) تیز نہ ہوا تو تیل ڈالنے سے کیا فائدہ[1]"

بیواؤں کی شادی سے متعلق منشی صاحب کا اصلاحی پیام تھوڑا بہت ہر ناول میں ملے گا مگر ان کے ناول "بیوہ" میں اس پیام کو واضح طور پر ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کے بنیادی اصول دو رکھے گئے ہیں۔

1. وہ مرد جن کی بیویوں کا انتقال ہو گیا ہو، ان کو چاہیے کہ صرف بیوہ عورتوں سے عقد کریں۔
2. اگر بیوہ عورتوں کا عقد ممکن نہ ہو تو انھیں ایسے ذرائع بہم پہنچائے جائیں کہ وہ لواحق دنیا سے جدا ہو کر خدا کی یاد یا قومی خدمت کو اپنا شعار بنا سکیں۔

مولوی نذیر احمد مرحوم کی تصنیف "ایامیٰ" سے منشی صاحب اتفاق رائے رکھتے ہیں۔ ناول "بیوہ" کا پلاٹ بُرا نہیں۔ اس کی ابتدا تو نہایت ہی دلچسپ ہے۔ مختصر خاکہ یہ ہے کہ "کاشی کے آریہ مندر میں امرناتھ کا لکچر ہوا۔ موضوع یہ تھا کہ بیواؤں کی فلاح کو مدنظر رکھ کر ان حضرات کو جن کی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا ہو کوئی حق نہیں کہ نا کتخدا خاتون بیاہ کے لائیں۔ بابو امرت رائے کی بیوی فوت ہو چکی تھیں۔ ان سے ایک کنواری دیوی پریما محبت کرتی تھی۔ مندرجہ بالا اصول کے ماتحت انھوں نے پریما سے قطع تعلق کر لیا۔ اور اس کا عقد امرت رائے کے دوست پروفیسر دان ناتھ سے ہو گیا۔ پریما کا ایک بھائی کملا پرشاد تھا۔ اس کے پڑوس میں ایک کلرک بابو بسنت کمار رہتے تھے۔ اتفاق سے کھیل ہی کھیل میں وہ گنگا میں ڈوب گئے۔ ان کی خوبصورت بیوی پورنا بیوہ ہو گئی۔ کملا کی بہنوں کے پاس وہ اکثر آیا کرتی تھی کملا پرشاد نے اس پر ڈورے ڈالنے شروع کیے اس کے لیے ساڑیاں وغیرہ لائے۔ آخر اس غریب کی عفت کا پانوں بھی قدرے پھسل گیا اور صورت حال نے اس حد تک ترقی کی کہ کملا بابو اسے اپنے کمرے میں لے گئے اور بیکنٹھ دان کے خواہاں ہو گئے۔ پورنا کو معاً دھرم کا خیال آیا اور کملا کو زخمی کر کے بھاگ نکلی۔ اس کا ٹھکانا بھی بازار حسن کی سمن بائی کی طرح آشرم ہی میں ہوا۔ وہاں وہ ہر دم پوجا پاٹ میں مشغول رہنے لگی۔

شادی بیاہ کے موقعوں پر منشی صاحب ناچ رنگ کے مخالف تھے۔ خاص کر غریب گھرانوں میں اس قسم کی فضول خرچی کو وہ قومی ادبار تصور کیے ہوئے تھے۔ "ناول میدان عمل" میں امرکانت کے فرزند کی ولادت پر ناچ رنگ سے اختلاف ظاہر کیا گیا ہے۔ بازار حسن میں سدن سنگھ کی برات کے موقع پر براتیوں

---

[1] سرسوتی پریاگ

کی نظر انتخاب بہترین حسن کی تلاش میں سرگرم تھی۔ لوگ آپس میں ناچ کے لیے جھگڑ رہے تھے کہ ایک مہاتما سوامی نے آ کر ناچ وغیرہ سے بچنے کا اپدیش دیا اور لوگ خاموش ہو گئے۔

(۳) ترغیبِ عمل

منشی صاحب کے پیام کا عملی پہلو اُن کے اصلاحی پہلو کے ماتحت ہے' ترغیب عمل سے متعلق منشی صاحب نے پچاسوں افسانے لکھ ڈالے۔ خصوصاً ان کا افسانہ "بنک کا دیوالہ"[۱] اور شدھی[۲] قابل غور ہے۔ افسانہ "ذکر مادت کا تیغہ"[۳] عدل وانصاف کر برقرار رکھنے اور ان خاصیتوں کو عملی جامہ پہنانے کی اچھی مثالیں ہیں۔ منشی پریم چند شدھی کے موافق تھے کیونکہ ان کے نزدیک اس سے چھوت چھات کا مرض دور ہو سکتا ہے۔

افسانہ "شدھی"[۴] کے ہیرو پنڈت لیلا دھر نے ہریجن اودھار کا بیڑا اٹھایا' مگر وہ ان نیچ ذات والوں کے سامنے ایثار کے اعتبار سے کم ظرف ثابت ہوئے' وہ زبان کے کھرے مگر دل کے کھوٹے تھے۔ کوئی غنڈا رات کو آیا اور چھری مار کر نو دو گیارہ ہو گیا۔ گاؤں کے نیچ ذات والوں نے پنڈت جی کی ایسی سیوا اور تیمارداری کی گویا نئے سرے زندگی ملی۔ اب پنڈت جی بھی دیہاتیوں میں رہ کر ان کی خدمت کرنے لگے۔ ہریجن اور پنڈت دونوں میں ایک جان دو قالب کا رشتہ پیدا ہو گیا اور اس طرح پنڈت جی وہاں سب کے گرد مشہور ہو گئے۔

ترغیب عمل کا دوسرا افسانہ "ستی"[۵] ہے۔ یہ افسانہ اگر ناول کی صورت میں پیش کیا جاتا تو ایک کامیاب ٹریجڈی ہوتا۔ اس کا خاکہ یہ ہے کہ "چنتا دیوی کالپی کے ایک مہابند یلے کی بیٹی تھی۔ باپ لڑائی میں مارا گیا تو چنتا نے باپ کے قدم بہ قدم چلنے کی قسم کھائی' جس سے دشمنوں کے پیر اکھڑ گئے۔ چنتا کے حسن کا شہرہ عام تھا۔ بالآخر رتن سنگھ راجپوت کو اس کی شوہری کا شرف حاصل ہوا۔ ایک دن دشمنوں نے گھیر لیا۔ رتن بڑی بہادری سے لڑا۔ اس کے سب ساتھی مارے گئے مگر وہ کہیں نکل گیا۔ چنتا سمجھی کہ وہ بھی مارا گیا۔ اس نے ستی ہونے کی ٹھان لی اور چتا پر چڑھ گئی۔ جس وقت چتا میں آگ دی گئی رتن سنگھ آ موجود ہوا۔ چنتا دیوی آخر وقت تک یہی کہے گی کہ "تم رتن سنگھ نہیں ہو وہ مر چکا" اور ستی ہو گئی۔

اسی طرح ناول "بازارِ حسن" میں منشی پریم چند نے سوامی گجانند کے جسم لطیف کو دیوتاؤں کا برن

---

[۱] پریم بتیسی حصہ دوم [۲] پریم بتیسی حصہ اول [۳] خواب وخیال [۴] اس افسانے کا نام "تالیف" ہے اور "خاک پروانہ" کے مجموعے میں شامل ہے (شدھی افسانوی مجموعہ "خواب وخیال میں شامل ہے) مانک ٹالا۔ [۵] خواب وخیال

دے کر کھلے الفاظ میں ترغیب کا اپدیش کیا ہے۔

''بازارِحسن'' ایک کامیاب ناول ہے مگر دراصل یہ محض ناول یا افسانہ نہیں بلکہ علم النفس اور گیان یوگ پر ایک دلچسپ تبصرہ ہے۔ اس ناول کے مطالعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دعوت عمل ریفارمر لیڈر یا مذہبی پیشواؤں کا ہی کام نہیں، داستان گو اور شاعران سے کہیں زیادہ کامیابی کے ساتھ دھرم کو کرم سے ہم آہنگ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اس ناول میں منشی صاحب نے حسن کو عمل کی ترغیب کا آلہ کار بنایا ہے۔ اکثر ناولوں اور افسانوں میں حسن ترغیب عمل کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ ''فسانۂ آزاد'' کی بنیاد ہی ترغیب عمل ہے یعنی کہ یہ حسن آرا آزاد کو اس شرط پر اپنا شوہر بنانے کے لیے تیار ہے کہ وہ جنگ میں جاکر ترکوں کی مدد کریں اور اپنی ہمت وشرافت کا اس طرح ثبوت دے کر قوم میں نام آوری حاصل کریں۔ اس طرح حسنِ انسانی ذوقِ عمل کو بیدار کرسکتا ہے۔ اس کے دل ودماغ کے ہر احساس کو عملی جدوجہد کے لیے اکسا سکتا ہے۔ احساسِ حسن شاہ وگدا، فاسق وفاجر، زاہد ورند سب میں ہوتا ہے۔ اس لیے منشی صاحب شاہدان بازاری کی تعلیم گاہ میں ایک ایسے فرد کو لائے ہیں جس میں حسن صورت بھی ہے اور حسنِ سیرت بھی۔ اس سے زیادہ پرتاثیر اور دلچسپ طریقہ عوام کی تعلیم کا اور کیا ہوگا۔ حسن نے انسان کے ہاتھ سے پہاڑ ترشوائے دودھ کی نہریں نکلوائیں اور بڑے بڑے دیو عفریت اور راکششوں سے لڑائی میں مقابلہ کرایا۔ پھر بھلا یہ معمولی سی بات یعنی ''اصلاح اخلاق'' حسن کے نزدیک کون سی ایسی شکل مہم ہے۔

ذیل میں ہم ''بازارِحسن'' کا پلاٹ ایک مختصری دوکان کی صورت میں پیش کرتے ہیں تاکہ ہر قسم کا مال قدر دانوں کے سامنے آجائے اور وہ اس بازار سے کچھ نہ کچھ سودا خرید لیں۔ یہ ناول دو جلدوں میں ہے، اور اس کا پلاٹ قدرے پیچیدہ ہے، جس سے اور بھی زیادہ دلچسپی کا سامان مہیا ہوگیا ہے۔

اس ناول کے پلاٹ پر غور کیے بغیر منشی صاحب کے اصلاحی اور عملی پیام کو بخوبی سمجھنا آسان نہیں۔ چنانچہ اس کا خاکہ یہ ہے:

> ''داروغہ کشن چند کی دو لڑکیاں تھیں، سمن اور شانتا، رشوت کے جرم میں بیچارے داروغہ بھی سشن سپرد ہوگئے اور کئی سال کی سزا ہوگئی۔ اب ان لڑکیوں کا کوئی والی وارث نہ تھا۔ ان کے ایک عزیز نے بڑی لڑکی سمن کی شادی ایک غریب کلرک مسمی گجادھر سے کردی جس کی تنخواہ صرف پندرہ روپیہ ماہوار تھی اور آمدنی کا کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا۔ کچھ عرصہ تک لستم پستم نباہ ہوتا رہا۔ سمن نے بڑے نازونعم سے پرورش پائی تھی۔ اس کے دل میں اچھا کھانے اور اچھا پہننے کا شوق تھا تو کوئی نئی بات نہ تھی، لیکن شوہر کے یہاں اسے کھانا بھی پکانا پڑتا اور چکی

پینے کی ضرورت بھی محسوس ہوتی۔ جیسا کہ اس کی پڑوسن بھولی طوائف نے کہا تھا کہ لدو خچر عربی گھوڑے کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ وہی پیشین گوئی آخر پوری ہوئی۔ سمن کی راہ و رسم ایک معزز وکیل مہاشے پدم سنگھ کی اہل خانہ شریمتی بھدرا سے بہت بڑھ گئی وکیل صاحب پڑوس ہی میں رہتے تھے۔ سمن وہاں اکثر جایا کرتی تھی۔ ایک دن کسی تقریب کے سلسلے میں وہاں سے رات گئے تک نہ آئی اس بات پر اس کے شوہر منشی گجادھر پرشاد کے دل میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہونے لگے اور غصہ اتنا بڑھا کہ انھوں نے سمن کو اپنے گھر سے نکال دیا۔ کچھ روز سمن اپنی سہیلی سوبھدرا کے یہاں رہی۔ مگر وکیل صاحب کی بدنامی کے خیال نے اسے وہاں نہ رہنے دیا۔ اب بھولی طوائف جو پڑوس میں رہتی تھی اس پر مہربان ہوئی اور گانا وغیرہ سکھلا کر اسے ایک کامیاب گائن بنا دیا۔ اس طرح سمن بازار حسن میں آگئی۔ اب کیا تھا حسن ونغمہ اور اس پر ناز وادا نے مل کر دولت کو سمن کا غلام بنا دیا۔ حتیٰ کہ مہاشے پدم سنگھ وکیل کا بھتیجہ سدن سنگھ جو بمنزلہ اولاد کے تھا۔ سمن پر فریفتہ ہوگیا۔ سمن کا شوہر گجادھر تارک الدنیا ہوکر سادھوؤں اور سنیاسیوں کی سی زندگی بسر کرنے لگا۔ ایام نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ سمن کی چھوٹی بہن شانتا کی منگنی اسی چھیلے رسیا سدن سنگھ کے ساتھ طے ہوگئی اور گجادھر بابو نے جو اب اپنے آپ کو سوامی گجانند کہلاتے تھے روپیہ دے کر شادی کی تمام رسوم کو سرانجام کرا دیا۔ برات داروغہ کشن چند کے یہاں آگئی مگر جب لڑکے والوں کو معلوم ہوا کہ شانتا سمن کی چھوٹی بہن ہے تو سب بدنامی کو ڈرے اور گونہ لے جانے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ آپس میں بڑی بحثا بحثی رہی۔ اسی اثنا میں داروغہ کشن چند بھی جیل سے چھوٹ کر آگئے، ان کو جب سمن کی بےحیائی اور اپنے گھر کی بدنامی کا حال معلوم ہوا تو مارے غیرت کے گنگا میں ڈوب مرے۔

اب سمن کے کان کھڑے ہوئے کہ میری وجہ سے میرا تمام خاندان تباہ ہو رہا ہے۔ اس نے اپنے پیشے سے توبہ کی اور اس کا داخلہ "بدھوا آشرم" (ماسن بیوگان) میں ہوگیا۔ سمن کے شوہر سوامی گجانند ایک مرتبہ سمن سے ملے اور اپنی خطائیں معاف کرائیں کہ غصہ اور ادبار نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ اس لیے میں نے تمھیں نکال دیا تھا۔ سمن نے ان کو معاف کیا اور اپنے حسن انتظام سے شانتا کے شوہر سدن کو شانتا کا گونہ لے جانے کی ترغیب دی۔ ان دونوں کا گھر آباد کر کے خود ان کی خدمت کرنے لگی۔ سمن جب تک آشرم میں رہی تھی اپنے حسن انتظام اور حسن خدمت سے اس کے ہر کیل کانٹے کو درست رکھا تھا اور دن رات اپنے ہم جنسوں کی

خدمت کو اپنا شعار بنایا تھا۔ جب وہ شانتا اور سدن کے یہاں آئی تو ان کو بھی گھر گرستی کا گن سکھا دیا اور جب شانتا کے بچہ پیدا ہوا تو اس کی بڑی نگہداشت اور سیوا کی مگر سدن کے دل سے بدنامی کا خوف نہ گیا اس لیے سمن کا رہنا ناگوار معلوم ہوا۔ سدن کے ماں باپ پرانے خیال کے آدمی تھے وہ اس سے بہت ناراض تھے، آخر سمن وہاں سے بھی نکل جانے پر مجبور ہوئی۔ پتھریلے پٹھار اور خار دار جھاڑیوں میں سمن چلی جارہی تھی، اس کی کوئی منزل نہ تھی۔ رات کی تاریکی پھاڑے کھاتی تھی۔ جنگلی جانور بول رہے تھے۔ گویا سر پر چڑھے آتے تھے سمن کے پیر میں کانٹا چبھا اور وہ آہ کر کے گری اور بیہوش ہو گئی۔ اس حالت میں اسے محسوس ہوا کہ کسی نے اسے جگایا اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ایک نورانی شکل کا آدمی بڑی بڑی جٹائیں سر پر، کمنڈل ہاتھ میں، مرگ چھالا کاندھے پر لالٹین لیے اسے اٹھا رہا ہے۔ سمن نے غور سے دیکھا تو پہچانا کہ سوامی گجانند ہیں۔ سمن قدموں پر گر پڑی اور کہا کہ تم بھی میری خطاؤں کو معاف کر دو۔ سب تمھاری ہی خطا نہ تھی بلکہ میری بھی۔ میں نے تمھاری ناداری اور غریبی کا پاس نہ کر کے امیرانہ زندگی کی آرزو کی تھی، آوایشور نے مجھے حسن دے کر چنچل بھی بنا دیا تھا۔ شاید ایشور اسی طرح ہماری آزمائش کرتا ہے۔ سوامی گجانند نے پوچھا کہ اگر اب بھی تمھیں دولت و عزت کی آرزو ہو تو ویسا کہو سمن نے کہا مجھے اب کچھ نہ چاہیے۔

دولت ملے نہ تخت و تاج دلوا ملے بس وہ ملے کہ جس کے ملے سے خدا ملے

سوامی جی بولے کہ اگر واقعی دولت و عزت سے اب تمھاری طبیعت کو لاگ نہیں تو سنو "ستیہ جگ میں آدمیوں کی مکتی (نجات) گیان سے ہوتی ہے دواپر میں بھگتی سے ترتیا میں ستیہ (صدق و خلوص) سے، پر اس کلجگ میں اس کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ سیوا (خدمت) ہے۔ اس راستے پر چلو گی تو تمھاری مکتی ہو جائے گی۔ جو لوگ تم سے بھی بیکس، دکھی اور مصیبتوں کے مارے ہیں۔ ان کی خبر لو اور ان کی دعائیں تمھارے آڑے آئیں گی۔"

یہ کہہ کر سوامی جی چل کھڑے ہوئے سمن پیچھے پیچھے چلی مگر وہ آگے نکل گئے تھے، سمن دوڑی، پکارا آواز آئی کہ چلی آؤ۔ یہاں تک کہ اسے ایک کٹی دکھائی دی جس میں گجانند سوامی رہتے تھے، وہاں جا کر دیکھا تو گجانند کمبل تانے سو رہے تھے۔ سمن کو بڑی حیرت ہوئی، جگایا اور سب حال کہا۔ گجانند جی نے کہا کہ میں ابھی تمھیں خواب میں دیکھ رہا تھا۔ اور تمھیں سیوا دھرم کا اُپدیش کر رہا تھا۔"

الغرض یہ بات تو ماہرین علم النفس ہی بتا سکتے ہیں کہ (Psychology) کی یہ کون سی حالت تھی۔ مختصر یہ کہ سمن بائی نے خود کو خدمت خلق اللہ پر وقف کر دیا اور ایک یتیم خانہ کی منتظمہ ہو گئی۔

اس عہد جمہوریت کا عملی پیام منشی صاحب نے مندرجہ بالا ناول میں خوب سلجھا کے پہنچایا ہے۔ شاہی زمانے سے متعلق اسی قسم کے پیام کی جھلک شررؔ مرحوم کے تاریخی ناول ''مینا بازار'' میں ملے گی جس میں شاہجہاں بادشاہ نے مینا بازار میں جا کر حسن و عشق کا سودا خریدا تھا۔ اور اس سونے کی چڑیا کی گفتار سے اپنے دربار کو زینت بخشی تھی یعنی یہ کہ جس طرح سمن بائی شوہر سے جدا ہونے پر مجبور ہوئی اور آخر میں خود کو یتیم خانے کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ اسی طرح جمال آرا بیگم شوہر سے جدا ہو کر یاد خدا کی طرف راغب ہوئی، مگر آخر میں خواتین محل کے اخلاق کو آراستہ کرنے کے لیے محل میں لائی گئی اور خود بادشاہ نے اس سے عقد کیا۔ خدمت وایثار کے معیار کو مدنظر رکھا جائے تو دونوں ناولوں کے کرداروں میں قدرے اختلاف ہے مگر جس طرح سمن بائی نے اپنے شوہر کی خطا معاف کی، اسی طرح جمال آرا بیگم اپنے شوہر کی جاں بخشی کا باعث ہوئی۔ اگر سمن اپنے شوہر کی خطا معاف نہ کرتی اور شوہر اس کی خطا نہ معاف کرتا تو دونوں کے لیے دنیا دوزخ ہو جاتی۔ یہی کیفیت جمال آرا اور یوسف بیگ کے انجام سے ہوتی۔

(۴) فرقہ وارانہ نوک جھونک

فرقوں کی مختلف قسمیں ہیں جیسے مذہبی معاشرتی اور سیاسی فرقے، ہندو مسلمان، شیعہ سنی آریہ اور سناتن دھرمی وغیرہ مذہبی فرقے ہیں۔ اشتراکی اور اجتماعی طرز زندگی سے تعلق رکھنے والے فرقے معاشرتی فرقے ہیں اور سوراجی، تنظیمی اور لبرل جماعتیں محض سیاسی فرقے ہیں۔ منشی پریم چند مرحوم پکے ہندو اور سچے سناتن دھرم تھے، مذہب اسلام کے حقیقی پہلو سے وہ بہت آگاہ تھے جس کا ثبوت انھوں نے اپنے افسانے 'عفو'[۱] میں دیا ہے، وہ مسلمانوں اور اسلام کی بڑی وقعت کرتے تھے، قرآن شریف کی بعض سورتیں[۲] انھیں زبانی یاد تھیں۔ ایک بار آگرہ کالج آگرہ میں انھوں نے چند احباب کی صحبت میں اس کا ثبوت دیا تھا۔

منشی صاحب کو اس بات کا احساس تھا کہ صدیوں کی غلامی نے ہندوؤں کو مردے سے بدتر کر دیا ہے، اور مسلمان اگرچہ مردہ نہیں ہوئے تاہم اندھوں کی طرح ٹٹولتے پھرتے ہیں۔ وہ ہندوؤں میں جان

---

۱ فردوس خیال ۲ اس سے یہ مطلب نہیں کہ ان کو کائی قرآن پاک یاد تھا، الحمد اور قل ہو اللہ وہ برزبان رٹے ہوئے تھے۔

ڈالنے کی کوشش کرتے تھے اور مسلمانوں کی آنکھیں روشن کرنے میں مشغول تھے۔ اسی وجہ سے انھوں نے ہندو خواتین کو مردانہ کاموں کا محرک قرار دیا ہے اور مسلمانوں کو بھی سبق دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کی اس کوشش سے ہمیں اتفاق ہو یا نہ ہو مگر اس کوشش کا ثبوت ان کی تصانیف میں موجود ہے۔

ذاتی عقائد کے اعتبار سے وہ اپنی تصانیف میں کہیں سورداس ہیں، کہیں تلسی داس کہیں انھوں نے جنم اشٹمی رچائی ہے۔ کہیں رام نومی مگر دراصل وہ رام کے نام پر قربان معلوم ہوتے ہیں۔

ان میں مذہبی رواداری بہت زیادہ تھی، ان کی تصانیف تعصب کی آلائش سے قطعی پاک وصاف ہیں، کم سے کم جتنی تصانیف راقم الحروف کی نظر سے گزری ہیں۔ ان میں تعصب وغیرہ کا کہیں شائبہ تک نہیں۔ بلکہ بعض منشی صاحب نے خود ہندوؤں کو سرزنش کی ہے۔ افسانوں اور ناولوں میں کرداروں کی زبان سے ان کے مذہبی خیالات بخوبی ظاہر ہوتے ہیں۔ اپنے ناول "میدان عمل" میں امر کانت کی زبان سے وہ کہتے ہیں۔

"ہندو مذہب کی بنیاد حسن خدمت، ایثار، رحم اور تہذیب نفس پر ہے۔"

اسی کردار یعنی امر کانت کی زبان سے اسلام کی رواداری کے متعلق اس طرح اظہار خیال کیا گیا ہے۔

"حضرت محمدؐ کو خدا کا رسول مان لینے میں مجھے کوئی عذر نہیں اسلام مجھے بدھ، کرشن اور رام کا احترام کرنے سے نہیں روکتا۔"

حضرت مسیحؑ کے مذہب پر تو ان کی ناول "چوگان ہستی" جو رنگ بھوم" کا ترجمہ ہے ایک اچھی خاصی تفسیر ہے مگر عیسائی مذہب کی ذمہ دارانہ تخیل سے ان کو موافقت نہ تھی۔ چنانچہ چوگان ہستی میں وہ صوفیہ کی زبان سے یہ شک ظاہر کرتے ہیں کہ:

"اگر خداوند یسوع نے ہمارے گناہوں کا کفارہ اپنے خون سے کر دیا ہے تو پھر سارے عیسائی ایک ہی حالت میں کیوں نہیں[1]"

ان باتوں سے عاجز ہو کر منشی صاحب کہتے ہیں کہ "مذہب روح کے لیے ایک بندش ہے۔" اور اس اعتبار سے وہ غالب کے ہمنوا معلوم ہوتے ہیں کہ

"ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں"

دراصل منشی صاحب ہر مذہب کے پیرو تھے اور خود ان کا کوئی مذہب نہ تھا۔

---

[1] چوگان ہستی حصہ اول

معاشری اعتبار سے منشی صاحب اجتماعی معاشرت سے موافقت رکھتے تھے، اس کا ثبوت ان کا ناول ''گوشہ عافیت'' ہے۔ اس ناول کے ایک کردار سید ایجاد حسین کا اتحادی یتیم خانہ اس کی تمثیل ہے مگر اصلاحی پہلو یہاں بھی نمایاں ہے کیونکہ اس اتحادی یتیم خانے کو دولت کمانے کا آلہ کار ثابت کر کے اس قسم کی قوم فروشیوں کا شکوہ کیا گیا ہے اور یہاں سے منشی صاحب کی فرقہ وارانہ جھکیں شروع ہوتی ہیں۔

فرقہ وارانہ نوک جھونک میں بعض بعض جگہ منشی صاحب نے میٹھی چٹکیاں بھی لی ہیں، چنانچہ جب سید صاحب موصوف (گوشہ عافیت کے کردار) سناتن دھرم سبھا میں اپنے اتحادی یتیم خانے کے لیے امداد کی اپیل کرنے آئے تو نہایت زوردار الفاظ میں تقریر کی۔ علامہ اقبال کی اتحادی نظمیں یتیم بچوں سے پڑھوائیں اور مجمع کو اس قدر گرویدہ کر لیا کہ چندے کی بوچھار ہونے لگی۔ سبھا میں کچھ پنڈت لوگ بھی اسی غرض کے لیے آئے تھے۔ پنڈت لوگ ایجاد حسین کا رنگ جمتے دیکھ کر چوکنے ہوئے اور جٹ اپنی لٹکتی ہوئی چوٹیوں میں بل دے کر گانٹھ لگائی اور خود منشی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''ان سے بھلا یہ کب ہوسکتا تھا کہ کوئی مسلمان بازی لے جائے۔ ایک سنیاسی نے اپنا لکچر شروع کر دیا[1]''

لیکن ایجاد حسین کے مقابلے میں سب لسانی پھیکی پڑ گئی۔ سید صاحب نے ''تخم ریزی'' کر کے اچھی خاصی فصل کاٹ لی۔ آخر میں سید صاحب نے پرائیویٹ طور پر اپنے صاحبزادے سے ہنود کے متعلق اس طرح اظہار خیال کیا ہے، کیا ہی مزے کی چٹکی ہے۔

''ان گورکھوں کی خوب تعریف کیجیے، ہجو ملیح کی حد ہو تو مضائقہ نہیں، پھر ان سے جتنا چاہیے وصول کر لیجیے۔''

سیاسی اعتبار سے منشی صاحب انتہا پسند کانگریسی تھے جس کے متعلق پہلے ہی اشارہ کر دیا گیا ہے۔ اپنے ناول ''میدان عمل'' اور ''گوشہ عافیت'' میں منشی صاحب نے اس کا ثبوت دیا ہے۔ اصلاحی مد میں اس کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس لیے یہاں مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔ لیکن نوک جھونک اس میں بھی ہے۔ مثلاً یہ کہ انھوں نے ہندو کردار زیادہ تر کانگریس کی طرف رکھے ہیں حالانکہ قومی لڑائی میں ہندوستان کے مسلمان پیچھے نہیں ہیں۔ دوسری مزے کی چٹکی یہ ہے کہ منشی صاحب نے مسلمانوں کو سرکار کا نمک خوار ثابت کیا ہے۔ گوشہ عافیت کے ڈاکٹر عرفان علی تو خیر قوم پرست ہیں، مگر میدان عمل کے میاں سلیم اور اسی طرح دوسرے کردار قوم پرستی کا دعویٰ کرنے کے باوجود حکومت پرست ظاہر کیے گئے ہیں گو

---

[1] گوشہ عافیت حصہ دوم

بعد میں کہے سنے سے راہ راست اختیار کر لیتے ہیں لیکن منشی صاحب نے دونوں فرقوں میں محبت و مودت برقرار رکھنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ملاحظہ ہو افسانہ "ڈگری کے روپے۔"

قوم پرستی کا دعویٰ کرنے کے باوجود غداری کرنے والوں سے منشی صاحب بہت ناراض تھے۔ گوشہ عافیت جلد دوم میں ایک جگہ سکھو سادھو کے ہاتھ سے گاؤں کے غیب دار ضلع دار فیفو کے سر پردہ جمیٹا جمایا کہ "میاں جی" کو تارے دکھائی دینے لگے۔ اور پھر وہیں ایک کرامت بھی دکھائی ٹوٹے ہوئے ٹھیکرے چمکتے ہوئے روپے بن گئے۔ جس کو دیکھ کر فیفو میاں کا غصہ ہرن ہو گیا اور عذر تقصیر کرنے لگے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشی صاحب اعجاز اور کرامت کے قائل تھے۔

غرض اس قسم کی فرقہ وارانہ نوک جھونک، میٹھی چٹکیاں، اور "مدھر بکوٹے" ان کی اردو ہندی تصانیف میں بہت ہیں جو بادی النظر میں چاہے جیسے معلوم ہوں لیکن درحقیقت ان کا مطلب محض دل لگی اور مذاق تھا۔ اپنے افسانہ "مایۂ تفریح" میں ایک مہاشے کا سراپا پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مہاشے چکر دھر سر گھٹاتے تھے مگر لمبی چوٹی رکھ چھوڑی تھی جو چٹیل میدان کے کسی جھنکاڑ درخت کی طرح نمایاں تھی، ان کا دعویٰ تھا کہ چوٹی کے راستے جسم کی غیر ضروری اور مضر حرارت خارج ہوتی رہتی ہے اور مقناطیسی اثرات جسم کے اندر نفوذ کرتے ہیں۔"

اسی طرح بازار حسن میں مولوی ابوالوفا کی داڑھی معشوق کی دیا سلائی کے نذر کی گئی ہے اصل عبارت بخوف طوالت نظر انداز کی جاتی ہے۔

ایک اور افسانہ "شطرنج کی بازی"[1] میں ان مسجدوں پر جو ویران پڑی رہتی ہیں اور جن میں جواری اور شرابی لوگ جا کر شیطان پرستی کرتے ہیں اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

"شام ہوئی تو مسجد کے کھنڈروں میں چمگادڑوں نے اذان دینا شروع کی، ابابیلیں اپنے اپنے گھونسلوں سے چمٹ کر نماز مغرب ادا کرنے لگیں مگر (شطرنج کے) دونوں کھلاڑی (مسجد ہی میں) بازی پر ڈٹے رہے گویا خون کے پیاسے سورما موت کی بازی کھیل رہے ہوں۔"

اس عبارت سے منشی صاحب کا مطلب یہی ہے کہ نماز کے وقت کھلاڑیوں کو ایک مسلمان فرد ہونے کی حیثیت سے کھیل چھوڑ کر فوراً نماز کے لیے کھڑا ہونا چاہیے تھا مگر انھوں نے نماز کا خیال نہ کیا اور شطرنج بازی کے اکھاڑے میں لڑ مرے۔ کیا اس قسم کے کھیلوں کے وقت عام طور پر ایسا ہی نہیں ہوتا؟

---

1. خواب و خیال

منشی صاحب کی زندہ دلی کی مثال افسانہ ''ذکر مادت''[1] میں بھی موجود ہیں' لکھتے ہیں:

''مسرت کے جوش میں کبھی کبھی لوگ تہذیب سے گری ہوئی حرکتیں بھی کر بیٹھتے ہیں۔ ایک پنڈت جی مرزائی پہنے' سر پر گول ٹوپی رکھے (جشن فتح کا) تماشا دیکھنے میں مصروف تھے' کسی شریر آدمی نے ان کی توند پر ایک چگاوڑ چمٹا دی۔ پنڈت جی بے تحاشا توند مٹکاتے ہوئے بھاگے۔ بڑا قہقہہ پڑا۔''

اس مثال کے بعد مولوی صاحب کی خبر لی گئی ہے جو تین ٹانگ والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے ''اڑا اڑا دھم'' ہو گئے۔

مندرجہ بالا مثالوں کو ظرافت کہا جائے یا لغزش تصور کیا جائے اپنی اپنی جگہ دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ اس قسم کی باتوں کے علاوہ منشی صاحب کا قلم ہر جگہ محتاط رہا ہے۔ اور اس قسم کی لطیفہ سنجی ادبی خوبیوں میں داخل ہے۔ کبیر کے کلام میں اس قسم کی چٹکیاں بہت ہیں۔ لمبی داڑھی پھر ان کی پھبتی ''داڑھی بڑھائے جو گیلا بھیو بکرا'' تو بہت مشہور ہے۔ اسی طرح ہنود میں قربانی کی رسم پر وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

ست مان کر بکرا لائے کان پکڑ سر کاٹا

پوجا تھی سو مانا لے گئی درت[1] کو کر چاٹا

دنیا جھامر جھومر بھوئی

(۵) فنی پہلو

فنی اعتبار سے منشی پریم چند کی تصانیف بہت کامیاب ہیں۔ ہندی اردو دونوں زبانوں پر انھیں قدرت تھی۔ مسلمان ہندو دونوں فرقے ان کے جانے بوجھے تھے' مسلم گھرانوں کی بود و باش کا تجربہ انھیں ایسا ہی تھا جیسا ہندو گھرانوں کا مسیحی طبقے سے بھی وہ نابلد نہ تھے۔ ''چوگان ہستی'' کی کامیابی اسی بات کی دلیل ہے۔ وہ کسانوں سے لے کر بڑے بڑے راجاؤں مہاراجاؤں کی معاشرت اور ان کی رگ رگ پہچانتے تھے۔ ان کو اس متوسط طبقے کی اصلاح کا بڑا خیال تھا جو غریب کلرک کہلاتے ہیں جو پندرہ بیس روپیہ کی تنخواہوں پر زندگی گذارتے ہیں۔ سرکاری حکام سے ان کی ہمیشہ یہی تلقین رہی کہ رعایا پروری ہی گورنمنٹ کی مضبوطی اور اس کے اقتدار کا باعث ہوتی ہے۔ ان کا مشن تھا کہ بڑے عہدہ دار اپنے ماتحتوں

---

[1] پریم پچیسی ۔ قربانی کا مخصوص پتھر

اور غریب کلرکوں کی خانگی زندگی سے بھی واقفیت حاصل کریں اور ان کے ساتھ ہمدردی اور حسن سلوک سے پیش آئیں۔ (افسانہ ستعار گھڑی[1]) یہ بھی ان کا پیام تھا کہ اگر بڑے بڑے راجہ مہاراجہ یا خودسرکاری افسران اپنے ماتحتوں پر کسی قسم کا عتاب کریں تو اس عتاب کا شکار (معتوب کے) غریب بال بچوں کو نہ بنائیں۔ اور ان کے لیے کوئی سبیل ایسی پیدا کریں کہ ان کی زندگی دو بھر نہ ہو جائے۔ (افسانہ خاک پروانہ[2]) یہ تمام باتیں ایک کامیاب ادیب کے فرائض میں داخل ہیں۔

محض آرٹ کے اعتبار سے ملک کی مختلف ادبی انجمنوں نے منشی صاحب کو ''تضاد ملیح'' کا ماہر اور ''اجتماع ضدین'' یعنی Paradox کا استاد تصور کیا ہے' اردو ادیب انھیں کامیاب افسانہ نگار اور ہندی ادیب افسانہ نگاری کا بادشاہ تسلیم کیے ہوئے ہیں فن کے اعتبار سے منشی صاحب کے بعض ناول پھیکے بھی ہیں لیکن اکثریت کامیاب ناولوں ہی کی ہے۔

وہ ڈراما کی طرف بھی رجوع ہوئے تھے۔ ڈراما اور ناول میں راقم کے نزدیک محض طرز ادا کا فرق ہے' ورنہ دونوں کے فرائض ایک ہی ہیں۔ ڈرامہ کا لطف تماشے میں ہے ناول کا مطالعہ میں پنڈت کیفی کا ڈرامہ ''راج دلاری'' اس امتیاز کی دلچسپ مثال ہے۔ اس ڈرامہ کا ماخذ یہ ہے کہ نئی تہذیب اور انگریزی تعلیم سے نہ تو بیر رکھنا چاہیے، نہ اس کی بالکل اندھی تقلید کرنا چاہیے۔ معاشرتی پہلو کو دیکھتے ہوئے منشی صاحب کا پیام بھی یہی تھا' جس کی تمثیل منشی صاحب کا مقالہ ''نوک جھونک'' ہے۔ اس افسانہ نما مقالے میں قدیم و جدید خیالات کے روشن و تاریک پہلو دھوپ چھاؤں کی طرح ظاہر کیے گئے ہیں اور ثابت کیا گیا ہے کہ انسان فطرتاً تقلید پسند ہے۔ غرض اس مقالے میں ہر اصول کی عملی شان دکھائی گئی ہے جس کا خلاصہ ''خیر الامور اوسطہا'' والی حدیث ہے۔

بہر حال ڈرامہ کی خوبی کا اندازہ محض مطالعہ سے نہیں کیا جاسکتا' اس کو تو اسٹیج پر ایکٹ ہوتے ہوئے دیکھنے میں ہی لطف آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تسلسل واقعات سے متعلق عبارت ڈرامہ میں حذف ہو جاتی ہے' اگر چہ مفہوم پنہاں رہتا ہے مثلاً ڈرامہ ''راج دلاری'' میں ایک جگہ راج دلاری کی حالت اس طرح ظاہر کی گئی ہے۔

''راج پپیہے کی آواز پر چونک پڑی اور گانے لگی''

نا پیا آئے نہ پاتی آئی من کیئو کیسو کٹھور
پیٹ نے کیا انریت نکائی منہ نہ کیا گھر اور

---

[1] خاک پروانہ [2] خواب و خیال

سکھی ری تڑپ تڑپ بھئی بھور

مگر ناول میں سلسلہ عبارت کے لیے راج کی حالت پر بھی روشنی ڈالی جائے گی اور لکھا جائے گا کہ:

''راج پپیہے کی آواز پر چونک پڑی' اس کے دل میں پریم کی لہریں اٹھ کر کھیلنے لگیں' جذبات امنڈ آئے اور وہ بھی گانے لگی۔'' الخ

غرض فن کے اعتبار سے منشی پریم چند کی تصانیف نہ تو بالکل خشک ناول کی طرح ہیں نہ اکثر ڈرامے۔ اس معاملہ میں منشی صاحب نے میانہ روی سے کام لیا ہے اور یہی فرق ان کی تصانیف کو رتن ناتھ کے فسانہ آزاد اور مولانا شرر کے ناولوں سے الگ کر دیتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ شرر مرحوم نے سب سے پہلے ناولوں کو حقیقی ناول کی صورت میں پیش کیا اور وہ اپنے فن میں استاد تھے۔ ان کا آرٹ' ان کا رومان' عہد ماضی کی نیچرل فوٹو گرافی' معاشرت کی تنقید کے ساتھ واقعات کی نقاشی' ظرافت میں عبرت اور عبرت میں ظرافت کو مخلوط کر کے ایک نئی تخیل قائم کرنا۔ انقلاب سے اصلاح اور اصلاح سے انقلاب کے پہلو نمایاں کرنا وغیرہ خاص کو مولانا شرر کو اردو زبان کا ایک کامیاب ناولسٹ تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ غالباً اس اعتبار سے منشی صاحب کا مقابلہ مولانا مرحوم سے بے محل ہوگا۔ تاہم دونوں میں جو دلچسپ امتیاز ہے اسے نمایاں کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ منشی صاحب نے تخیل کو زیادہ اہمیت دی ہے اور مولانا شرر نے تاویل کو۔ ایک کی نظر جذبات پر ہے۔ دوسرے کی فطرت کی۔ ایک روح کی گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے' دوسرا روحانی فضاؤں تک پرواز کرنے کی۔ اس اعتبار سے منشی صاحب کا ناول ''پردۂ مجاز'' اور مولانا مرحوم کی تصنیف ''فردوس بریں'' قابل مطالعہ ہیں۔ انتہا یہ کہ منشی صاحب نیچر کی تصویر کشی میں بھی تخیل کا رنگ بھرتے ہیں۔ وہ چینی آرٹ کے شائق ہیں' مولانا موصوف فرنچ آرٹ کے۔ مولانا شرر اپنے وقت کے الگزنڈر ڈیوما تھے۔ منشی صاحب میں ''میری کوریلی'' کا رنگ غالب ہے۔ مثال کے طور پر مولانا شرر کے اس تاریخی منظر کا حوالہ دیا جاسکتا ہے جو مرحوم نے ''عصر قدیم'' کی پہلی جلد میں اسکندر اعظم کی وفات پر پیش کیا ہے' واقعہ کا منظر شہر بابل میں ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح اسکندر اعظم کی فاتح فوج سردار کے سر جانے سے ہراساں تھی' کس طرح شہر کے دروازے بند کر لیے گئے تھے اور خوف و ہراس کا دیوتا بادلوں کے تخت پر اپنی مہیب شکل میں براجمان تھا۔ کس طرح انتظام سلطنت کے متعلق جرنیلوں میں سرگوشیاں اور چہ می گوئیاں شروع ہو گئی تھیں' کس طرح مقتول دارا کی ماں ملکہ ''سی سی گم بیں'' نے بیٹے سے زیادہ سکندر کی وفات کا سوگ کیا تھا' کس طرح وہ محل کے ایک گوشے میں دم بخود بیٹھ گئی تھی اور ایسی

بیٹھی کہ پھر کبھی نہ اٹھ سکی۔ ان سب واقعات کا مطالعہ کرنے سے اس عہد قدیم کا پورا فوٹو نظر کے سامنے آجاتا ہے اور انداز بیان میں جو رومان پنہاں ہے اس کا اندازہ اور اس کی تعریف تو حساس دل ہی کر سکتے ہیں۔ منشی صاحب نے مناظر فطرت کی تصویر کشی کرتے وقت بجائے رومان کے ان میں تخیل کو حل کر دیا ہے وہ نیچر میں جان ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے ناول ''میدان عمل[1]'' میں منشی پریم چند نے پانی برسنے کے بعد دھوپ نکلنے کا منظر اس طرح پیش کیا ہے۔

''آج کئی دن کے بعد تیسرے پہر سورج دیوتا نے زمین کی فریاد سنی ہے اور گویا مراقبے سے نکل کر اسے دعائیں دے رہے ہیں، زمین گویا آنچل پھیلائے ان کی دعاؤں کو بٹور رہی ہے۔''

ایک کوہستانی علاقے کی تصویر اس طرح پیش کی ہے۔

''شمالی کوہستانوں کے بیچ میں ایک چھوٹا سا ہرا بھرا گاؤں ہے، سامنے گنگا کسی دوشیزہ کی طرح ہنستی کھیلتی ناچتی گاتی چلی جا رہی ہے۔ گاؤں کے پیچھے ایک اونچا پہاڑ کسی بوڑھے جوگی کی طرح جٹا بڑھائے سیاہ تمکین خیال میں محو کھڑا ہے۔''

اس منظر کا مخالف رخ بھی ایک جگہ پیش کیا گیا ہے۔ ناول ''بازار حسن'' میں جب داروغہ کرشن چندر خودکشی کے لیے گنگا کے کنارے آتے ہیں تو گنگا کی حالت اس طرح بیان کی گئی ہے۔ پچھلی رات کا وقت ہے:

''گنگا کسی مریض کی طرح کُہرے کی چادر اوڑھے کراہ رہی تھی، آس پاس کی تاریکی اور گنگا میں صرف روانی کا فرق تھا، یہ رواں تاریکی تھی۔ چاروں طرف ایسی اُداسی چھائی ہوئی تھی جو کسی کی وفات کے بعد گھر پر چھا جاتی ہے۔''

گنگا ندی سے متعلق مندرجہ بالا مثالیں تو خیر صریحاً متضاد ہیں لیکن منشی صاحب کا تضاد ملیح بھی نہایت دلچسپ ہوتا ہے۔ تضاد ملیح سے وہ اجتماع اضداد مراد ہے جس میں طنزیہ چشمک شامل ہو، مثلاً حضرت اکبر الہ آبادی کے کلام کا رنگ عام رنگ۔ منشی پریم چند نثر میں اس انداز کے ماسٹر ہیں۔ یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کی جاتی ہے۔ ان کے ناول ''بازار حسن'' میں اس قسم کی مثالیں بہت ہیں۔ سدن سنگھ کی برات کے موقع پر لوگ ناچ رنگ کی بھی توقع رکھتے تھے مگر وہاں رقص و سرود کا انتظام نہ تھا۔ اس لیے تماش بینوں نے شکایت کرنا شروع کی اور جھگڑنے لگے۔ اسی اثنا میں ایک جٹا دھاری سادھو نمودار

---

[1] چوتھا حصہ

ہوئے (یعنی گیانند) اور تضاد طبع کے ساتھ اس طرح لوگوں کو تنبیہ کی۔

''ہائے افسوس یہاں کوئی ناچ نہیں' کوئی رنڈی نہیں' سب بادالوگ اداس بیٹھے ہیں۔ شیام کلیان کی دھن کیسی منوہر ہے پر کوئی نہیں سنتا کسی کے کان نہیں' سب ناچ دیکھنا چاہتے ہیں' یا تو انھیں ناچ دکھاؤ یا اپنے سر منڈواؤ چلو میں ناچ دکھاؤں۔ دیکھو سامنے درخت کی پتیوں پر نرمل چاندکی کرنیں کیسی ناچ رہی ہیں۔ دیکھو۔ تالاب میں کمل کے پھول پر پانی کی کرنیں کیسی ناچ رہی ہیں۔ جنگل میں جاکر دیکھو مور پر پھیلائے کیسا ناچ رہا ہے۔ کیا یہ دیوتاؤں کا ناچ پسند نہیں ہے؟ اچھا چلو بھوتوں کا ناچ دکھاؤں' تمھارا پڑوسی غریب کسان زمیندار کے جوتے کھاکر کیسے ناچ رہا ہے' تمھارے بھائیوں کے گھر یتیم بچے بھوک سے باؤلے ہوکر کیسے ناچ رہے ہیں' اپنے گھر میں دیکھو' تمھاری بیوہ بھاوج کی آنکھوں میں درد اور غم کے آنسو کیسے ناچ رہے ہیں۔ یہ ناچ بھی پسند نہیں تو اپنے من میں دیکھو' کپٹ اور چھل کیسا ناچ رہا ہے' کرا اور موہ کے ساتھ تھرک رہا ہے' سارا سنسار رنگ بھوم ہے۔ اس میں سب اپنا اپنا ناچ ناچ رہے ہیں۔ تمھیں ناچ کا نام لیتے ہوئے لاج نہیں آتی[1]

اس عبارت میں ہندی الفاظ زیادہ ہیں صرف اس وجہ سے کہ یہ الفاظ سادھو کی زبان سے ادا کیے گئے ہیں۔

منشی صاحب کی طرز تحریر میں درد' سوز' دلکشی اور ظرافت سب کچھ ہے' وہ ایک حساس قلب رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ ادبی گلدستوں میں دل کے ٹکڑے بھی شامل کر دیتے ہیں۔ بعض افسانہ نگار حزن و طرب کے تاریک و روشن پہلوؤں میں کسی ایک کے ہو رہتے ہیں۔ منشی صاحب اس قسم کی یک رنگی کے قائل نہیں' ان کے نزدیک ہر خوشی کے ساتھ ایک مرغوب غم کا ہونا ضروری ہے۔ اس مرغوب غم کو عرف عام میں جذبات کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے منشی صاحب ڈاکٹر ٹیگور کے مقلد معلوم ہوتے ہیں اور جہاں کہیں کوئی ایک پہلو زیادہ غالب ہو جاتا ہے وہ جیوٹ اور ہمت پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح وہ علامہ اقبال کی ہموائی کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں نہ ماضی سے بیر ہے اور نہ تقلید مغرب کا شکوہ انھیں پسند ہے۔ وہ ہر قسم کی سختی کو شرافت اور ایثار سے برداشت کرنے اور ذاتی اغراض سے رشتہ توڑ کر سماج کی بہبود کو زندگی کا لازمہ سمجھنے کی تلقین کرتے ہیں۔

ان کے درد بھرے دل کی مثال ناول ''میدان عمل'' کا وہ منظر ہے جب امرکانت غریب سکینہ

---

[1] بازارحسن

کے یہاں رومال کی قیمت دینے گیا۔ یہ غریب خاتون چراغ گل کیے ہوئے رات کے وقت کپڑے دھو رہی تھی کیونکہ اور کوئی دوسرا کپڑا نہ تھا کہ اس کو پہن لیتی۔ امر کانت نے جب چراغ نہ ہونے کی وجہ پوچھی تو سکینہ کو غریبی پر رو دینے کے سوا کچھ نہ بن پڑا۔

منشی صاحب کی طرز تحریر میں جو دلکشی ہے اس کا حصہ اردو زبان میں بہ نسبت ہندی کے کم ہے' تاہم اتنا بھی کم نہیں کہ اردو ادیبوں میں وہ ممتاز نہ بن سکیں۔ مرحوم علامہ راشد الخیری کی سی غمگین عبارت کا دریا ان کی تصانیف میں موجزن نہیں ہے ان دونوں زبردست ادیبوں میں یہی فرق ہے کہ راشد الخیری مرحوم دل کو پکڑتے ہیں تو بغیر دکھائے اور رلائے نہیں چھوڑتے' پریم چند کو جب کہیں ایسا موقع آجاتا ہے تو دل کی رگوں پر اس طرح انگلیاں رکھتے ہیں گویا ستار کے تار ہیں۔ علامہ مرحوم کی تلقین عمل کا اثر فوری ہوتا ہے۔ منشی صاحب کا ذرا دیر میں اپنے ناول "پردہ مجاز" میں ایک کردار "منشی بجردھر" کے متعلق ان کا انداز تحریر کتنا دلچسپ ہے۔

"پھاگن کا مہینہ آیا۔ ڈھول مجیرے کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں' درختوں پر کوئل کوکی' گھروں میں مستورات کو کنے لگیں۔ منشی بجردھر کی مجلس بھی آراستہ ہوئی...... پھاگن آتے ہی مردنگ پر تھاپ پڑنے لگی۔ ذی حوصلہ آدمی تھے۔ فکر کو بھی پاس نہ پھٹکنے دیتے تھے۔ اس معاملہ میں وہ بڑے بڑے فلاسفروں سے بھی دو قدم آگے تھے۔ گذشتہ را صلوٰۃ کے قائل تھے مگر آئندہ را احتیاط کے قائل نہ تھے......"

ایک دن منشی بجردھر کے پاس جھنگو گویا آیا تو منشی جی نے مگن ہو کر کہا کہ آج تم ہمارا گانا سنو اور میرا بائی کا یہ پد گانے لگے۔

رام کی میں دیوانی میر و درد نے جانے کوئے
گھائل کی گت گھائل جانے جو کوئی گھائل ہوئے
شیش ناگ پہ سیج پیا کی کیسی بدھ ملنا ہوئے
درد کی ماری بَن بَن ڈولوں بَید ملا نہیں کوئے

رام کی میں دیوانی......

باوجود مصائب روزگار کا شکار ہونے کے منشی صاحب بڑے زندہ دل آدمی تھے' ان کے چہرے پر ہلکی سی مسکان یعنی تبسم کی لطیف لہریں ہمیشہ کھیلا کرتی تھیں۔ ان کے خمیر میں شوخی کی بھی آمیزش تھی جو بے تکلف دوستوں سے مذاق کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔ ان کی تصانیف ایک غریب فاقہ مست اور غنی دل فقیر کے جذبات کا نمونہ ہیں۔ وہ نظیر اکبر آبادی کی طرح زندگی کے ہر پہلو پر تھوڑا بہت عبور ضرور رکھتے تھے۔

منشی صاحب کی بذلہ سنجی اور ظرافت تمام و کمال اصلاح پر مبنی ہے۔ بخلاف حضرت اکبر الٰہ آبادی اس میں شکوہ کم اور ترغیب زیادہ ہے۔ انگریزی ناولسٹ ہارڈی کی دیہاتی خوش گپیاں اس کی ناول "ہرے جنگل کے پیڑ تلے[1]" میں بعض جگہ ضرورت سے زیادہ سبک ہو گئی ہیں۔ اور اصلاحی پہلو کا تو نام ہی نہیں ہے اور وہ محض مایۂ تفریح ہیں۔ منشی صاحب نے بازارِ حسن میں ایک جگہ خوب ہنسایا ہے۔ سمن بائی نے جب اپنے پیشے کو ترک کرنے اور توبہ کر لینے کی ٹھان لی تو بٹھل داس سے کہا کہ میں ذرا چلتے چلاتے اپنے عاشقوں کی مزاج پرسی تو کر لوں' چنانچہ ایک ایک کر کے سب آنے لگے اور یکے بعد دیگرے اس نے سب کے چونہ لگایا' پہلی مرتبہ سہانے رسیا میاں ابوالوفا تشریف لائے اور بائی جی کے ہاتھ سے سگریٹ پینے کی خواہش کی۔ سمن نے دیا سلائی کھینچ کر بجائے سگریٹ کے داڑھی میں لگا دی اور وہ دھوکے کی ٹٹی آتشِ معصیت کے نذر ہو گئی۔ "میاں جی" نے ترش رو ہو کر اظہار بیزاری کیا اور بڑبڑانے لگے۔ اس کا جواب سمن بائی نے خوب دیا یعنی یہ کہ:

"آپ میرے دین کو ایمان کو دل کو روز جلاتے ہیں' کیا ان کی قیمت آپ کی داڑھی سے بھی کم ہے۔"

دوسرے نمبر پر لالہ چمن لال کی باری تھی۔ بھینسہ قد لالہ جی کے لیے تین ٹانگوں کی کرسی بچھائی گئی لالہ جی ہانپتے ہوئے کوٹھے پر چڑھے کرسی پر بیٹھتے ہی توند کے بل گرے۔ بہت بگڑے چوٹ آ گئی' کہنے لگے "ہائے رام کمر ٹوٹ گئی۔" ارے جرا (ذرا) میرے سہیس (سائیس) کو بلا دو گھر جاؤں گا۔ اب یہاں آنے پر لانت (لعنت) ہے۔ پل بھر میں سارا عشق بھول گئے۔ اسی طرح بگلا بھگت پنڈت دینا ناتھ کو تارکول میں شرابور کیا گیا۔

افسانہ نگار اور ناولسٹ بعض اوقات اپنے کرداروں کے نام بڑے دلچسپ رکھا کرتے ہیں۔ مولانا نذیر احمد مرحوم کو اسم با مسمّیٰ کردار ثابت کرنے کا خاص ملکہ تھا۔ "ابن الوقت" "نصوح" "کلیم" "فہمیدہ بیگم" "حضرت بی بی" وغیرہ ایسے نام ہیں جو اطوار و خصائل کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ منشی صاحب کے بعض افسانے بھی اس قسم کی جدت لیے ہوئے ہیں۔ ایک افسانہ "فتح"[2] کے عنوان سے اس طرح شروع ہوتا ہے۔

شہزادہ مسرور کی شادی ملکہ مخمور سے ہوئی اور دونوں آرام سے زندگی بسر کرنے لگے...... لیکن بہت دن نہ گزرنے پائے تھے کہ ان کی زندگی میں تغیر نمودار ہوا۔ اراکین دربار میں بوالہوس خان نام کا ایک فتنہ انگیز شخص تھا......"

منشی صاحب کے وہ صنائع بدائع جو جا بجا انھوں نے اپنی تصانیف میں استعمال کیے ہیں ایک طویل

---

[1] Under the Green wood tree [2] پریم بتیسی جلد دوم

تبصرہ چاہتے ہیں جو یہاں ناممکن ہے، اس لیے صرف چند ضروری اوصاف پر اشارہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً تمثیلی قصے یعنی ایسی حکایتیں جو لقمان حکیم کی طرف منسوب کی جاتی ہیں اور جن کے کردار چڑیا، چڑے، طوطی اور باز وغیرہ ہیں۔ ان کا افسانہ ''فکرِ دنیا'' ایک کتے کی کتھا ہے۔ اس کا سراپا اس طرح بیان کیا گیا ہے:-

''شیر کا سینہ، چیتے کی آنکھیں، گینڈے کا سا گٹھا ہوا جسم''

اس کتے کی بہادری کا امتحان قصاب کی دوکان پر ہوا جب کہ ایک حسین کتیا کے عشق میں مبتلا ہو کر یہ حضرت جنگل چھوڑ کر آبادی میں آئے تھے۔ قصاب کی دوکان پر بازاری غول اسی پر جھپٹا تو:-

''اس کا منہ خود بخود سکڑ گیا، دانت باہر نکل آئے اور دم نیچے دبک گئی، وہ ایک قدم کے فاصلے پر کھڑا ہو کر مدافعت کرنے لگا۔ جب ایک بار زور سے ڈپٹ کر حملہ کرتا تو ساری جمعیت دو قدم پیچھے ہٹ جاتی۔''

اس کتے کی حالت دیکھ کر پنڈت جواہر لال نہرو کی خودنوشت سوانح عمری کا باب 45 بعنوان ''قید خانے کے جانور'' یاد آیا۔ اس میں چھپکلی، گلہری، بندر، چمگادڑ، سانپ، بچھو اور چیونٹیوں وغیرہ کا نہایت دلچسپ تذکرہ ہے۔ طوطے کی داستان اس طرح لکھی گئی ہے:-

''توتوں کا ایک دوسرے سے اختلاط محبت کرنا نہایت دلکش معلوم ہوتا تھا۔ کبھی کبھی دو نر توتوں میں کسی مادہ کی بدولت جنگ بھی ہو جاتی تھی۔ ان موقعوں پر مادہ نہایت اطمینان سے بیٹھی تماشا دیکھتی رہی اور جس کی فتح ہوتی اسے اپنا مورد عنایت بناتی[1]''

منشی صاحب کے صنائع بدائع کا مطالعہ کرنے پر اس بات کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ یہ جواہر ریزے دساوری نہیں بلکہ سودیشی اور ملکی پیداوار ہیں۔ اپنے افسانے نغمہ روح میں منشی صاحب لکھتے ہیں:

''اس نغمے میں کویل کی سی مستی، پپیہے کا سا درد، دشیاما کا سا گداز، آبشاروں کا زیر اور طوفان کا بم ہے۔''

افسانہ ''ستیہ گرہ'' میں پنڈت گدادھر نے ہڑتالیوں کے خلاف بھوک ہڑتال کی تھی، جب ایک دن گذر گیا تو ایک تجربہ کار آدمی نے کہا کہ پنڈت کسی کے منانے میں نہ آئیں گے، وہ ایک دونے میں مزیدار مٹھائی کے رس گلے کیوڑے سے خوب تربتر کر کے لے گئے۔ پنڈت سے کہا مہراج برت توڑ ڈالیے اور جھٹ دونا کھول دیا۔ دونا کھلتے ہی پنڈت جی کی رال میں مٹھاس سرایت کر گئی اور وہ آنکھوں سے مٹھائی کھانے لگے۔'' غرض روزے کو توڑ دیا اور پورا دونا صاف کر گئے۔

جس طرح غالب نے فارسی الفاظ وضع کر کے اردو زبان کی فرہنگ کو وسعت دی ہے، منشی صاحب نے اس زبان کو ہندی الفاظ سے مالا مال کر دیا۔ ایسے الفاظ کی چند مثالیں یہ ہیں۔ مثلاً عورتوں

---

[1] میری کہانی، جلد دوم

میں آپس کی ''بم چخ'' خوشامدیوں کی ''ٹھکر سہاتی'' بات چیت ''دھری اد جھے'' کم ظرفوں کی لالچی ذہنیت وغیرہ بد سے بدتر حالت کو ''کڑھائی سے نکل کر چولھے میں جانا'' لکھا ہے۔ اور عارضی خفگی پر رو دینے کو لکھتے ہیں کہ ''غصہ کیا کنوار کی برکھا تھی' دو چار بوندیں گریں' پھر آسمان صاف'' اسی طرح ''بازارِ حسن'' میں سمن بائی اپنے گھر کی بدنامی اپنی ذات کی طرف منسوب کر کے کہتی ہے کہ ''اس رام لیلا کی کیکئی میں ہی ہوں۔ خود بھی ڈوبی اور دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبی۔''

ہم نے منشی صاحب کے کرداروں (کیرکٹروں) کا مقابلہ و موازنہ پہلے ہی جا بجا کر دیا ہے۔ اس لیے ان سے متعلق کسی مخصوص عنوان کی ضرورت نہیں' البتہ فتنہ پردازی اور معصیت میں شکسپیئر کے ڈرامہ اتھیلو کے [1] آئیگو (lago) سے کم نہیں مگر گیان سنگھ کی آرزو حصول دولت ہے اور آئیگو محض شرارت و بغض باطنی کی وجہ سے ڈسڈیمونا [2] کے خون کا باعث ہوتا ہے۔ سمن بائی گائتری اور دیو پریا کا مقابلہ ہال کین کی میری' میری کوریلی کی سبل [3] سے (جو حسن کے چولے بدلا کرتی تھی) کیا جا سکتا ہے۔ حال کے مطبوعہ ناول ''میدانِ عمل'' میں البتہ کئی مردانے کردار نمایاں ہیں۔ امر کانت' سلیم' اور سکینہ تینوں ہیرو بننے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ میاں سلیم شاعر بھی ہیں اور بابو امر کانت صحیح ادبی ذوق کے دلدادہ ہیں' بعض ناولوں میں منشی صاحب نے عورتوں کو ہمت' جیوٹ اور شجاعت کا سبق دیا ہے۔ ناول ''بیوہ'' میں پورنا نے اپنی عصمت بچاتے وقت کملا پرشاد کا دانت توڑ دیا اور ناک زخمی کر دی۔

''میدانِ عمل کی سلونی تو اچھی خاصی دیوی ہے' دو گوروں اور ایک میم کو اس نے چھری سے مار ڈالا' ایک بار میاں سلیم کو بھی چرغلو کیا تھا مگر بچ گئے۔ اس قسم کی بہادری کی تلقین کرنے میں منشی صاحب کا انداز بیان مہارت کے مرتبے سے متجاوز ہو گیا ہے۔ ناول ''چوگانِ ہستی'' میں اندھے سورداس کا کیرکٹر بہت دلچسپ ہے' خصوصاً اس وقت جبکہ بجرنگی کا لڑکا گھیسو اس کے ساتھ شرارت کرتا ہے۔ سورداس بھگت بڑا اگر گیانی تھا' نرا مور کھ نہ تھا۔ مسٹر جان سیوک سے مذہبی تکرار میں بڑی وضعداری برت گیا۔ اور زمین کا بیوہار کرنے میں وہ منطق بگھاری کہ بڑے بڑے ہوشیار اس کو مان گئے۔

سلیم کے علاوہ منشی صاحب کے مسلمان کیرکٹر عموماً کمزور ہیں۔ ''گوشہ عافیت'' میں ڈاکٹر عرفان علی کو چھوڑ کے سب نتھو خیرے بھرے پڑے ہیں۔ ''بازارِ حسن'' میں کئی میونسپل کمشنر مسلمان ہیں جو ''قانون سود'' اور ''استیصال شاہدانِ بازاری'' وغیرہ مسئلوں کے متعلق رائے زنی کرتے ہیں۔ مگر رنگیلے رسیا ابوالوفا کے علاوہ سب یوں ہی ہیں۔ ''چوگانِ ہستی'' میں عیسائیوں کا عمل دخل ہے۔ اکّے دکّے مسلمان بھی ہیں۔

---

1. Othello　2. Dessdemonia　3. Syble

منشی صاحب کے افسانے اور مضامین خدا کے فضل سے سبھی کتابی صورت میں شائع ہو گئے ہیں۔ ان میں سے ''خاک پروانہ'' میں ستیا گرہ، جَیک (فکر دنیا) اور مستعار گھڑی بہت دلچسپ افسانے ہیں۔ ''خواب و خیال'' میں ''نوک جھونک'' اور ''مایۂ تفریح'' نہایت عمدہ ہیں۔ ''فردوس خیال'' میں نیک بختی کے تازیانے ''عفو'' اور ''ڈگری کے روپے'' نہایت کامیاب افسانے ہیں۔ ''پریم پچیسی'' میں ''وکرمادت کا تیغہ'' ''آہ بیکس'' اور ''گناہ کا اگن کنڈ'' قابل مطالعہ ہیں اور ''پریم بتیسی'' میں ''بنک کا دیوالہ'' ''جج اکبر'' اور سوتیلی ماں'' خوب ہیں۔

رہے ناول ان کے متعلق اوپر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، یہاں پر مجملاً صرف اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ ان کے بہترین ناول ''پردۂ مجاز'' اور ''چوگان ہستی'' ہیں۔ ''پردہ مجاز'' تو بمنزلہ صحفِ الہامی کے ہے۔ شیدایان علم کو اس کے مطالعہ سے غذائے روح اور مقویات قلب کے ذخیرے نہایت آسانی سے مل جائیں گے۔ ''بازار حسن'' اور میدان عمل'' کا مطالعہ سبق آموز ہونے کے علاوہ نہایت ہی دلچسپ ثابت ہوگا۔ ممکن ہے ان سے بھی زیادہ دلچسپ ناول ہوں جو راقم کی نظر سے نہ گزرے ہوں، بہرحال اب تو پریم چند اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔ کیا اب بھی ان کی قدر نہ ہوگی اور ان کی تصانیف پردۂ خفا میں پڑی رہیں گی؟ ان کے وہ افسانے جو مادھوری اور سرسوتی وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کے مجموعے شائع ہو جانا چاہیے اور ان کے ترجمے اردو زبان کے لیے مفید ہوں گے۔ ان کے اکثر مضامین ''زمانہ'' اور بعض دیگر رسائل میں دیکھے گئے ہیں۔ ان سب کو ایکجا کر کے ایک بڑی کتاب کی صورت میں شائع کرنا چاہیے۔

پریم چند کا آرٹ

ہندوستانی ادب پر پریم چند کے بڑے احسانات ہیں۔ انھوں نے ادب کو زندگی کا ترجمان بنایا۔ زندگی کو شہر کے تنگ گلی کوچوں میں نہیں بلکہ دیہات کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں جا کر دیکھا۔ انھوں نے زبانوں کو زبان دی اور ان کی بولی میں بولنے کی کوشش کی۔

پریم چند کے نزدیک آرٹ ایک کھونٹی تھی حقیقت کو لٹکانے کے لیے۔ سماج کو وہ بہتر اور برتر بنانا چاہتے تھے اور عدم تعاون کی تحریک کے بعد یہ ان کی زندگی کا مشن ہو گیا تھا۔

پریم چند ہمارے ادب کے سرتاجوں میں تھے۔ وقتی مسائل کی اہمیت کو انھوں نے اس شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ فن کے معیار کو اس پر قربان کر دیا۔ افسانہ نگاری میں ان کا وہی مرتبہ ہے جو شاعری میں حالؔی کا۔ دونوں پیش رو تھے، دونوں پیغمبر تھے، دونوں بیداری کے نقیب تھے۔ شخصی حیثیت سے بھی دونوں ایک دوسرے کے قریب تھے۔ سادگی کے رسیا اور اخلاص کے پجاری۔ انھوں نے زندگی کی کامرانی کا پیغام سنایا، اسی میں عمر گزاری اور سختیاں جھیلیں اور شہادت کے درجے کو پہنچے۔

(رسالہ اردو۔ اکتوبر 1936)

میدان عملؔ

منشی پریم چند کے آخری اردو ناول پر ایک نظر

(از مسٹر مالک رام ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی)

''میدان عمل'' جو منشی پریم چند کی وفات سے تھوڑے ہی عرصہ پہلے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی طرف سے شائع ہوا، ان کے دوسرے ناولوں کی طرح ان کی تمام خصوصیات کا حامل ہے۔ مختصراً قصہ یہ ہے:

لالہ سمرکانت دہلی کے نہایت مالدار لیکن حد درجہ کنجوس سیٹھ ہیں۔ انھوں نے بھی دوسرے بیسیوں ساہوکاروں کی طرح اپنی بے اندازہ دولت دھوکے دھڑی سے جمع کی ہے۔ ان کی دو شادیاں ہوئیں۔ لیکن اب کوئی بیوی زندہ نہیں۔ پہلی بیوی سے ان کا اکلوتا لڑکا امرکانت ہے اور دوسری سے ایک لڑکی نینا۔ امرکانت کو اپنی تعلیم کے زمانہ میں بھی خرچ کے متعلق مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ سیٹھ جی کے خیال میں اس کی تعلیم کا سب خرچ لغو اور فضول ہے۔ دوران تعلیم ہی میں امرکانت کی شادی لکھنؤ کی ایک مالدار بیوہ کی خوبصورت فیشن کی دلدادہ، خود پرست اور نخوت پسند اکلوتی صاحبزادی سکھدا سے ہو جاتی ہے۔ امرکانت پہلے ہی اپنے پرائیوں کی گھڑکیوں سے بیزار ہے۔ اس غریب کو بیوی بھی ملی تو ایسی جو محبت سے زیادہ حکومت کرنا جانتی ہے۔ دونوں کی طبیعتوں میں بعد المشرقین ہے۔ وہ پورب کی کہے تو یہ پچھم کی۔ یہ سادگی پسند ہے تو اسے چوبیس گھنٹہ سولہ سنگار سے فرصت نہیں۔ آخر جب امرکانت کی تعلیم کا زمانہ ختم ہوا تو سیٹھ جی نے چاہا کہ وہ گھر کا کاروبار سنبھالے اور انھیں گرہستی کے جھنجھٹ سے آزاد

ا؎ اس وقت تک یہی اردو کا آخری ناول تھا۔ گئودان 1939ء میں شائع ہوا تھا۔ (مانک ٹالا)

کردے۔ امرکانت کو والد کے جعل فریب کے طریقوں سے نفرت تھی۔ وہ غریبوں کی زار حالت دیکھ دیکھ کر آٹھ آٹھ آنسو روتا تھا۔ بھلا وہ ان کے نقش قدم پر کیسے چل سکتا تھا۔ آخر وہ سب کچھ تج کر گھر سے نکل کھڑا ہوتا ہے اور ہردوار کے قریب ایک گاؤں میں جا کر ڈیرا جماتا ہے۔ وہاں اس نے غریب چماروں کے بچوں کو تعلیم دینا شروع کیا۔ اچھوتوں کے لیے مندروں کے دروازے کھولنے کے لیے ایک کامیاب ستیہ گرہ ہوتا ہے۔ جس میں اس کی لاجونتی بیوی سکھدا نمایاں حصہ لیتی ہے۔ آخر مزدور پیشہ لوگوں کے لیے گھر بنانے کو جگہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ امرکانت کی بیوی اور بعض دوسرے مقامی رہنماؤں کی خواہش ہے کہ ایک خاص قطعہ زمین اس کام کے لیے دے دیا جائے۔ لیکن میونسپل بورڈ اس مطالبہ کو منظور نہیں کرتا۔ انجام کار بورڈ کے اس ناہمدردانہ رویہ کے خلاف احتجاجی ہڑتال کا فیصلہ ہوتا ہے۔ جس میں امرکانت کی بیوی۔ باپ۔ ساس اور استاد (ڈاکٹر شانتی کمار) گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اس کی بہن نینا بھی شہید ہو جاتی ہے۔ یہ قربانیاں رنگ لاتی ہیں۔ بورڈ تمام مطالبات تسلیم کرلیتا ہے اور وہ قطعہ زمین مزدوروں کے مکانات کے لیے مل جاتا ہے۔"

جہاں امرکانت ہے وہاں کا نقشہ بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ کاشتکاروں پر لگان کی وصولی کے لیے جو سختیاں ہوتی ہیں۔ ان سے متاثر ہو کر مالگزاری میں تخفیف کی تحریک شروع کی جاتی ہے۔ امرکانت اس تحریک کا روح رواں ہے۔ حکومت سختی کرتی ہے۔ پکڑ دھکڑ شروع ہوتی ہے۔ بے دخلی، قرقیوں اور گولیوں تک کی نوبت آتی ہے۔ امرکانت اور کئی دیگر اصحاب جیل خانوں میں ٹھونس دیے جاتے ہیں۔ آخر بعض لوگوں کے درمیان پڑنے سے حکومت ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دیتی ہے۔ دونوں تحریکوں کے قیدیوں کی رہائی لکھنؤ جیل سے ایک دن ہی عمل میں آتی ہے اور اس طرح سب بچھڑے ہوئے خوشی خوشی ملتے ہیں۔

منشی پریم چند کے پہلے ناولوں کا خاص مقصد ہماری سماجی امراض کی تشخیص اور ان کا علاج تجویز کرنا تھا۔ چونکہ انھیں خود بھی زمانہ کے سرد و گرم اور نشیب و فراز کا کافی تجربہ تھا۔ اس لیے ان کی تشخیص و نسخہ دونوں کی صحت میں کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ میدان عمل میں معاشری سے زیادہ سیاسی پہلو نمایاں ہے۔ آخری دنوں میں ان کے مختصر افسانوں میں بھی یہی رنگ غالب ہو گیا تھا۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔ ہر ایک قومی مصنف اپنے گرد و پیش کے حالات سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتا ہے۔ اس کی تحریر قوم کے احساسات اور مساعی کا آئینہ ہوتی ہے۔ پھر منشی پریم چند تو یوں بھی قدرت کی طرف سے غیر معمولی طور پر

اثر پذیر طبیعت لے کر آئے تھے۔ بھلا وہ کیسے اس اثر سے محفوظ رہ سکتے تھے۔

اگر ایک فقرہ میں اس ناول کا مقصد بیان کیا جائے تو یہ ناول ایک گردوپیش کے حالات سے متاثر اور حساس دل و دماغ والے نوجوانوں کے کردار کی ارتقائی منازل کا بیان ہے۔ لیکن درحقیقت اس ناول میں ہماری پچھلے دس پندرہ برس کی تمام تحریکوں کا نفسیاتی مطالعہ ہے۔ کہیں اچھوتوں کے لیے مندروں کے دروازے کھل رہے ہیں تو کہیں سیوا آشرم بن رہے ہیں۔ کہیں لگان کی تخفیف کی تحریک ہے تو کہیں گرام سدھار کی کوشش ہے کہیں مزدوروں کی تنظیم ہے تو کہیں ان کی اقتصادی بہتری کے وسائل کا بیان ہے۔ غرض مصنف نے اس پانچ سو صفحہ کی کتاب میں استادانہ چابکدستی کے ساتھ ہماری تمام بیماریوں کا نقشہ کھینچ کے رکھ دیا ہے۔

لیکن محض واقعات کے بیان کر دینے میں کوئی کمال نہیں تھا۔ یہ ایک معمولی درجہ کا مصنف بھی کر سکتا ہے۔ کرداروں کے ہر ایک عمل کی تہہ میں جو جذبہ کام کر رہا ہے۔ منشی پریم چند نے اس کا تجزیہ کیا ہے اور حیرت ہوتی ہے جب وہ اپنے مطالعہ کے نتائج کو سادہ سادہ لفظوں اور دل نشین انداز میں بیان کر دیتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

> ''سیٹھ سمرکانت کے دن رات جائز اور ناجائز — جائز کم اور ناجائز زیادہ -- طریقوں سے روپیہ جمع کرنے میں گزرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں امرکانت بھی میرے قدموں پر چلے۔ ایک دن ان کی غیر حاضری میں امرکانت دوکان پر بیٹھا تھا۔ ایک شخص چوری کا مال فروخت کرنے آتا ہے۔ امرکانت دو سو کی چیز تیس روپیہ میں لینے سے انکار کر دیتا ہے۔ جب سمرکانت واپس آتے ہیں اور انھیں صاحبزادہ کی کارگزاری کا حال معلوم ہوتا ہے تو وہ سخت ناراض ہوتے ہیں۔ جب امرکانت کہتا ہے ''میں تو چوری کے مال کو مفت بھی نہ لیتا۔ ایسے روزگار پر میں لعنت بھیجتا ہوں۔'' تو سمرکانت آپے سے باہر ہو کر بولے۔
>
> ''چپ بھی رہو۔ شرماتے نہیں۔ اوپر سے باتیں بناتے ہو۔ ڈیڑھ سو روپیہ مفت میں بیٹھے بٹھائے ملتے ہیں۔ وہ تم نے اپنے اصول پروری کے زعم میں کھو دیے۔ اس پر بھی اکڑتے ہو۔ جانتے بھی ہو دولت کیا چیز ہے۔ سال میں ایک بار بھی گنگا اشنان کرتے ہو؟ ایک بار بھی دیوتاؤں کو جل چڑھاتے ہو؟ کبھی رام کا نام بھی لیا ہے زندگی میں؟ کبھی ایکادشی یا کوئی دوسرا برت رکھا ہے؟ کبھی کتھا پران پڑھتے یا سنتے ہو؟ تم کیا جانو دھرم کیا چیز ہے۔ دھرم دوسری شئے ہے اور روزگار دوسری شئے ہے۔ چھی۔ صاف ڈیڑھ سو پانی میں ڈال دیے۔''

یہی سیٹھ امر کانت ایک دوسرے موقع پر بالمیکی رامائن کی کتھا کے لیے نو سو روپیہ چندہ دے دیتے ہیں۔ غرضیکہ ان کی عملی زندگی میں تمام وہ باتیں ہیں جو ناپسندیدہ ہیں۔ چوری کا مال خریدنا۔ شرح سود کا بہت زیادہ ہونا۔ غریبوں کا خون چوسنا اور دوسری جعل فریب کی باتیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ مذہب کی رسوم کے بہت زیادہ پابند ہیں۔ صبح نہائے بغیر ان کے لیے پانی کا ایک گھونٹ پینا حرام ہے۔ شام کو مندر کی آرتی اور "تلسی دل" چڑھانا۔ ان میں کبھی ناغہ نہیں ہونے پاتا۔"

کس قدر سچی تصویر ہے ہمارے ان گنجے سر اور بڑی بڑی توند والے سیٹھ ساہوکاروں کی۔ وہ مذہب عقائد جن کا ہمارے اعمال اور دوسروں کے ساتھ تعلقات پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ ان سے کیا فائدہ۔ سچ تو یہ ہے کہ مذہب کا مقصد اخلاق کو بلند کرنا ہے مگر اس میں ہمیں یقین نہیں رہا۔ یہ محض چند نمائشی رسوم و رواج تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ ہم عملی زندگی میں مذہب کی حقیقی روح سے جس قدر دور ہوتے جاتے ہیں۔ اسی قدر ہماری اس نمائش میں غلو کا پہلو زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔

مندر کے ستیہ گرہ کے دوران میں جب لاٹھی چلی تو ڈاکٹر شانتی کمار کو سخت چوٹیں آئیں اور وہ ہسپتال پہنچا دیے گئے۔ ان کی غیر حاضری میں تحریک کی باگ ڈور سکھدا کے ہاتھ آئی۔ جس دن گولی چلی۔ اس دن وہ سینہ سپر ہجوم کے آگے آگے تھی۔ آخر جب مندر کے دروازے کھول دیے گئے تو سارے شہر میں سکھدا کی بے جگری اور تہور کا غلغلہ تھا۔ وہ مرجع خلائق بن گئی۔ خصوصاً نچلے طبقے کے لوگ تو اس کی پوجا کرنے لگے اور ساری تحریک کی کامیابی کا سہرا سکھدا کے سر باندھا گیا۔ ڈاکٹر صاحب ہنوز ہسپتال میں بیمار پڑے تھے۔ دیکھیے اس موقع پر منشی صاحب نے کیا پتہ کی بات لکھی ہے۔

"ڈاکٹر صاحب اب اٹھنے بیٹھنے لگے تھے۔ پر اب بھی اتنے کمزور تھے کہ لاٹھی کے سہارے کے بغیر ایک قدم بھی نہ چل سکتے تھے۔ چوٹیں انھوں نے کھائیں۔ چھ مہینے سے اسپتال میں پڑے ہوئے تھے اور نام ہوا سکھدا کا۔ یہ صدمہ انھیں اور گھلائے ڈالتا تھا۔ اگر چہ انھوں نے اپنے مخلص دوستوں سے بھی کبھی اپنا دردِ دل نہیں کہا۔ مگر یہ کانٹا کھٹکتا ضرور تھا۔ اگر سکھدا عورت نہ ہوتی اور وہ بھی ایک عزیز شاگرد اور دوست کی بیوی تو شاید وہ شہر چھوڑ کر بھاگ جاتے۔"

جب سکھدا اسپتال میں ان کی عیادت کو گئی تو کہنے لگے۔

"زندگی کے چھ مہینے گویا کم ہو گئے۔ بلکہ آدھی عمر کہیے۔ میں اب اچھا ہو کر بھی آدھا ہی رہوں گا۔ کتنی شرم آتی ہے کہ دیویاں باہر نکل کر کام کریں۔ اور میں کمرے میں بند پڑا

رہوں۔"

سکھدا نے جیسے اُن کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"آپ نے اس شہر میں جتنی بیداری پھیلائی۔ اس حساب سے تو آپ کی عمر جوگنی ہوئی۔

مجھے تو بیٹھے بٹھائے جس مل گیا۔"

"یہ سن کر شانتی کمار کے زرد چہرے پر روحانی مسرت کی سرخی دوڑ گئی۔ سکھدا کی زبان سے

یہ سند پا کر گویا انھیں کونین کی دولت مل گئی۔"

کس قدر نفسیاتی مطالعہ ہے۔ یہ ڈاکٹر شانتی کمار وہ ہیں جنھوں نے خدمت قوم کے لیے اپنی سینکڑوں روپیہ ماہوار کی ملازمت پر لات ماردی جو ولایت سے تعلیم حاصل کر کے آئے مگر اہل ملک کے افلاس کو دیکھ کر انھوں نے سادہ زندگی کو اپنا شعار بنالیا۔ موٹا جھوٹا کھاتے اور موٹا جھوٹا پہنتے۔ اچھوتوں کے مندر میں داخلہ کے حق کو تسلیم کرانے کی خاطر انھوں نے لاٹھیاں کھائیں۔ ان بے غرض خدمات کے باوجود وہ اس خواہش سے بلند نہ ہو سکے کہ لوگ میری تعریف کریں اور وہ کڑھ رہے ہیں کہ ہائے دوسروں کی تعریف ہو رہی ہے اور میرا کوئی نام بھی نہیں لیتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بسا اوقات ہم اپنے آپ کو دھوکا دے لیتے ہیں۔ ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم واقعی بے غرض خدمت کر رہے ہیں۔ اس کام سے ہمیں کوئی ذاتی منفعت مقصود نہیں۔ فرض کو فرض کی خاطر نبھا رہے ہیں۔ لیکن جہاں کہیں اس پندار کے بت کو ٹھیس لگی۔ ہمیں اپنی کمزوری محسوس ہوتی ہے کہ ابھی تک ہم دنیا کی نیک نامی اور بدنامی سے بلند نہیں ہوئے۔

انھیں ڈاکٹر شانتی کمار کے ایک دوست مسٹر غزنوی ہیں۔ ایک ضلع کے افسر اعلیٰ ہیں۔ ولایت میں ایک ساتھ تعلیم حاصل کی۔ واپس آ کر دونوں نے اپنی اپنی علاحدہ راہ ڈھونڈی۔ وہ قوم کے پیچھے سب کچھ تیاگ کے فقیر ہو گئے۔ یہ آئی سی ایس ہو گئے اور ایک ضلع کے حاکم بن بیٹھے۔ ایک مدت کے بعد کسی نے مسٹر غزنوی سے ان کا ذکر کیا۔ تو کہنے لگے۔

"ذرا ان کا پتہ تو بتانا۔ میں یہاں آنے کی دعوت دوں گا۔"

سلیم نے سر ہلایا۔ انھیں کہاں فرصت۔ میں نے بلایا تھا۔ نہیں آئے۔"

غزنوی نے مسکرا کر کہا "تم نے رنج کے طور پر بلایا ہوگا۔ کسی انسٹی ٹیوشن کی طرف سے بلاؤ اور کچھ چندہ کرا دینے کا وعدہ کرو۔ دیکھو سر کے بل دوڑے آتے ہیں یا نہیں۔ ان قومی خادموں کی جان چندہ ہے۔ ایمان چندہ ہے اور شاید خدا بھی چندہ ہے۔ جسے دیکھو چندہ کی ہائے

بائے۔ میں نے کئی بار ان خادموں کو خوب چڑکا دیا ہے۔ اس وقت ان کی صورت دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ ہیں کہ گالیاں دے رہے ہیں۔ پینترے بدل رہے ہیں۔ زبان سے توپ کے گولے چھوڑ رہے ہیں۔ اور آپ ان کی بوکھلاہٹ کا مزا اٹھار ہے ہیں۔ میں نے تو ایک بار ایک لیڈر کو پاگل خانہ میں بند کرا دیا تھا۔ کہتے ہیں اپنے کو قوم کا خادم اور سمجھتے ہیں آقا۔

اس تقریر کا کچھ وہی لطف اٹھا سکتا ہے جسے کسی ایسے لیڈر سے واسطہ پڑا ہو۔ یہ بالکل سچ ہے کہ وہ خادم سے زیادہ اپنے آپ کو قوم کا مخدوم سمجھتے ہیں۔ ذرا کوئی بات ان کے مزاج یا رائے کے خلاف ہوئی اور وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ بس منہ پر کف ہے اور آستینیں چڑھی ہوئی ہیں۔ آنکھیں لال ہیں اور نتھنے پھولے ہوئے ہیں اور ان سب کو مغلظات سنا رہے ہیں جنھوں نے اس ''دیوتا'' سے اختلاف رائے کی جرأت کی تھی۔

امر کانت نے جس گاؤں میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ وہاں ایک زمانہ کی ستائی ہوئی اور ٹھوکریں کھائی ہوئی حسین بیوہ منی تھی۔ ان کی پہلے بھی معمولی سی جان پہچان تھی۔ لیکن چونکہ امر کانت یہاں اسی گھر کا مہمان تھا جس میں منی رہتی تھی۔ اس لیے اب انھیں ایک دوسرے سے زیادہ ملنے جلنے اور ربط ضبط کا موقع ملا تو دونوں کی دلچسپی گہرا رنگ اختیار کرنے لگی لیکن امر کانت کی طبیعت میں حد درجہ کی شرم و حیا تھی۔ اس دل بستگی کے باوجود اس سے کبھی خواب میں بھی یہ امید نہ ہو سکتی تھی کہ وہ کوئی نازیبا جرأت کرے گا۔ ایک شام منی کنوئیں سے پانی لینے جا رہی تھی کہ راہ میں امر کانت کی جھونپڑی میں ٹھہر گئی اور باتیں ہونے لگیں۔ دیکھیے اس مقام پر مصنف نے اک عورت کے جذبات کا کیسا صحیح نقشہ کھینچ کے رکھ دیا ہے۔

> ''منی نے کلسا زمین پر رکھ دیا اور بولی'' میں تم سے باتوں میں نہ جیتوں گی لالہ' لیکن تم نہ تھے تو میں بڑے چین سے رہتی تھی۔ گھر کا دھندا کرتی تھی۔ روکھا سوکھا کھاتی تھی اور سو رہتی تھی۔ تم نے میری وہ بے فکری چھین لی۔ اپنے من میں کہتے ہو گے بڑی چنچل عورت ہے۔ کہو جب مرد ہی عورت ہو جائے۔ تو عورت کو مرد بننا پڑے گا۔ جانتی ہوں۔ تم مجھ سے بھاگے بھاگے پھرتے ہو۔ مجھ سے گلا چھڑاتے ہو۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ میں تمھیں پا نہیں سکتی۔ لیکن پھر بھی تمھارے پیچھے پیچھے پھرتی ہوں۔ میں تم سے اور کچھ نہیں مانگتی۔ بس اتنا ہی چاہتی ہوں کہ تم مجھے اپنی سمجھو۔ مجھے معلوم ہو کہ میں بھی عورت ہوں۔ میرے سر پر بھی کوئی ہے میری زندگی بھی کسی کے کام آ سکتی ہے۔''

امر نے اب تک منی کو اسی طرح دیکھا تھا جیسے ہر ایک نوجوان کسی حسینہ کو دیکھتا ہے۔ محبت

سے نہیں محض رنگین مزاجی سے۔ مگر اس التجا نے اس کی آتش شوق کو بیدار کر دیا۔ بولا" آؤ ہم تم کہیں چلے چلیں منی اور وہاں میں یہ کہوں گا یہ میری.........."

منی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولی" بس اور کچھ نہ کہنا۔ مرد سب ایک سے ہوتے ہیں۔ میں کیا کہتی تھی اور تم کیا سمجھ گئے۔"

منی نے کلسا اٹھایا اور کنوئیں کی طرف چلی۔ امر منی کے اس التفات کے بعد یہ احتراز دیکھ کر حیران رہ گیا۔ واقعی حسینہ کا دل پہیلی ہے۔

دفعتاً منی نے پکارا۔ لالہ! تازہ پانی لائی ہوں۔ ایک لوٹا لاؤں۔"

امر کو پیاس لگی تھی مگر کہا" ابھی تو پانی پینے کو جی نہیں چاہتا۔"

اقتباس بجائے خود کافی لمبا ہو گیا۔ حالانکہ اس میں بھی کتر بیونت کرنا پڑی۔ لیکن کیسے نازک جذبات ہیں جو ان سطروں میں بیان کیے گئے ہیں۔ خصوصاً منی کے تشنہ محبت دل کی التجا جن دردناک الفاظ میں بیان کی ہے۔ وہ اپنی آپ مثال ہے۔

غرض میدان عمل میں جہاں ہماری پچھلے چند برس کی تحریکوں پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ وہاں اس کے کردار بھی ہماری طرح گوشت پوست کے انسان ہیں۔ ان کے جذبات اور احساسات خواہشات اور امنگیں۔ رشک و حسد کے جذبات بھی ویسے ہی ہیں جیسے واقعی اس دنیا کے لوگوں کے ہوتے ہیں۔ آج تک ہوتے آئے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔ کوئی مافوق العادت یا غیر معمولی کردار نہیں پیش کیا گیا، جس سے ہم مرعوب ہو جائیں۔ یا جس کا کوئی فعل یا قول غیر فطری معلوم ہو۔ سب ہماری طرح اسی دنیا کے رہنے والے ہیں۔

یہ نہیں کہ اس ناول میں کوئی نقص نہیں۔ اس میں کئی جگہ مصنف سے لغزش ہو گئی ہے۔ مثلاً:

(۱) منی کا عدالت میں بیان اور رہائی کے بعد اس کی تقریر جس زبان میں ہے اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی نہایت تعلیم یافتہ اور قابل عورت ہے۔ حالانکہ جس ماحول میں اس کی پرورش ہوئی ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سے کسی تقریر کی، وہ بھی ایسی فصیح و بلیغ تقریر تو درکنار امید رکھنا ہی بے معنی ہے۔ لیکن یہی منی جب جیل میں سکھدا سے گفتگو کرتی ہے تو بزار کا بجار اور سزا کو سجا کہتی ہے اور اس کی باتوں سے گنوار پن ٹپکتا ہے۔

(۲) جس دن مندر میں پہلے دن ہنگامہ ہوا۔ سکھدا وہاں حسب معمول کتھا سننے نہیں گئی تھی

لیکن واپسی پر سکھدا اور نینا کو باتیں کرتے دکھایا گیا ہے۔

(۳) جس دن منی رام نے نینا کو گولی کا نشانہ بنایا۔ اس کے پانچ دن بعد منی رام کے والد سیٹھ دھنی رام جیل میں سب قیدیوں سے ملنے جاتے ہیں۔ گفتگو کے دوران میں وہ کہتے ہیں کہ منی رام کی وفات پر گورنر نے ماتم پرسی کا تار بھیجا تھا۔ ان پانچ دنوں میں کسی عدالت کی طرف سے تو منی رام کو پھانسی کی سزا ہو نہیں سکتی تھی اور اگر اس نے خودکشی کی تھی تو اس کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا۔

ایسے ہی چند ایک اور معمولی نقائص ہیں۔ ایک بڑا نقص جو منشی صاحب مرحوم کے قریباً تمام ناولوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ ہے کہ جہاں وہ عام لوگوں خصوصاً مزدوروں کاشتکاروں اور نچلے طبقہ کے لوگوں کے مکالمہ میں واقعیت کا رنگ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ وہاں ان کا اعلیٰ طبقہ کی سوسائٹی کا مکالمہ کامیاب نہیں۔ اسی جگہ کتابی تحریر یا زیادہ سے زیادہ تقریر کا رنگ جھلکنے لگتا ہے لیکن بے عیب ذات خالق کی ہے۔ اس کے سوا کوئی چیز نقص سے خالی نہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود ان کی تمام کتابوں میں جس سادہ زبان اور انشاء میں عوام اور خواص کے نفسیاتی مطالعہ کے نتائج پیش کیے گئے ہیں وہ منشی پریم چند ہی کا حصہ ہیں۔ کم از کم ہماری زبان میں ان کی مثال نہیں۔ چونکہ مرحوم عربی۔ فارسی سے زیادہ مزاولت نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے ممکن ہے کہ کوئی صاحب ان کے بعض الفاظ کے استعمال پر معترض ہوں۔ لیکن معاشری خرابیوں کی اصلاح کے لیے جو کام ٹالسٹائی چیخوف اور گورکی نے روس میں کیا وہی یہاں ہمارے لیے منشی پریم چند نے کیا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان لوگوں کو اپنی زندگی میں ہی قبول عام کی سند ملی اور وہ فارغ البال جئے اور مرے۔ منشی پریم چند کو بھی اب کچھ کچھ قبول عام حاصل ہو چلا تھا۔ لیکن دوسری شق کے متعلق ان پر جو کچھ بیتی۔ اس کا بیان ہماری بے حسی اور ناقدری کا ایسا دردناک رونا ہے کہ اسے سن کر ہمیں شرم سے سر جھکا لینا پڑتا ہے۔ آئندہ لوگ منشی پریم چند کے فن اور کمال پر تنقیدی مقالے اور کتابیں لکھیں گے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ انھیں مرتے وقت اپنے پسماندگان کی طرف سے اطمینان کامل نہ تھا۔

اپنے دل کو سمجھانے کے لیے دلائل کی کمی نہیں ہوتی۔ دنیا میں آسان ترین کام خود کو دھوکا دینا ہے۔ قوم پرستی کے لیے آہنی استقلال اور زبردست روحانی طاقت درکار ہے۔ تن پروری اور قوم پرستی میں بعد المشرقین ہے۔ (پریم بتیسی) پریم چند

گئودان[1]

منشی پریم چند کا آخری ناول

منشی پریم چند کو ''شہنشاہ ناول نویساں'' کا خطاب دیا گیا ہے۔ واقعی انھوں نے افسانوں اور ناولوں کی جلدوں پر جلدیں لکھ کر ہندوستانی ادب کو لٹریری دولت سے مالا مال کر دیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان ناولوں اور کہانیوں نے پریم چند کو دنیا کے بڑے بڑے مشہور فسانہ نگاروں ٹالسٹائی، موپاساں، ٹیگور، او ہنری، اور کپلنگ کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ ان کے ناولوں کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہندوستانی زبان کے سب سے بڑے ناول نویس تھے۔ گو ہماری رائے میں ان کی طبع رسا کے جوہر بڑے ناولوں میں اس قدر نہیں کھلتے، جتنے کہ چھوٹی چھوٹی کہانیوں میں کھلتے ہیں۔ وہ کسی ''رائے بہادر'' یا نیم صاحب بہادر ''مسٹر شرما بی۔ اے، ایم۔ اے، بی ایل ڈی لٹ'' کی تصویر اس قدر خوبصورت خط و خال کے ساتھ نہیں کھینچتے جتنی کہ ایک غریب ہندوستانی دیہاتی کی کھینچتے ہیں۔ چنانچہ منشی پریم چند کے ناول ''گئودان'' کے پہلے ہی صفحہ پر جب ایک بڈھے جھریاں پڑے ہوئے دیہاتی ''ہوری'' اور اس کی زبان دراز مگر وفادار خدمت گزار دیہاتی بیوی مسماۃ دھنیا سے ملاقات ہوتی ہے تو ہماری طبیعت حد درجہ شگفتہ ہو جاتی ہے۔ پریم چند نے اپنی کہانیوں میں سینکڑوں آدمیوں کی کردار بندی کی ہے لیکن ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اس وفاشعار مگر لڑاکا شریف النفس مگر کسی قدر خود غرض، جفاکش مگر فاقہ مست جوڑے سے زیادہ صحیح ''ہندوستانی'' کیرکٹر اور کہیں نہیں دیکھا۔

لیکن یہیں ایک بڑی گڑبڑ بھی پیدا ہو گئی ہے یعنی جب عزت و آبرو، محنت و جفاکشی اور غم و الم کے ایک سیدھے سادے قصہ میں ہمارے دل میں ہوری اور دھنیا اور ان کے پریشان کن بچوں سے محبت پیدا ہو جاتی ہے تو پریم چند زبردستی اور غیر فطری طور پر ایک دوسری دنیا کا قصہ بیان کرنے لگتے ہیں۔ جس کو

---

[1] پریم چند کے ہندی ناول گودان کا ریویو — (مانک ٹالا)

فی الحقیقت ایک دوسرے ناول میں قلم بند ہونا چاہیے تھا۔ دوسری دنیا سے ہمارا مطلب وہ طبقہ ہے جو دولت دنیا سے مالا مال ہے اور جس کے گھر کیا محلہ میں بھی فاقہ کی صورت نظر نہیں آتی، جس میں ضرورت سے زیادہ تعلیم یافتہ لوگ اور لندن کے گریجویٹ ہیں اور جو یا تو قرض زدہ زمیندار ہیں یا صرف سرمایہ دار۔ پریم چند نے شاید یہ ظاہر کرنے کے لیے اس قصہ کو اس ناول میں داخل کیا ہے کہ جس شخص کا قلم غریبوں کی دنیا پیدا کر سکتا ہے اس کا قلم قارون کی ذریات بھی پیدا کرنے سے قاصر نہیں ہے۔ ہماری تو یہی رائے ہے کہ غریبوں کی دنیا ہوتی یا امیروں کی، مگر تنہا ہوتی تو یہ ناول نہایت شاندار ہوتا لیکن دونوں دنیاؤں کو نامناسب طریقے سے خلط ملط کر دینے سے پریم چند کا یہ ناول ''آدھا تیتر آدھا بٹیر'' ہو گیا ہے بااینہمہ ''گئودان'' کا ہوری اور ان کی تندخو بیوی دھنیا منشی پریم چند کی ادبی شہرت کو رہتی دنیا تک قائم رکھیں گی۔ یہ لازوال شہرت انھیں مسٹر کھنہ یا مسٹر تنکھا یا پروفیسر مہتہ کی بدولت حاصل نہیں ہو سکتی۔ پروفیسر مہتہ صاحب تو عجیب چیز واقع ہوئے ہیں۔ ناول کے پلاٹ میں جیسا جیسا موقع آتا ہے ویسے ہی وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے جاتے ہیں اور ایسی خصوصیات کا اظہار کرنے لگتے ہیں گویا ان خصوصیات کو وہ ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا ہوئے تھے ''گئودان'' میں جب یہ پروفیسر صاحب سب سے پہلے نمودار ہوتے ہیں تو ایک عالم فاضل مگر بد دماغ پنڈت کی حیثیت سے تشریف لاتے ہیں جن کے دلی جذبات محض اس وجہ سے مجروح ہو گئے ہیں کہ ان کی تازہ فلسفیانہ تصنیف کی کسی نے قصیدہ خوانی نہیں کی۔ اس کے بعد جب وہ دیگر ابواب میں تشریف لاتے ہیں تو نہایت ہی مضبوط سیرت کے آدمی معلوم ہوتے ہیں جنھیں ''نہ ستایش کی تمنا نہ صلہ کی پروا'' ہوتی ہے بلکہ جن کی ذہنیت ''گاہے بسلامے برنجند و گاہے بہ دشنامے خلعت دہند'' کی مصداق ہے۔ پروفیسر صاحب خیر سے خدا کی ہستی پر یقین نہیں رکھتے کیونکہ Agnostic واقع ہوئے ہیں۔ (پریم چند کے اکثر علما اور پنڈت ایسے ہی ہیں) لیکن جب دوران قصہ میں ان کے قلب پر کسی بات کا گہرا اثر پڑتا ہے تو گفتگو میں ان کی زبان سے سیکڑوں مرتبہ ''خدا نہ کرے'' یا ''خدانخواستہ'' یا ''خدا کرے'' یا ''انشاء اللہ'' نکل جاتا ہے۔

''گئودان'' کے آخری حصہ میں ایک اور نقص بھی پیدا ہو گیا ہے یعنی اٹھائیسویں باب میں جب ہڑتالی کاریگروں کا ایک گروہ مسٹر کھنہ کا کارخانہ شکر سازی پھونک دیتا ہے تو پریم چند مسٹر موصوف کو یک لخت ایک مفلس و قلاش شخص کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن دولت کی یہ اچانک بربادی پروفیسر صاحب کی روح کے لیے اکسیر ثابت ہوتی ہے۔ وہ اپنی تمام بدعنوانیاں اور بے انصافیاں یاد کر کے پشیمان ہوتے ہیں اور جواں مردانہ تسلیم و رضا کے ساتھ افلاس و ناداری کی مصیبت گوارا کر کے اچھے خاصے

مہاتما بن جاتے ہیں۔ چند ہی صفحوں کے بعد مسٹر کھنہ پھر وہی سرمایہ دار اور مسٹر کھنہ کی حیثیت سے پیش ہوتے ہیں۔ وہ اپنی بجلی کی شکر مل کے منافع سے دولت کے انبار لگا رہے ہیں اور مزدوروں کے پیٹ کاٹ کاٹ کر اپنی توند پھلا رہے ہیں' مگر یہ معمولی فروگذاشت اچھے اچھوں سے سرزد ہو جاتی ہے ممکن ہے کہ منشی صاحب اس واقعہ سے یہ دکھانا چاہتے ہوں کہ سرمایہ داری میں پلے ہوئے لوگوں کی قلب ماہیت میں کتنی دشواریاں پیش آتی ہیں۔

ماخوذ از موسیو پال ڈینٹ رسالہ ''نیو ریویو'' دسمبر 1936ء

(بہ اضافہ وترمیم)

منشی پریم چند کا قلمی چہرہ

(از صاحب قلمستان لاہور)

منشی پریم چند کا رنگ گورا قد مناسب اور بدن اکہرا تھا۔ ان کا دماغ نہایت دور بیں اور موقع شناس تھا۔ ان کی نظر دنیا کی اندرونی گہرائی تک جاتی تھی۔ مسکراہٹ فریفتہ اور متاثر کرنے والی تھی۔ مسکراتے ہونٹوں کو ڈھکنے کے والی گھنی مونچھیں' سنہری مسکراہٹ سے چمکنے والی آنکھیں' رنج دکھ تکلف اور ناموافق حالات ظاہر کرنے والے گالوں پر باریک جھریاں اور فکر کا اظہار کرنے والی پیشانی پر دو بل' یہی ان کا بشرہ تھا۔ انھوں نے رونا نہ سیکھا تھا۔ غم میں انبساط پیدا کر دکھانا انھیں کا کام تھا۔ سب کو مسکراتے دیکھنا ان کا نصب العین تھا۔ ان کی جھریاں بھی مسکراتی ہوئی معلوم دیتی تھی۔ زندگی کی کشمکش میں دہکتی ہوئی بھٹی میں تپ تپا کر وہ سونے میں سہاگہ ہو گئے تھے۔ ان پر مصیبتیں آئیں لیکن انھیں رلا نہ سکیں۔ انھوں نے آلام وآفات کا استقبال کیا۔ چمکتی ہوئی آنکھوں سے ہنستے ہوئے ہونٹوں اور مستحکم دل سے وہ زندگی کی آگ میں جلے اور ناموافق حالات کی دشوار گزار گھاٹیوں سے گزرے دھڑکتے ہوئے دل اور لڑکھڑاتے ہوئے پاؤں سے نہیں بلکہ آہنی عزم اور جواں مرد حوصلہ اور مستحکم دل کے ساتھ۔

وہ قابل مثال اہل کمال تھے۔ جب تک وہ اردو میں لکھتے تھے' اردو دنیا کے بادشاہ بنے رہے۔ 1911ء میں ہندی میں داخل ہوئے تو ہندی دنیا کے تخت پر غیر معمولی شان وشوکت سے جلوہ افروز ہوئے۔ وہ عظیم الشان صاحب فن ادب میں طرز خاص کے استاد موجد فن' مصور جذبات تھے۔ انھوں نے

ادب کے لیے جو کچھ کیا وہ فراموش نہیں ہوسکتا۔

پریم چند نے جو کچھ لکھا اپنے ملک کے لیے اپنی زبان کے لیے غریبوں اور کمزوروں کے لیے ان کی روح بنارس کی تنگ گلیوں میں چکر نہیں کاٹتی تھی۔ وہ گاؤں کے کھلے کھیتوں اور کھلواڑوں میں پھرتی تھی۔ وہ ہمارے ٹالسٹائے اور گورکی تھے۔ وہ ہمارے شرت اور بنکم تھے۔ انھوں نے نوجوانان اہل فن کے سامنے ایک نمونہ پیش کیا ہے۔ جس پر چل کر سینکڑوں نوجوان اپنا اور اپنی قوم کا بھلا کر سکتے ہیں۔

(ماخوذ از پریم چند نمبر) (فلستان۔ لاہور)

یادگارِ پریم چند

حصہ سوم

افسانہ گوئے بزمِ اَدَب

از ابوالفاضل حضرت راز چاند پوری

پریم چند وہ افسانہ گوئے بزمِ ادب   ہزار حیف کہ دم بھر میں ہوگیا خاموش
خودی سے اس کو غرض تھی نہ خود نمائی سے   شرابِ حسنِ ادب سے وہ رہتا تھا مدہوش
محبّ قوم و وطن تھا، پریم ساگر تھا   بھرا تھا قلب میں اُس کے فلاح قوم کا جوش
زباں میں اس کی سلاست تھی اور شیرینی   بیاں میں اس کے اثر تھا فغاں میں جوش و خروش
رموز فطرت انساں پہ تھی کچھ ایسی نظر   کہ جیسے واقف اسرار ہو کوئی سے نوش
زبان عام میں اس نے لکھے ہیں وہ قصے   کہ خاص لوگوں کو دیتے ہیں درس عقل و ہوش
سنائے گا ہمیں دلکش کہانیاں اب کون؟
وہ خوش کلام تو محفل سے ہوگیا روپوش

یادِ کمال

از جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشرؔ لکھنوی

اُٹھے جہاں سے منشی پریم چند ادیب — کہ اہل فن کے لیے جو تھے سود مند ادیب
دمِ نگارشِ مضموں تھی فکر پُر تاثیر — ہر ایک لفظ تھا کلکِ رقم کا با توقیر
زباں پہ اُن کو تو اُن پر زباں کو نازش تھی — ہر اک نفس میں وقارِ سخن کی خواہش تھی
پریم چند تھے مشہور ادب کی دنیا میں — دماغ پایا تھا پُر نور ادب کی دنیا میں
پریم چند تھے ہندی میں زینتِ محفل — پریم چند تھے اُردو میں اکمل و کامل
رموز فلسفے کے تھے دماغ و دل میں نہاں — قلم سے صفحۂ قرطاس پر ہوئے جو عیاں
تمام عمر سنواری ادب کی زلفِ دراز — ہمیشہ فکر تھی ذوقِ سخن کی آئینہ ساز
تخیلات کے عالم میں فردِ کامل تھے — میانِ محفلِ عشاق با اثر دل تھے
نفس نفس میں رہا نظم و نثر پر قابو — کہ جو لکھا وہ اثر میں تھا صورت جادو
پریم چند کو اب یاد کرتی ہے دنیا — نظر میں پھرتی ہے ہر وقت صورتِ زیبا
زمانے سے وہ چھٹے اور زمانہ ان سے چھٹا — اجل کے ہاتھوں خزانہ کمالِ فن کا لٹا
نہاں ہے آنکھ سے وہ جیتی جاگتی تصویر — ہزار حیف کہ اٹھا ادیب با توقیر
کہاں سے لائے گا قائم مقام ان کا جہاں — جنھوں نے چھوڑا ہے کاغذ پہ اپنا نام و نشاں
سخن کی فکر تھی وقف طوافِ کعبہ و دیر — دماغ و دل کو ہمیشہ تعصبات سے بیر
کلام ان کا چھپے اور جلد چھپ جائے — تمام ملک میں حسنِ قبول دکھلائے

پسِ فنا ہے یہی یادگار اے محشرؔ
کہ جس سے زندۂ جاوید ہو کمال و ہنر

اردو ہندی کے سنگم پر

ایک حادثہ

از حضرت سیماب اکبرآبادی

یہ طوفاں اور یہ شورش یہ فتنے اور ہنگامے
فغاں در سینۂ شعلہ در نفس، دوزخ بہ ہرگامے

مسافر ناگہاں گھبرا گیا پہنچا سر ساحل
کہ جب منزل ہو گرد آلود پاکوبی ہے لاحاصل

یہاں دیکھا کہ دو دریا ہیں مواج ورواں دونوں
نشید افروز، افسانہ فروش و نغمہ خواں دونوں

تفاوت ہے بہت دونوں کے انداز روانی میں
مگر ہے دخل دونوں کو مزاجِ زندگانی میں

چلا وہ سر پھرا ملاح دونوں کے ملانے کو
شکستہ کشتی و دریا کی ہمت آزمانے کو

بھرا "ساگر" کہیں سے اور کہیں سے اس نے پیمانہ
بنایا اک نیا موجوں کے سر پر اپنا میخانہ

مئے دو آتشہ دو رنگ کی اک جام میں ڈھالی
ترنگ ایک اس کی مستانہ تھی اور اک موج "متوالی"

پیام سرخوشی دیتا رہا یاران ساحل کو
سکھائی فطرت دریا سبکساران ساحل کو

کسانوں اور مزدوروں کو دیکھا دور سے اس نے
ہلایا اپنا سر اک نازش مغرور سے اس نے

بھری ان دونوں دریاؤں سے اپنی پریم کی چھاگل
اسے اس طرح چھلکایا کہ رنگیں ہو گئے جل تھل

وہ اس کی بانسری وہ بھیگے بھیگے رس بھرے گانے
یکایک رخ کیا اس کی طرف رفتار دریا نے

جو دریا اپنی رو میں جا رہے تھے موجزن دونوں
بالآخر اس کی کشتی پر ہوئے سایہ فگن دونوں

ہوا طوفاں بپا "بحرین" کے جوش تصادم سے
شکستہ کشتیِ ملاح ٹکرائی تلاطم سے

بپھر کر موج طوفاں نے لیا آغوش میں اس کو
رہا کچھ ہوش کشتی کا نہ فرط جوش میں اس کو

صدا آئی کہیں یوں تند موجوں کو ملاتے ہیں
کہ ایسی شورشوں میں ناخدا بھی ڈوب جاتے ہیں

مگر اے ناخدائے رفتہ اے ناقوس "سنگم" کے   نہ ہوں گے آب خوردہ نقش تیری سعیِ پیہم کے
ابھی تا دیر بحر و بر میں گونجے گی نوا تیری   کہ تیری روح "سنگم" پر ہے ساحل پر چِتا تیری
چِتا کے آگ سے گنگا کا پانی شعلہ افشاں ہے   اور اس کے عکس سے ہر موجِ جمنا میں چراغاں ہے
شوالہ گر ہے تو مستقبل اُمید عالم کا
طواف اہل وطن کرتے رہیں گے تیرے "سنگم" کا

منشی پریم چند کی یاد میں

از حضرت سروش

مرد حقیقت آشنا! منشی پریم چند   تیرا وجود باعثِ صد ناز ہند تھا
تو ہستی بہار گلستان ہند تھا   تیری حیات مہدِ کمالاتِ لافنا
تو ہستی بہار گلستانِ علم و فن   ہندی ادب کے عرش کا تو مہر پُر ضیا
تیرا دماغ مخزن اسرارِ زندگی   تیرا خیال پیکرِ برقِ شرار زا
بے لوث نیکیوں سے مرکب ترا خمیر   مذہب ترا و داد فدا کاری و وفا
تو بندۂ پرستشِ ہر ذرۂ وطن   تو قوم ناتواں کا شفیق و گرہ کشا
تیری ضمیر آئینہ حسن کن فکاں   تیری شبیہ معجزۂ قدرت خدا
شیوہ ترا تدبر و تحقیق و جستجو   مقصود تیرا پیروی راہ ارتقا
قانون سے اجل کے نہ تو بچ سکا مگر   دے کر ثبوت سخن حافظ دکھا گیا
ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

پریم چند اور ان کا مرتبہ

(از جناب گنگا دھر ناتھ صاحب فرحتؔ کانپوری بی اے۔ ایل ایل بی)

جب ہوا روز ازل تخلیق انساں کا سوال   خالق ایزد نے حاضر کر دیا حسن و جمال
لیکن اتنے ہی سے تھی تکمیل بشریت محال   حسن ظاہر کے لیے لازم ہوا حسن کمال
اس زمانہ میں ہوا پیدا اسی سے پریم چند
تا کہ باتوں باتوں میں دے اک جہاں کو وعظ و پند

اس کی ذات خاص تھی گہوارۂ عالی صفات   اس کی ہستی تھی جہاں کے واسطے جزو حیات
کچھ عجب ڈھب سے ادا ہوتے تھے سارے واقعات   اور زباں ایسی کہ گویا موجۂ آب حیات
الغرض یکتا تھا وہ اس کا کوئی ہمسر نہ تھا
کوئی معراج کمال علم میں برتر نہ تھا

اس کے ہر ہر لفظ میں تھا ایک جادو سا نہاں   اس کی ہر ہر بات میں تھیں فلسفے کی شوخیاں
اس کی ہر ترکیب سے ظاہر تھا انداز بیاں   . اس کی ہر ترتیب میں پنہاں تھا ربط دو جہاں
پیارے پیارے چست فقرے بھولی بھالی گفتگو
باغ افسانہ نگاری میں بہار رنگ و بو

ایسی خودداری کہ عزت کو ہو جس پر رشک و ناز   بے نیازی ایسی دولت کو ہو جس پر رشک و ناز
سادگی ایسی کہ عصمت کو ہو جس پر رشک و ناز   زندگی ایسی کہ جنت کو ہو جس پر رشک و ناز
گل کی بلبل کے لیے تاکید خاموشی کی ہے
کیفیت باغ جہاں میں خود فراموشی کی ہے

اہل عالم کو ہے اذن شور دریا چپ رہو   چپ رہو ہاں چپ رہو اے اہل دنیا چپ رہو
چلا ہے یہ اک وارفتہ فن کا جنازا چپ رہو   احترام علم و فن کا ہے تقاضا چپ رہو
اٹھ گیا ہندوستاں کا مایہ عز و شرف
چپ رہو گم ہو گیا اک گوہر عالی صدف

آہ منشی پریم چند

از منشی جگناتھ آزاد بی اے

قوم کا سرمایہ ہیں اس کے سخنور اور ادیب   موت ہے ان کی وطن کو آہ کتنی ناگوار
گلشن قوم و وطن تازہ انہی کے دم سے ہے   ہے انہی کے فیض سے گلزار ملت پر بہار
دام ملکوں کے انہی کے نام سے ہیں سربلند   اور انہی کے دم سے ہیں قومیں جہاں میں باوقار
قوم کی عزت جو قائم ہے تو بس ان کے طفیل   کیونکہ ہیں یہ زندگی قوم کے آئینہ دار

یہ نہ ہوں جس ملک میں اس ملک میں کچھ بھی نہیں
گرچہ ہوں موجود اس میں سیم و زر کے کوہسار

مٹتے جاتے ہیں مرے ہندوستاں! تیرے ادیب   جارہے ہیں تیرے شاعر اور افسانہ نگار
یاس کے طوفان میں تیری امیدیں غرق ہیں   ہورہا ہے ہند تیری آرزوؤں کا فشار
تیرے وہ فرزند جن پر اک جہاں نازاں تھا کل   آج ڈھونڈے سے کہیں ملتی ہے ان کی یادگار

آہ تجھ میں قدر کچھ ان باکمالوں کی نہیں
جن پہ اے میرے وطن نازاں ہیں مغرب کے دیار

پھر ہو مصروف فغاں اے مادر ہندوستاں   کیونکہ وہ فرزند تیرا تھا جو فخر روزگار
تیرے دامان محبت سے دیار غیب کو   لے گیا اس کو اٹھا کر آپ دست روزگار
وہ کہ جس پر ہندو و مسلم کو یکساں ناز تھا   یعنی افسانہ نگاری کے جہاں کا تاجدار
چل بسا افسوس وہ بھی تھا جو اپنی طرز میں   کشور ہندوستاں کا واحد افسانہ نگار

جس کے افسانے تھے ہر ہندوستانی کو پسند
تھا ہمارے ملک میں بس ایک منشی پریم چند

مرنے والے! گرچہ افسانے ہیں سرمایہ ترا   ان افسانوں میں حقیقت کا جہاں موجود ہے
زندگی کے پُرخطر رستے کے ہر ہر پیچ کا   داستانوں میں تری اک اک نشاں موجود ہے
رنگ تہذیب کہن صدق و صفا حب وطن   از پئے بیداریٔ ہندوستاں موجود ہے
بہر آزادی ملک و قوم سینے میں ترے   صاف ظاہر ہے کہ اک سوز نہاں موجود ہے
ہیں کہیں عشرت گہ ہستی کے قصے دلفریب   اور کہیں درد و الم کی داستاں موجود ہے

اک جگہ موجود ہے اشکوں کا دریائے رواں اک جگہ جام شراب ارغواں موجود ہے
ہیں فسانوں میں کہیں چٹیل بیاباں اور پہاڑ اور کسی جا اک مہکتا بوستاں موجود ہے
ہیں کہیں موجود نفرت اور غرض کے خار زار اور محبت کا کہیں اک گلستاں موجود ہے
قہقہے ہیں عیش و عشرت کے کسی جا بے پناہ اور کہیں غمناک فریاد فغاں موجود ہے
ہے نمایاں اک جگہ مکرو فریب زندگی اک جگہ عبرت کی سچی داستاں موجود ہے
محفل عشرت میں ہے اک جا ہجوم رنگ و بو اک جگہ دل دوز آہوں کا دھواں موجود ہے
تیرے افسانوں میں اے فخر وطن صاحب قلم زندگی کی اک مکمل داستاں موجود ہے

فن افسانہ نگاری ہے جہاں میں سربلند
دہر میں جب تک ترا دلکش بیاں موجود ہے

زینت بزم ادب ہے تیرا ساغر پریم چند! جب تلک یہ گردش دور جہاں موجود ہے
نام تیرا مٹ نہیں سکتا جہاں سے جب تلک یہ زمیں موجود ہے یہ آسماں موجود ہے
تیرے افسانوں میں روح پاک تیری زندہ ہے تیرے ہر اک لفظ میں تنویر جاں موجود ہے

صفحہ ہستی پہ ہے مرقوم افسانہ ترا
تو ہے شمع جاوداں ہر دل ہے پروانہ ترا!!

بساطِ ماتم

عبدالسلام اختر ہوشیار پوری

منشی پریم چند زمانے سے اٹھ گئے پہلی سی دلنشیں کہاں انجمن ہے آج
منقار عندلیب کو نغموں سے ہے گریز پھولوں کی پنکھڑیوں میں کہاں بانکپن ہے آج
ہر محفل وفا میں ہے جان وفا کا سوگ خالی لطافتوں سے چمن کا چمن ہے آج
گل ہورہا ہے اہل داب کا چراغ دل تنویر انجمن سے تہی انجمن ہے آج
اک صاحب کمال نگاہوں سے چھپ گیا بیتاب و بے قرار نگاہ وطن ہے آج
محفل میں اب وہ اہل زبان وقلم نہیں غم میں سیاہ پوش عروس سخن ہے آج

مرگ ادیب روح تمدن کی موت ہے
ماتم گسار اختر شیریں سخن ہے آج

نوحہ وفات پریم چند

(از منشی جگدیش سہائے سکسینہ بی اے ایل ایل بی)

کیا بتاؤں کون اے اہل وطن جاتا رہا۔ اک ادیب عصر و نقاد سخن جاتا رہا
روشنی افروز بزم علم و فن جاتا رہا بلبل گلزار و صدر انجمن جاتا رہا
اضطراب قلب کو زحمت کش تسکیں نہ کر
ہم نشیں بہر خدا اب صبر کی تلقیں نہ کر

تو کہاں ہے اے بہار جلوہ سامان ادب تیرے دم سے روکش جنت تھا بستان ادب
ہوگئی برباد اب وہ شوکت و شان ادب رو رہے ہیں آج تجھ کو تشنہ کامان ادب
دہر میں پیدا ہوا تو خوش بیانی کے لیے
کشور علم و ہنر کی حکمرانی کے لیے

تیرے افسانے کتاب دہر کی تفسیر ہیں فطرت انساں کی جیتی جاگتی تصویر ہیں
اللہ اللہ چارہ فرمائے دل دلگیر ہیں زندگی کے خواب کی تسکیں فزا تعبیر ہیں
نقطہ نقطہ ان کا اک آئینۂ جذبات ہے
شاہد علم و ادب کے واسطے سوغات ہے

نثر تیری درحقیقت نظم سے ہے خوب تر قوم کو ہے ناز تیری شوخی تحریر پر
یہ سلاست یہ روانی یہ صفائی یہ اثر تیرے ہر جملے پہ قرباں ہوگئی روح شرر
عالم دریا میں دیکھا دیدۂ خونبار نے
تیری پیشانی کو چوما حالی و سرشار نے

حبذا اے یوسف مصر معانی حبذا کشور ہندی کو بھی تو نے مسخر کرلیا
پیشتر اقلیم اردو کا تھا تو فرمانروا قوت بازو سے اب شاہ ذو عالم ہوگیا
ہے پرے تیری فضیلت سرحد ادراک سے
گوئے سبقت لے گیا تو منشی افلاک سے

تیرے دامن میں محبت کے دُرِ شہوار تھے مدح خواں تیرے عزیز و مخلص و اغیار تھے
انقلابات جہاں گو درپئے آزار تھے تجھ کو پیکان الم لیکن گل گلزار تھے
اک سبق ہے زندگی تیری بشر کے واسطے
قابل تقلید ہے اہل نظر کے واسطے

درج عرفاں کا تجھے اک گوہر یکتا کہوں یا چمن زار حقیقت کا گل رعنا کہوں
لب کو تیرے کاشف اسرار سر بستہ کہوں اور تجھ کو اک سفیر عالم بالا کہوں
گوش دل سے ہاں سنے کوئی ترے پیغام کو
ظرف عالی چاہیے اس بادۂ گلفام کو

موت کے قزاق نے لوٹا نظر کا کارواں ساکن شہر خموشاں ہے سرور نکتہ داں
جانب ملک عدم راہی ہوئے برق و وراں چل بسا افسوس تو بھی اے شہ ملک بیاں
فخر قوم وناز ش ہندوستاں جاتے رہے
کیسے کیسے آہ یکتائے زماں جاتے رہے

دشمنِ اہل وطن گردون گرداں ہوگیا خاک کے پردے میں گنج قوم پنہاں ہوگیا
حیف خالی گوہر مکنوں سے داماں ہوگیا عمر بھر کے واسطے رونے کا ساماں ہوگیا
بس نہیں چلتا ہے یارب کچھ قضا کے سامنے
ہے سر تسلیم خم تیری رضا کے سامنے

آہ پریم چند

کیلاش ورما شائق ہنگامی

آہ جب تک تو جیا زندہ رہا با صد وقار اور بن کر ہمدم و ہمدرد و یار و غمگسار
یاد آتی ہے دلوں کو تیری صورت بار بار موت وہ تیری کہ جس پر زندگی خود تھی نثار
ہو بشر تجھ سا جہاں میں ہے یہ ایک امر محال
دہر میں جب تک رہا بن کر رہا اپنی مثال

آہ! منشی پریم چند

از مہاشہ جیمنی سرشار خیر پور سادات ضلع مظفر نگر

تیری قضا نے کر دیا سینہ فگار پریم چند!
فطرت شناس پریم چند فطرت نگار پریم چند!

ایسا کہاں سے لائیں ہم تجھ سا جسے بتائیں ہم
علم و کمال و فضل کا آئینہ دار پریم چند!

اردو کا تو ادیب تھا ہندی کا تو حبیب تھا
دونوں کے سر پہ رکھ گیا تاج وقار پریم چند!

آئے نظر بہار کیا؟ پھولوں پہ ہو نکھار کیا
باغ ادب میں تجھ سے تھی شان بہار پریم چند!

دل کو ہے آرزو تری آنکھوں کو جستجو تری
کیوں تو چمک کے چھپ گیا مثل شرار پریم چند!

شاداں ترے کمال پر نازاں تھے تیری ذات پر
اب ہیں بہاتے اشک خوں ہندی تری وفات پر

بزم سخن کی جان تھیں جادو بیانیاں تری
علم و ادب کی کان تھیں یکسر کہانیاں تری

ساماں فلاح قوم کا ناول ہوں یا کہانیاں
باعث رفاہ ملک کا گوہر فشانیاں تری

نغمے نہ تھے تیرا کمال روکش صد فریب تھا
بیکس وطن کے حال پر تھیں نوحہ خوانیاں تری

حیرت میں باکمال سب تیرا کمال وہ کمال
دھنتے ہیں سر کو نکتہ داں وہ نکتہ دانیاں تری

ہم ہو گئے تباہ اجل ہوں گی نہ ختم آہ اجل
فتنہ طرازیاں تری؟ ریشہ دوانیاں تری

قرباں ہوں جن پہ جان و دل قلب و جگر نثار ہوں
کتنا ستم ہے اے اجل یوں وہ ترے شکار ہوں

خراج عقیدت

از بابو نگیشور دیال صاحب راز زادہ سکینہ صوفی ایم۔اے ایل ایل بی۔ بلند شہر

وہ پریم چند منشی بے مثل و بے بدل   تھی جس کے دم سے بزم ادب میں چہل پہل
افسانے جس کے شمع ہدایت تھے برمحل   نادقت آہ ہوگیا وہ لقمۂ اجل
اس سوز جاں گسل سے ہر اک دل کباب ہے   فرط تپش ہے آتش غم لے حساب ہے
علمی شغف سے اس کے نہیں کون باخبر؟   ہر قلب پر فسانے ہوئے نقش کا لحجر
اے بحر علم تیری روانی سے سر بسر   دامان و جیب اردو و ہندی ہیں پر گہر
طرز بیاں ہر ایک کا تو نے دکھادیا   دھبہ ہر اک کا اپنے قلم سے مٹا دیا
بزم ادب کو خواب میں بھی یہ نہ تھا خیال   انیس سو چھتیس کا نحس ہوگا اس کو سال
اول وفات برق کا اس کو ہوا ملال   پھر چل دیا جہاں سے یہ منشی باکمال
نقش قرار سیل فنا سے مٹا ہے آج   ایوان نثر و نظم میں ماتم بپا ہے آج
تجھ کو پریم چند یہ شاید نہیں خبر   کتنا وفات کا تیری دنیا پہ ہے اثر
صوفی جہاں میں ڈھونڈتی ہے اس کو ہر نظر   اے ماہتاب عشق بتا تو چھپا کدھر

کیا شوق سامعیں کا فراموش ہوگیا
افسانہ کہتے کہتے جو خود ہائے سوگیا

بادشاہ اور ادیب

از حضرت احسان بن دانش

ادب کے گلستاں پہ یہ سال "توبہ" بنا ہر طرف سینہ کوبی کی ڈالی
گئے راشد الخیری و برق و بیدم الم جن کا ہے روح کی پائمالی
خلیقی و ہادی نے بھی منھ کو پھیرا ہوئی حشر سے حشر تک بزم خالی
شیم اور ابن علی عرش و ناصر گئے دے کے سب داغ شیریں مقالی
اٹھا بزم سے اصغر نغز فرما تصوف کا حامی تغزل کا والی
بساط جہاں میں خیال اب کہاں ہے دلوں میں ہے اک یاد نازک خیالی
بس اک پریم چند ایسا انساں رہا تھا کہ تھی جس سے اردو کے رخ پر بحالی
مگر آگیا یہ بھی دام اجل میں فغاں است برعالم خستہ حالی
غرض ان ستاروں کی ضو پوشیوں سے سحر کی ضیا پاشیاں بھی ہیں کالی
اسی سال کھاکر فریب مقدر جدا سلطنت سے ہوا شاہ عالی
مگر تخت پر شاہ کے شاہ بیٹھا
ادیبوں کے منبر ہیں خالی کے خالی

---

(۱) مہاراج بہادر برقؔ دہلوی (۲)، حضرت بیدمؔ وارثی، (۳) مولانا خلیقیؔ دہلوی، (۴) مرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی، (۵) آغا حشرؔ کاشمیری، (۶) شیونرائن شمیمؔ (۷) سید ابن علی مدیر نیرؔ اعظم مرادآباد (۸) حضرت عرشؔ گیاوی، (۹) سید ناصر نذیرؔ دہلوی (۱۰)، حضرت اصغر گونڈوی

قطعہ تاریخ وفات منشی پریم چند صاحب مرحوم

از منشی اقبال ورما سحر ہتگامی

اٹھا پریم چند سا افسانہ گو دریغ!　ڈوبا سپہر ناموری کا مہ تمام
تحریر پر اسے تھی وہ قدرت کہ خامہ آپ　جھک جھک کے انکسار سے کرتا رہا سلام
تھا طبع کا لگاؤ جو ہر خاص و عام سے　ہر طبعزاد رنگ تھا مقبول خاص و عام
اس کا کلام مہر و وفا کا کلام تھا　اس کا پیام انس و محبت کا تھا پیام
جذبات قدرتاً جو نہاں تھے عیاں ہوئے　جذبات کا ہوا وہ کھلا صاف احترام
تھی اس کی فہم میں وہ رسائی کہ بالیقیں　انساں کے دل میں بیٹھ کے کرتی تھی اپنا کام
کیا کیا دہیں سکوں میں بدلتا تھا اضطراب　چلتا تھا جب بتاؤ سے کلک سبک خرام
تھا فطرتاً اگرچہ وہ افسانہ گو مگر　بے شبہ شاعرانہ تھا اس کا سب اہتمام
کس درجہ پُر فضا تھا سماں واقعات کا　تصویر تھی کہ جس کو وہ تھا کھینچتا مدام
ہنس ہنس کے ہر نگاہ میں کھلتی تھی اس کی صبح　ہر دل کو مسکرا کے لبھاتی تھی اس کی شام
آجائے تا جہاں میں نئی زندگی کا دور　امرت سے بھر کے اس نے دیے لاکھوں لاکھ جام
کتنا عظیم تھا غرض اس کا جو تھا اثر　کتنا بلند تھا غرض اس کا تھا جو مقام
جس نام سے ہو اس کی مکمل برابری　ہندوستاں میں تو نظر آتا نہیں وہ نام
اس کی وفات ہے ادب و قوم کا وہ زخم　جس کا کسی طرح نہیں ممکن اب التیام

خاموش ہے فسانہ نگاری کہ آج سحر
رخصت ہوا فسانہ نگاری کا ہم کلام

1936ء

تواریخ انتقال ناگہانی

19 ء 36

منشی دھنپت رائے "پریم چند" ادیب کامل ونقاد ہندی واردو

19 ء 36

(نتیجہ فکر پروفیسر حامد حسن قادری ایم اے)

(1)

اس دور میں ہوئی ہے ادیبوں کو کم نصیب — رکھتے تھے جو قلم میں روانی پریم چند
بے مثل تھا فسانہ نگاری کا طرز خاص — رکھتے نہ تھے زمانے میں ثانی پریم چند
نقاد بھی مدیر بھی ناول نگار بھی — تھے شاہ کشور ہمہ دانی پریم چند
تکمیل اور ہندی و اردو کی تھی ضرور — تھی موت ابھی سے تم کو نہ آنی پریم چند
ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — گو زندگی سبھی کی ہے فانی پریم چند
رکھتے تھے تم بھی عشق ادب عشق ملک وقوم — کی نذر عشق تم نے جوانی پریم چند
زندہ ہو تم بھی زندہ ہیں جب تک زبان وملک — یہ زیست وہ ہے جو نہیں آنی پریم چند
باقی رہے گی اردو و ہندی کے ساتھ ساتھ — چھوڑی ہے تم نے ایسی نشانی پریم چند
شہپارۂ ادب بھی ہے درس عمل بھی ہے — ہر ناول اور ہر ایک کہانی پریم چند

حامد پریم چند کی تاریخ انتقال
ہے "فخر عصر و بحر معانی پریم چند"

19 ء 36

(2)

بزم جہاں سے اٹھ گیا ایک ادیب بے مثال — نالہ کش الم نہ ہو کیوں دل درد مند آج
اے دل حامد حزیں سال وفات کر رقم — کوہ گراں غم ہے آہ مرگ پریم چند آج

1936ء

پریم چند کی تصانیف

منشی پریم چند کی اردو ہندی تصانیف کی ایک مفصل فہرست درج ذیل ہے۔ اس فہرست کو حتی الوسع مکمل بنانے کی کوشش کی گئی ہے تاہم ممکن ہے کہ بعض باتیں درج ہونے سے رہ گئی ہوں۔ ہم کو افسوس ہے کہ مرحوم کے وارثان سے بھی ان کی تصانیف کی کوئی مستند فہرست دستیاب نہ ہو سکی اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ بعض چیزیں بالکل ہی نظر انداز ہو گئی ہوں۔

اردو تصانیف

نمبر نام کتاب معہ کیفیت

مختصر افسانے

1- سوز وطن: پانچ مختصر افسانوں کا مجموعہ جو 1907 میں نواب رائے کے نام سے زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

2- خاک پروانہ: سات افسانوں کا مجموعہ

3- پریم پچیسی (2 جلد): پچیس کہانیوں کا مجموعہ دارالاشاعت پنجاب لاہور نے شائع کیا۔

4- پریم بتیسی (2 جلد): بتیس قصوں کا مجموعہ جس کا پہلا ایڈیشن زمانہ پریس کانپور سے اور دوسرا ایڈیشن دارالاشاعت لاہور سے شائع ہوا۔

5- پریم چالیسا (2 جلد): چالیس کہانیوں کا مجموعہ جو لاہور سے شائع ہوا۔

6- فردوس خیال: گیارہ افسانوں کا مجموعہ جو 1929ء میں انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوا۔

7- زادراہ: بارہ افسانوں کا مجموعہ جو 1936ء میں حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی سے شائع ہوا۔

8- دودھ کی قیمت: نو افسانوں کا مجموعہ ہے جسے 1937ء میں عصمت بکڈپو دہلی نے شائع کیا۔

9- واردات: تیرہ افسانوں کا مجموعہ جامعہ ملیہ دہلی سے 1937ء میں شائع ہوا۔

اردو ناول

1- کشنا: 1907 میں ہندوستانی پریس لکھنؤ میں طبع ہوا اور بابو مہادیو پرشاد ورما بک سیلر امین آباد لکھنؤ نے شائع کیا۔

2- ہم خرما و ہم ثواب

3- جلوۂ ایثار: 1912 میں انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوا' دوسرا ایڈیشن 20ء میں نکلا۔

4- روٹھی رانی: راجپوتانہ کے ایک تاریخی قصہ کا اردو ترجمہ جو 1907 میں نواب رائے کے نام سے زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا۔

5- بازار حسن (2 جلد): اس ناول کا فلم بھی بن چکا ہے یہ ناول سیوا سدن کا اردو ترجمہ ہے۔

6- گوشہ عافیت (2 جلد): دارالاشاعت پنجاب لاہور سے شائع ہوا۔

7- چوگان ہستی (2 جلد): 27ء میں دارالاشاعت پنجاب لاہور سے شائع ہوئی۔

8- پردۂ مجاز (2 جلد): لاجپت رائے اینڈ سنس لاہور نے شائع کیا۔

9- نرملا: یہ ناول 1929ء میں لاہور سے شائع ہوا۔

نمبر نام کتاب معہ کیفیت

10-غبن: یہ ناول لاہور سے شائع ہوا۔

11-بیوہ: یہ ناول سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوا۔

12-روحانی شادی (ڈرامہ): عصمت بکڈپو دہلی نے شائع کیا۔

متفرق

1- باکمالوں کے درشن: زمانہ میں شائع شدہ سوانحی مضامین کا مجموعہ جسے لالہ رام نرائن بک سیلر الہ آباد نے شائع کیا۔

2- رام چرچا (رامائن کتھا) لاجپت رائے اینڈ سنس لاہور نے شائع کیا۔

ہندی افسانوں کے مجموعے

1-پریم دوادشی: بارہ افسانوں کا مجموعہ سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوا اس کتاب کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

2- پریم پرتما: یہ مجموعہ 26ء میں سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوا۔

3- پریم تیرتھ: 26ء میں سرسوتی پریس سے شائع ہوا۔

4- پریرنا परेरना: 32 میں شائع "

5- پانچ پھول: 35ء میں " "

6- مان سرود (2 جلد): 36ء میں پچاس کہانیوں کا مجموعہ سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوا۔

7- کفن اور دوسرے افسانے: 36ء میں سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوا۔

8-سپت سروج: " "

9-پریم پچیسی: " " "

10-پریم پورنما: " "

11-لونڈی: " "

12-پریم پرسون " "

13-اگنی سمادھ: "

14- سمر جاترا: 36ء میں سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوا۔

(ہندی ناول)

1- سیواسدن: بازار حسن کا ہندی ترجمہ

2-پریم آشرم: " " "

3-بردان: " " "

4-پرتگیا: بیوہ کا ہندی ترجمہ جو پہلے प्रेमा کے نام سے شائع ہوا تھا۔

5- رنگ بھومی (دو جلد)

6- غبن:

7- کرم بھومی: میدان عمل کا ہندی ترجمہ ہے۔

8-نرملا:

9- گئودان: سرسوتی پریس بنارس سے 37ء میں شائع ہوا۔

10- کایا کلپ:

11- منگل سوتر (نامکمل ناول جو سرسوتی پریس سے شائع ہوا)

ہندی ڈرامے

1- کربلا: زمانہ میں شائع شدہ ڈرامے کا ہندی ترجمہ جو سرسوتی پریس نے شائع کیا

2-سنگرام

3- پریم کی ویدی:

بچوں کے لئے ہندی کتابیں

1- کتے کی کہانی:

2- جنگل کی کہانیاں:

3-رام چرچا (رامائن کی کتھا)

4- من مودک:

5- شیخ سعدی:

6-درگاداس یہ سب کتابیں سرسوتی پریس بنارس نے شائع کیں۔

ہندی ترجمے و تالیفات

1- آزاد کتھا فسانہ آزاد مصنفہ پنڈت رتن ناتھ

نمبر نام کتاب معہ کیفیت

سرشار) کا خلاصہ' سرسوتی پریس
بنارس سے شائع ہوا۔

2- چاندی کی ڈبیہ: گالزوردی کے انگریزی ڈراموں
کے ترجمے جو ہندستانی اکیڈمی کی
فرمایش سے کیے گئے تھے اور جنھیں
اکیڈمی نے شائع کیے۔

3- ہڑتال " " "

4- نیائے " " "

5- آہنکار اناطول فرانس کے ایک ڈرامہ کا ہندی
ترجمہ

6- سکھ داس مطبوعہ سرسوتی پریس

7- ٹالسٹائے کی کہانیاں: " "

8- پتا کے پتر پتری کے نام " "

9- سرشٹی کا آرمبھ (تخلیق کائنات) "

10- گلپ سموچیہ " "

11- گلپ رتن " "

بعض ہندی ناول ہندی پستک ایجنسی وگنگا پستک مالا
لکھنؤ سے اور بعض سرسوتی پریس
بنارس سے شائع ہوئے ہیں۔

Printed at : JK Offset Printers, Jama Masjid, Delhi-6